۱۹۷۰ء کے منتخب افسانے

مرتب

ناصر زیدی

ناشر: مکتبۂ میری لائبریری۔ لاہور ۲

ناشر : بشیر احمد چودھری ڈائرکٹر مکتبہ میری لائبریری لاہور

طابع : پاکستان ٹائمز پریس لاہور

بار اوّل : ۱۹۷۲ء

ترتیب

سیدھی بات!

لیجئے ۱۹۷۰ء کے منتخب افسانوں کے ساتھ پھر حاضر ہوں - سال بہ سال افسانوں کے انتخاب کی روایت کسی بہت بڑی ادبی افادیت کی حامل ہو یا نہ ہو، میرے لئے ایک گونہ اطمینان بخش ضرور ہے -

جب میں ادب کے خوش ذوق قارئین کے لئے اردو کی نتھری ستھری اور منجھی ہوئی کہانیاں چُنتا ہوں تو میری باطنی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے میں نے کوئی بہت اہم خدمت انجام دی ہے۔

جی ہاں! افسانے کا انتخاب میرے نزدیک بڑی اہم خدمت ہے - میں نے قاری کی رہنمائی کی اور اپنی جگہ مطمئن ہو گیا ہوں - اب اگر وسائل کی دشواریوں کی بنا پر میں نے اپنے اس انتخاب کا حلقہ محدود رکھا ہے تو قصور میرا نہیں ہے - اگر آپ کو میرے ذوقِ انتخاب پر اعتراض ہے تو یہ یک طرفہ الزام ہے اور ظاہر ہے کہ ہر قاری

کو یہ الزام عائد کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ میں اُن سے یہ حق چھیننے والا کون؟ رہا افسانے کے ارتقائی مراحل اور اس کی ماہیتی خامیوں کا مسئلہ تو اس کا ذمہ دار افسانہ نگار ہے۔ تاہم ایک حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قیام پاکستان کے بعد اِس ربع صدی سے کچھ کم عرصہ میں اردو کے افسانوی ادب نے جتنا سفر طے کیا ہے وہ کوئی نصف صدی کا قصہ ہے۔ اس دور میں ہم نے نئے لکھنے والوں کی ایک فوج ظفر موج کو قلم ہاتھ میں لئے افسانے کے مورچے پر نبرد آزما دیکھا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر لکھنے والے نے حسب استطاعت بڑا تیر مارا ہے، لیکن میں نے انتہائی غیر جانبداری سے آپ کے سامنے یہ مجموعہ پیش کیا ہے اور نئے پرانوں کی جاندار تخلیقات کو حتی الوسع نظر انداز نہیں کیا۔ عدل کی میزان آپ کے ہاتھ میں ہے ناشر کے اور میرے حق میں کلمۂ خیر کہئے یا میری بے ذوقی کا رونا روئیے ع

بہر پہلو سرِ تسلیم خم ہے

مدیر ماہنامہ ادب لطیف۔ ناصر زیدی

۱۵۔ سرکلر روڈ۔ لاہور

فون ۵۲۰۰۹

عصمت چغتائی

اللہ کا فضل

"بہن خدا کا واسطہ بتایئے کیا کروں؟" سکینہ بہن نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔
"بھئی میری تو یہی رائے ہے کہ فرحت کو طلاق دلوا دیں۔"

"ہے ہے طلاق۔" وہ لرز اٹھیں۔ "آج تک خاندان میں طلاق نہیں ہوئی۔ پھر دوسری بیٹی رضیہ چھاتی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ ناک کٹ جائے گی۔ پھر اسے کون پوچھے گا۔ ایسی پیاری بیٹیاں ہیں، لیکن بر نہیں جڑتے۔" بر کے معنی صرف تندرست قبول صورت نوجوان ہی نہیں؟ بر کے لئے لازمی ہے کہ وہ بھاری تنخواہ پاتا ہو اور اچھے کھاتے پیتے خاندان کا ہو۔ کچھ آگے پیچھے کام آئے۔ ویسے مرد ذات کی کمی نہیں۔ "بڑی بیٹی کے لئے کنویں میں بانس ڈالے تب کہیں جا کے لڑکا جڑا۔ لڑکا ماشاء اللہ سے ساٹھ پینسٹھ کا ہے، ایک بیوی اور چار لڑکیاں ہیں پر بیٹا نہیں — بیٹے کے لئے فرحت سے شادی کی تھی سو اس کے نصیب پر پتھر پڑ گئے۔ چھٹا سال چل رہا ہے۔ بیٹا چھوڑ بیٹی ہی نصیبوں جلی ہو جاتی۔

پھل تو لگتا، لیکن وہاں بھولے کو دن کبھی نہ چڑھے ۔ کتنے تعویذ گنڈے کئے۔ اجمیری خواجہ نے بھی سکینہ دکھیا کی نہ سنی۔"

"اے بھئی تعویذ گنڈوں کے پھیر میں نہ پڑیئے۔ اچھے ڈاکٹر کو دکھایئے۔"

"ڈاکٹر سے ڈاکٹر دکھائے ـــ سب موئے یہی کہتے ہیں لڑکی میں عیب نہیں۔ بس بہن اللہ کا فضل ہے۔ ہوا ہوا نہ ہوا تو اس میں کسی کا کیا دخل ؟"

شاید امداد میاں ہی میں کچھ عیب ہو گیا ہو۔"

"نہیں بہن مرد ذات میں کہاں عیب ہوتا ہے ۔ لوگ اکسا رہے ہیں کہ تیسری شادی کرو۔ انھیں کیا کمی ہے لڑکیوں کی ـــ اچھے اچھے لوگ بیٹیاں تھال میں سجا کے دینے کو تیار ہیں۔"

فرحت مجھے ایک دن سینما میں ملی تھی ۔ اچھی چکنی چپڑی رس ملائی رکھی ہوئی ہے ۔ گورا چٹا رنگ، ہنستی ہوئی صورت، بھرا بھرا جسم، اماں کو بیٹی کا گھر بگڑنے کا غم کھائے جاتا ہے۔ لیکن خود فرحت کے دل پر کچھ اثر نہیں مشکل سے بائیس تیئیس کا سن ہو گا۔ ابھی تھوڑے ہی دن سے ان لوگوں سے میل جول بڑھ گیا تھا۔ سی روڈ پر ان کا چار کمروں کا فلیٹ ہے۔ بڑی آن بان سے سجا ہوا ـــ پہلی بیوی کھار میں اپنے اماں باوا کے ساتھ رہتی ہیں۔ یہ فلیٹ خاص طور پر فرحت کے لئے لیا ہے لیکن اس کے نام نہیں کرتے۔

"غارت کیجئے امداد میاں کو ـــ فرحت کو ہزاروں لڑکے مل جائیں گے!"

مجھے انور کا خیال آیا وہ ان دنوں میرے ساتھ ہی رہتا تھا ـــ "سارے پانچ سو ملتے ہیں۔ ترقی ہو جائے گی۔" اس دن سینما میں فرحت کی نظریں بار بار انور پر اُچٹ

رہی تھیں۔ سکینہ بہن بھی بڑی مہربان نظر آ رہی تھیں۔ میں نے ان سے ذکر کیا تو کھل گئیں۔

"اے ہے ایسا ہو جائے تو کیا کہنے ہیں! ماشاء اللہ کیا چاند سورج کی جوڑی رہے گی۔"

"آپ طلاق دلوا دیجئے بس آگے میرا ذمہ!" میں نے وعدہ کیا۔

مگر انور بدک گیا۔

"بھئی میں اس چکّر میں نہ پڑوں گا!"

"کیوں بے وقوف اتنی اچھّی لڑکی ہے!"

"لڑکی کہاں؟ کسی کی بیوی ہے!"

"طلاق کے بعد۔۔۔"

"مگر بڑھیا بڑی کائیاں ہے۔"

"ارے بے چاری بہت سیدھی ہیں۔"

"بڑی چلتی پرزہ ہے۔ مجھے تو اس میں سے بارُود کی بُو آتی ہے!"

مگر انور بے چارے کی ایک نہ چلی۔ اُدھر سے سکینہ بہن اِدھر سے میں نے وہ بانکا ڈالا کہ بدحواس کر دیا۔ گھیر گھیر کے ہم دونوں انھیں ایک دوسرے سے ٹکراتے۔ بڑی بڑی ترکیبیں چل کے انھیں اکیلا چھوڑ کے سرک جاتے۔ سکینہ بیگم آنکھوں میں آنسو بھر تیں اور شکریہ ادا کرتیں۔

یا تو انور پیچھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیتا تھا۔ یا اب یہ حالت ہو گئی جیسے بھوت سوار ہو گیا ہو۔ سر پیر کا ہوش نہ رہا ــــ فرحت نے شادی کی تھی محبت نہیں کی تھی۔

انور کی محبت نے اسے ایک نئی زندگی بخش دی۔ انور کو سکینہ کی صورت سے نفرت تھی۔ مگر پھر تو وہ ان کا بھی گرویدہ ہو گیا۔ وہ بھی اس پر صدقے واری جاتی۔ اس کے بغیر ان کے حلق سے نوالہ نہ اُترتا۔ میری اہمیت بالکل ختم ہو گئی۔ شادی سے پہلے ہی انور سسرال کا ہو رہا۔ رات کے دو دو بجے تک وہیں گھسا رہتا' یا فرحت آجاتی اور دونوں کمرے میں بند کھُسر پھُسر کیا کرتے۔ میں اپنے کام کے سلسلے میں کچھ دن کے لئے پونا چلی گئی۔ وہاں سے لوٹی تو معلوم ہوا —— میرے پیچھے فرحت مستقل طور پر گھر میں رہی، کبھی کبھار اپنے گھر چلی جاتی۔ اب تو شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ دونوں کی محبّت عروج کو پہنچ چکی ہے۔

"آپ کچھ کر رہی ہیں ؟" میں نے سکینہ سے پوچھا —— پہلے تو ٹالتی رہیں پھر بولیں۔

"ہاں! احمد آباد کے ایک سوامی جی نے ایک بوٹی دی ہے"۔

"ارے ہٹاؤ سوامی جی کو —— یہ لوگ پاکھنڈی ہوتے ہیں۔ طلاق کے بارے میں کیا کر رہی ہیں۔؟"

"اس منحوس طلاق کے نام سے مجھے ہول آتا ہے!"

"لیکن آخر ہو گا کیا؟"

"اللہ اپنا فضل کرے گا"۔

"اونہہ — اللہ خاک اپنا فضل نہ کرے گا — سر پکڑے روئیں گی آپ! ایک جوان لڑکا اور لڑکی کا یوں دن رات ملنا۔۔۔۔"

"کیوں ؟ کیا ہوا ؟ کیا تم سے فرحت نے کچھ کہا ؟" وہ چونک پڑیں۔

"نہیں فرحت نے کچھ نہیں کہا، مگر میرے کیا آنکھیں نہیں ہیں؟" میں بہت دیر تک انھیں اُونچ نیچ سمجھاتی رہی۔ وہ بہت دکھی سر جھکائے نہ جانے کیا سوچتی رہیں۔

"سوامی جی نے سات پڑیاں دی ہیں۔ ہر منگل وار کو ایک پڑیا پان یا گرم دودھ کے ساتھ۔"

"فرحت کو دی ہیں؟"

"نہیں امداد میاں کو!"

"امداد میاں کو —— ؟" میں جل کے رہ گئی۔ "سات پڑیاں کیا۔ انھیں سات ایٹم بم بھی نگلا دیئے جائیں تو کچھ نہ ہوگا، کیا امداد میاں آتے ہیں؟"

"ہاں ہر منگل وار کو آتے ہیں۔ نہا دھو کر دو رکعت شکرانہ پڑھ کے گرم دودھ کے ساتھ اور...."

"اور بھی؟ یعنی حد ہو گئی —— یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟"

"اے بہن تو وہ اس کا شوہر.."

"مگر.... انور اور امداد میاں.... یعنی.... یہ کیا ہو رہا ہے؟" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بتاؤں۔ کیا یہ کم بخت اندھی ہے؟ مگر میری ہمت نہ پڑی۔

"اگلے منگل وار کو چوتھی پڑیا ہو جائے گی۔" وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

"سوامی جی کہتے ہیں اللہ نے پانچویں پڑیا...."

"سکینہ بہن اللہ کے واسطے یہ مذاق اچھا نہیں۔ اب فرحت کی طلاق کے

لئے کچھ کیجئے۔ اور کم بخت امداد میاں سے مہر دھروا لیجئے۔" میں نے سوچا، افو! اور فرحت الگ فلیٹ لے کر زندگی بڑے مزے سے شروع کر سکیں گے۔

"مہر — ؟" سکینہ بی بھونچکی رہ گئیں

"کتنا ہے مہر؟"

"خاک بھی نہیں۔ اب آپ سے کیا چھپانا، پچیس ہزار مہر تھا تو دس ہزار سرفراز میاں لے کے ولایت چلے گئے۔ ایسے سدھارے ہیں کہ پلٹنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ وہیں میم سے شادی کر لی، ایک بچّی بھی ہو گئی۔

سرفراز میاں سکینہ کے بڑے بیٹے کے ایک دوست کی معرفت فرحت کا رشتہ ہوا تھا۔ عمر زیادہ تھی امداد میاں کی۔ مگر بیٹے کے مستقبل کا سوال تھا — "کسی قابل ہو کر آ گئے تو خاندان کی گری ہوئی حالت سنبھل جائے گی — سو وہ پلٹے ہی نہیں۔ اُلٹے چھ ہزار اور منگا لئے کرائے کے نام سے۔ امداد میاں پکّے بنیئے نکلے۔ سب مہر کے حساب میں لکھوا لیا۔"

"مگر یہ تو ہوئے سولہ ہزار — باقی.... ؟"

"دہلی پر فلیٹ ہے..... وہ رضیہ کے نام ہے۔ میں نے کہا کچھ تو ہو نیک بخت کے لئے۔ آج کل کے لڑکے منہ پھاڑ کے دوڑتے ہیں۔"

مجھے فرحت پر بے طرح ترس آنے لگا۔ بھائی کے مستقبل اور بہن کی شادی کے لئے اس کی زندگی مٹی میں ملا دی۔ ایسی ماں اور نائکہ میں کیا فرق ہے؟ اور اسی لئے سکینہ بیگم طلاق سے بوکھلائی جاتی ہیں۔"

"بہن اگر امداد نے اور شادی کر لی تو ہم لوگ کہیں کے نہ رہیں گے۔

کیسے کیسے میں نے چلے کھینچے ہیں، وظیفے پڑھے ہیں، منتیں مانی ہیں، جبھی تو شادی نہیں کی۔ ورنہ لوگ تو انھیں خوب بھڑکا رہے ہیں۔"

مجھے وحشت ہونے لگی۔ کتنی بے وقوف ہے یہ عورت! کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کیا ہو گا؟"

"دیکھئے آپ فکر نہ کیجئے۔ آپ انور اور فرحت کے ساتھ رہیں گی۔ رضیہ کی بغیر فلیٹ کے بھی اچھی جگہ شادی ہو جائے گی۔ آپ طلاق کی فکر کیجئے۔"

انھوں نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔

اور وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ دو چار دن سے انور کچھ بوکھلائے سے پھر رہے تھے۔ فرحت بھی کچھ ویران سی نظر آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا کچھ جھگڑا ہو گیا؟" تو دونوں گھبرا گئے۔

رات کو کچھ عجب دھما چوکڑی سی انور کے کمرے میں مچی ہوئی تھی۔ اندر سے فرحت کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"اندر آئیے!" وہ مجھے ہاتھ پکڑ کر لے گیا۔ "اس بے وقوف کو سمجھائیے۔"

"کیا ہوا ــــ؟"

"آنٹی ــــ!" وہ میرے پیروں سے لپٹ گئی۔

"یہ کھڑکی سے کود کر ــــ" انور بری طرح لرز رہا تھا۔

"پاگل ہوئی ہو؟" میں نے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھایا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یوں رو رو کر ہلکان ہونے سے فائدہ؟ طلاق کے بعد۔۔۔؟"

"ہائے آنٹی جی! امی طلاق کے نام پر منہ پیٹے لیتی ہیں ــــ کہتی ہیں

سنکھیا کھالوں گی!"

"امی کم بخت کا تو بھیجہ پگھل گیا ہے، تم خود بالغ ہو طلاق لے سکتی ہو —
اور پھر اب ایسے حالات ہیں تو...... وہ راضی ہو جائیں گی۔"

"نہیں آنٹی جی، وہ...... وہ نہیں مانیں گی — ہائے میں مر جاؤں۔"

"مر جاؤ گی مگر اپنے حق کے لئے ذرا اپنی امی سے مقابلہ نہیں کرسکتیں۔"

"ان کا رونا نہیں دیکھا جاتا، کل انھیں بڑے زور کا دورہ پڑا۔ دانت بھنچ گئے — بس اتنی سی بات ہوئی تھی کہ میں نے کہا انھیں منع کر دو وہ منگل وذگل کو نہ آئیں، میں ان کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی — مجھے گھن آتی ہے۔ ہائے آنٹی آپ کو کیا بتاؤں، وہ تو آدمی نہیں کتا ہے۔" منہ ڈھک کے وہ پھر سسکیاں لینے لگی۔

"تم نے اپنی ماں کو بتایا؟"

"نہیں جب انھیں اصلیت کا پتہ چلے گا۔ وہ مجھے کاٹ کے پھینک دیں گی!"

"نہیں جب انھیں اصلیت کا پتہ چلے گا تو دماغ درست ہو جائے گا۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے؟ میں صبح جا کر ان سے سب کچھ کہہ دوں گی اور آٹھ دن کے اندر طلاق...."

"طلاق تو وہ مر کے بھی نہ لینے دیں گی۔ ویسے ہی ہر وقت کہتی ہیں تو تو خاندان کا نام اُچھالے گی۔ تیرا کیا ہے؟ دوسرا خصم کر، پھر تیسرا کر۔"

میں نے اسے سمجھایا، یقین دلایا، اس کی ڈھارس بندھ گئی اور تھوڑی ہی دیر میں مسکرانے لگی — روئی روئی شکل پر ہنسی کچھ ایسی پیاری لگ رہی تھی کہ اندر کی نیلی نیلی آنکھیں اس کے چہرے پر جھک گئیں۔

میں ان دونوں کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ سونے کی کوشش کی مگر نیند اُڑ گئی۔ اگر امداد میاں کو پتہ چل گیا تو غضب ہو جائے گا —— انور ملٹری میں ہے۔ کم بخت کا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔ امداد کی پہلی بیوی تو اُدھار کھائے بیٹھی ہیں۔ سکینہ بیگم اور فرحت کی دھجیاں اُڑا دیں گی —— ڈرتی ڈرتی میں صبح ان کے پاس پہنچی۔ حسبِ عادت وہ فکر مند سی بیٹھی تھیں۔ میں نے بڑی رسانیت سے فرحت کی بپتا سنائی۔ قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ انور دغا نہ دے گا۔ وہ تو اس پر جان چھڑکتا ہے! ۔ میں پوری سی گم سُم رہ گئی —— سکینہ بیگم کے کلیجے پر جیسے مشین گن کی باڑھ چل گئی۔ پاگلوں کی طرح ہنسیں اور بچوں کی طرح رونے لگیں۔ سوکھے پتے کی طرح ان کا جسم کانپا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئیں۔ میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ رضیہ کالج جا چکی تھی، فرحت اپنے کمرے میں بیٹھی کانپ رہی تھی۔ انھوں نے کسی کو کوسا نہ پیٹا، نہ میرے منہ پر تھوکا کہ میرے بھائی نے ان کا نصیبہ پھوڑ دیا۔

"آپ اسی وقت وکیل کے پاس چلیئے اور فرحت کو میں اپنی بہن کے پاس دہلی بھیجے دیتی ہوں۔ امداد پر ہر طرح کا دباؤ ڈالا جائے گا —— آپ فکر نہ کیجیے۔"

ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، سر جھکائے بیٹھی رہیں۔

"وکیل؟" انھوں نے احمقوں کی طرح کہا "ہاں — مگر اس وقت . . . میں پھر آپ کو فون کر دوں گی۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔" انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

واپس آکر میں فون کے انتظار میں بدحواس رہی۔ کہیں دونوں ماں بیٹی زہر کھا کر نہ سو رہیں۔ ساری عمر کی تہمت پڑھ جائے گی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ حالات یوں پلٹا کھائیں گے۔

انور کا عجیب حال تھا۔ کہتے ہیں مرد بے وفا ہوتے ہیں عورت کو مصیبت میں پھنسا کر رفو چکر ہو جاتے ہیں مگر انور کی تو جان نکلی جا رہی تھی۔ شام تک انتظار کیا مگر فون نہ آیا۔ جھک مار کر میں نے فون کیا تو جواب نہ ملا۔ جب بہت ہی بے چین ہو گیا تو میں نے انور کو بھیجا۔

انور لوٹا تو صورت دیکھ کے میرا دم نکل گیا۔

"کیا کہا؟"

"گھر میں کوئی نہیں" تالہ پڑا ہے۔ گورکھے سے پوچھا۔ معلوم ہوا سب گئے!"

"کہاں گئے؟"

"کچھ پتہ نہیں!"

رات انگاروں پر کٹی۔ انور پاگلوں کی طرح دنیا بھر کو فون کرتا رہا۔ امداد میاں کی سسرال کو فون کیا۔ پتہ چلا، کہاں گئے ہیں، کچھ معلوم نہیں — شاید ورسووا کے فلیٹ میں ہوں گے۔

انور دیوانوں کی طرح ورسووا بھاگا۔ میں نے بہت روکا لیکن اس پر تو بھوت سوار تھا۔

وہاں ایک نوکر تھا۔ اس نے کہا کھار گئے ہوں گے یا چرچ گیٹ۔ ایک اڈا پیڈر روڈ پر بھی تھا۔ وہاں بھی نہ ملے۔ تین چار دن گزر گئے تب معلوم ہوا کہیں باہر گئے ہیں۔ آفس کو پتہ ہوگا۔ منحوس کے تین چار آفس تھے کہیں نہ معلوم ہو سکا کہ کہاں مر گئے۔

ٹھیک ساتویں دن ایک لفافہ ملا۔ میلا کچیلا پھٹا ہوا۔ لکھا تھا۔

"خدا کا واسطہ مجھے بچاؤ۔ اس جہنم سے نکالو۔ میری جان پر ایسا پہرہ ہے کہ سانس لینا مشکل ہے۔ اللہ میری جان پر رحم کرے!

"فرحت"

خط پڑھ کر تو اور سولی سوار ہو گئی۔ مٹی مٹی مہر سے پتہ چلا خط بیگم پیٹھ سے ڈاک میں ڈالا گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ حیدر آباد گئی ہوں گی۔

کون بچائے کیسے بچاتے؟ انور دیوانوں کی طرح حیدر آباد بھاگا۔ اِدھر اُدھر سر مار کے لوٹ آیا، کچھ پتہ نہ چلا۔

کیا دل پر دحشت تھی۔ اب بھی سوچتی ہوں تو پھریریاں آنے لگتی ہیں۔ انور کو کن مصیبتوں سے سنبھالا ہے کہ بس میں ہی جانتی ہوں۔ اس گناہ میں میری مدد بھی شامل تھی۔ میرے دامن پر بھی بے گناہ خون کے دھبے تھے — اسی سال انور کا تبادلہ دہلی کی طرف ہو گیا۔ میری جان چھوٹی! اس واقعہ کو کتنے ہی سال بیت گئے۔ انور کو صبر آ گیا۔ چاند سی دلہن اور بچوں نے سب کچھ بھلا دیا۔

میں مارک اینڈ اسپنسر سے نکل رہی تھی اور وہ داخل ہو رہی تھیں۔ ٹکر ہوتے ہوتے بچی! تھوڑی دیر ہم احمقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"بہن آپ!" وہ سمور کا کوٹ پہنے مجھ سے لپٹ گئیں۔ "اللہ کتنے سال ہو گئے!"

"سکینہ بہن!" میرا حلق خشک ہو گیا۔

"سرفراز میاں کے ہاں ٹھہری ہوئی ہوں۔ انھوں نے تو پلٹنے کا نام نہیں لیا۔ میں نے کہا چلو میں ہی ناک نیچی کر کے مل آؤں۔ اس بہانے ولایت کی سیر بھی ہو جائے گی۔ اللہ اللہ کیا بہشت بریں بنایا ہے ان فرنگیوں نے۔" وہ اٹلی، فرانس

اور سوئٹزرلینڈ کے قصّے بیان کرنے لگیں۔

ان کی صورت پر ایک دم اطمینان اور جوانی ٹوٹ پڑی تھی پہلے سے بھاری بھرکم بھی معلوم ہو رہی تھیں۔ کسی اچھے ہیر سیلون سے بال بنوائے تھے —— وہ حیران پریشان سکینہ سوکھی ڈال سے ایک دم لہلہاتا چمن بن گئی تھیں۔

"فرحت کیسی ہے؟" میں نے ذرا تکلّف محسوس کیا۔

"اللہ کے فضل سے بہت خوش و خرم ہیں میاں بیوی۔ نادر میاں بھی خیر سے اسکول جاتے ہیں۔ ناظم آباد میں کیا لق و دق کوٹھی ہے۔ ٹی وی ہے —— کیا پیاری صورت ہے نادر کی۔ بنا بنایا باپ ہے!"

"باپ!" میں اُلجھن میں پڑ گئی۔

"جی ہاں، وہی چٹّا رنگ اور نیلی آنکھیں!"

"امداد میاں کی نیلی آنکھیں؟"

"اے ہے، آپ تو ایسی بن رہی ہیں جیسے ...." وہ ڈھٹائی سے کھلکھلائیں اور جلدی جلدی سامان ٹرالی میں رکھنے لگیں۔

"اور وہ سات پڑیاں؟" میں نے کریدا۔

"اللہ قسم آپ کو ایک ایک بات یاد رہتی ہے —— پورے چار ہزار دیئے تھے سوائی"

"پڑیوں کے یا ترکیب کے؟"

"وہ نگوڑا تو کچھ اول فول بکے تھا۔"

"یعنی اپنی خدمات پیش کر رہا تھا۔؟"

"جی اور دس ہزار مانگ رہا تھا۔ مگر نیک بخت کی صورت دیکھ بخار چڑھے

تھا؛ وہ بڑبڑائیں۔

"امداد میاں کو شک تو نہیں ہوا؟"

"اے ہٹاییے بھی ــــ دنیا جہاں کے مردود ہے جو اپنی اولاد پر شک شبہ کرنے لگیں تو.... بس اب جانے بھی دیجیے۔ اتنی عقل اپنی گرہ میں ہوتی تو میری معصوم بچی پر الزام نہ تھوپتے اپنے بوڑھے گریبان میں بھی ایک بار جھانک کر دیکھتے۔ اے مٹی ڈالیے ان باتوں پر دم ٹوٹتا ہے میرا۔"

"انور بے چارہ بہت تڑپا، آپ لوگوں نے صورت بھی نہ دکھائی بیٹے کی۔" میں نے چٹکی لی۔

"بس جانے دیجیے! یہ جو گلی گلی بچے پٹکاتے پھرتے ہیں تب کلیجہ نہیں پھٹتا۔ جیتا رہے اللہ اسے درجنوں بچے دے۔" وہ انور کو دعائیں دینے لگیں۔

میں نے ان کے بیش قیمت سمور کو دیکھا اور چائنا سلک کے اسکارف کو۔ پھر تخیّل میں ناظم آباد میں پھیلی ہوئی لق و دق کوٹھی کا رقبہ ناپا۔ بٹوے میں سے جھلکتے نوٹ، ہرے ہرے پونڈوں کی گڈی دیکھی اور مجھے بے طرح کوفت ہونے لگی۔ میں کیوں چور بنی بیٹھی تھی فرحت کی گود بھرنے میں میری ہمدردیاں بھی تو شامل تھیں۔ اور انور کتنا بدھو تھا۔ برسوں ضمیر کی ملامتیں سہتا رہا۔ جسے وہ اپنی نادانی میں گناہِ عظیم سمجھے بیٹھا تھا وہ تو عین ثواب تھا۔

"بیسویں صدی" دہلی

احمد ندیم قاسمی

لارنس آف تھلیبیا

پلنگ اتنا چوڑا تھا کہ اس پر جو کھیس بچھا تھا وہ چار کھیسوں کے برابر تھا۔ اس کے وسط میں نلپش کے ایک گاؤ تکیے کے سہارے بڑے ملک صاحب کے جسم کا ڈھیر پڑا تھا۔ ان کی انگلیوں، انگوٹھوں۔ پنڈلیوں، رانوں، کمر پیٹھ کندھوں اور سر کو بہت سے میراثی، نائی، جھیور، دھوبی، موچی، کمہار اور کسان دبا رہے تھے میں ذرا دور بیٹھا تھا اس لئے وہاں سے مجھے یہ منظر یوں دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے ایک بڑے سے غبارے کو ہوا میں اڑ جانے سے روکنے کے لئے اس کے ساتھ بہت سے بچے چمٹ کر رہ گئے ہوں۔ پھر خدا بخش نے چوپال میں قدم رکھا۔ بڑے ملک صاحب بولے "آج چھوٹا ملک بہت خوش ہے آج اس کا یار آیا ہوا ہے لاہور سے۔" انھوں نے ایک لمبی کانکھ کے ساتھ پلٹ کر میری طرف دیکھنے کی اور شاید مسکرانے کی بھی کوشش کی مگر یہ مسکراہٹ مجھ تک نہ پہنچ سکی۔ ان کے سوجے ہوئے گالوں اور گھنی گل مچھوں سے ٹکریں مار کر وہیں کہیں مر گئی۔

میں دور اس لئے بیٹھا تھا کہ میرے لئے چائے آنے والی تھی۔ بشکو چوپال کے برآمدے کے آخری سرے پر دو کرسیاں اور ایک تپائی رکھ کر اور مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر، خدا بخش کو بلانے اور چائے لانے چلا گیا۔ بشکو خدا بخش کا بہت چہیتا نوکر تھا۔ نام تو اس کا بھی خدا بخش تھا، مگر خدا بخش اسے بشکو کہتا تھا۔ چنانچہ یہی اس کا نام پڑ گیا۔

خدا بخش کی امی کو نزلے اور بخار کی شکایت تھی اس لئے وہ بار بار اندر حویلی کا چکر لگا آتا تھا۔ اب کے وہ واپس آیا تو میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بتایا کہ "اس کی امی کا بخار اب ہلکا ہے اور وہ آرام کر رہی ہیں۔ ان کا بخار تیز رہتا تو آج میں تمھیں باز کے شکار کا تماشہ نہ دکھا سکتا۔" وہ بولا "لارنس آف عربیا کی طرز پر میں نے اپنے باز کا نام لارنس آف تھلیبیا رکھ لیا ہے۔ تھل کو تھلیبیا میں بدلنے پر تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" وہ ہنسا۔ "ابھی چائے کے بعد تم اور میں اور بشکو گاؤں سے باہر نکل جائیں گے۔ بشکو میرے باز کا سائیس ہے۔" وہ پھر ہنسا۔ "یوں سمجھ لو کہ وہ لارنس آف تھلیبیا کا اردلی ہے۔ وہ باز کو اپنی مٹھی پر بٹھائے گا اور ——"

دھم دھم کی آواز سے ہم چونکے، دیکھا تو دو آدمیوں نے ایک اور آدمی کو پکڑ کے بڑے ملک صاحب کے سامنے جھکا رکھا تھا اور ملک صاحب اس کی پیٹھ پر مکوں کا مینہ برسا رہے تھے اور ساتھ ہی ایسی گالیاں بھی دیتے جاتے تھے جو صرف بڑے ملک ہی کسی کو دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ ہانپ ہانپ کر کہتے جاتے تھے "یہ بھری مجلس میں کہتا ہوا، ملک جی، تہہ بند سنبھالو

ننگے ہو رہے ہو —— اس حرامزادے سے کوئی پوچھے کہ تمہیں کیا تکلیف تھی۔ میں ہی ننگا ہو رہا تھا تمہاری ماں تو ننگی نہیں ہو رہی تھی۔"

خدا بخش نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا: "آگئی شامت بے چارے کی۔ اب جب تک یہ ہاتھ پیر ڈھیلے نہیں چھوڑ دیتا۔ ابا اسے کوٹتے ہی رہیں گے۔"

خدا بخش کے لہجے میں برتری کا غرور تھا۔ میں نے کہا: "خدا بخش تمہیں شرم نہیں آتی؟ تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔"

خدا بخش نے معذرتی انداز میں کہا: "کیا کریں یار —— ان لوگوں سے یہی سلوک کیا جائے تو سیدھے رہتے ہیں۔"

اتنے میں بشکو چائے لے آیا طشت کو تپائی پر رکھتے ہوئے اس نے جھک کر خدا بخش کے کان میں کہا: "سکین ایسا تو لڑکا تو نہیں چھوٹے ملک۔ پھر اسے مار کیوں پڑ رہی ہے؟"

"اچھا تو یہ سکین ہے!" خدا بخش نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ اس کے تو منہ میں زبان بھی نہیں —— پانچ وقت کا نمازی ہے اذان ایسی دیتا ہے کہ چڑیاں مسجد کے میناروں پر اتر آتی ہیں۔ اس نے یہ کیا بک دیا ابا سے!

بڑے ملک صاحب کے دھموکوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ سکین ان آدمیوں کے ہاتھوں میں لٹک گیا تھا جنھوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر ملک صاحب کی آسانی کے لئے ان کے سامنے جھکا رکھا تھا۔

"اب چھوڑ دو اس کمینے کو۔" ملک صاحب کڑکے اور سکین منہ کے بل پتھر کی طرح گر پڑا۔ "اٹھا لے جاؤ اپنی اپنی ماؤں کے اس یار کو —— ملک صاحب

پھر گر پڑے۔ اور ایک ہجوم کا ہجوم سکین کو اٹھانے یوں بے تابی سے بڑھا جیسے سب لوگ سکین کو اٹھانے کے بہانے ملک صاحب کو پلنگ پر سے اٹھا کر پھینکنے چلے ہیں۔ پھر جو لوگ سب سے پہلے بے حس و حرکت سکین کے پاس پہنچے تھے اسے اٹھانے کے لئے جھکے تو جھکنے والوں میں سے ایک سیدھا ہو گیا اور بڑی تشویش سے بولا "سکین تو اذان پڑھ رہا ہے!"

پھر سکین خود ہی اٹھ بیٹھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر جیسے ملک صاحب سے جانے کی اجازت لینے کے لئے بولا "سورج تو بہت ڈھل گیا بیشی کی نماز تو ہو چکی ہوگی؟"

سبھی کو خاموش پا کر وہ اٹھا تو میں نے دیکھا کہ وہ چھ فٹ کا ایک وجیہہ جوان تھا اور جب وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا، چوپال کے چبوترے کی سیڑھیاں اُتر کر گلی میں جانے لگا تو مجھے ایسا لگا جیسے گلی میں ایک مینار چل رہا ہے۔

آجاتے ہیں ماں کے یار چوپال پر گپ لڑانے کے لئے۔" بڑے ملک صاحب کہہ رہے تھے "چوپال پر بیٹھنے کی ایک تمیز ہوتی ہے۔ کہنے لگا ملک جی ننگے ہو رہے ہو ــــ ہر کبھی میں ننگا ہو رہا ہوں تو تم دھیان نہ دو۔ انسان دوپہر کے وقت بھی آنکھیں بند کر لے تو اس کے لئے سورج ڈوب جاتا ہے۔ پھر تم آنکھیں پھاڑے میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟" ذرا سا رُک کر انھوں نے پلٹنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا "کیوں چھوٹے ملک؟ چائے پلا دی اپنے یار کو؟" جواب کا انتظار کئے بغیر فوراً ہی انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور بولے ــــ "لو بھئی اسے دبا دو۔ دُکھنے لگا ہے حرامزادے کی ہڈیاں کوٹ کوٹ کر۔"

"یہ حرامزادہ کون تھا؟" میں نے آہستہ سے خدا بخش سے پوچھا۔

"اس کا نام سکین ہے،" خدا بخش بولا۔ "ذات کا جولاہا ہے۔ یہ کھیس جو آبا کے پلنگ پر بچھا ہے اسی نے بُنا ہے، بڑا کاریگر آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی مگر بہت بھولا ہے۔ نہ جانے آبا کو ٹوکنے کا حوصلہ کیسے ہوا اس بدنصیب کو ابہ تو بڑا ہی مسکین آدمی ہے۔"

بشکو فوراً بولا۔ "اس کا اصلی نام مسکین ہے جی۔ محمد مسکین۔ سکین سکین تو لوگ اسے دیسے ہی کہتے ہیں، جیسے مجھے بشکو بشکو کہتے ہیں۔"

"میں نے کہا۔ "یہاں آکر معلوم ہوا کہ مسکین جیسے لفظ میں بھی بگڑنے کی گنجائش موجود ہے۔"

"آہستہ بولو یار۔" خدا بخش نے ڈر کر بڑے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ "انھوں نے سُن لیا تو شاید تمہیں تو کچھ نہ کہیں، میری آفت آجائے گی۔"

"نہیں ——— اب کیا آفت اٹھے گی۔ اب تو ان کا ہاتھ دکھ رہا ہے۔"

خدا بخش کو میرا لہجہ اچھا نہ لگا اس نے جیسے ملامت بھیجتے ہوئے مجھے دیکھا اور بشکو سے کہا۔ "اصطبل میں جاکر دیکھو، بیگے نے گھوڑے تیار کر لئے ہیں یا نہیں۔ زینیں کس لی ہوں تو تم جاکر لارنس کو اُٹھا لاؤ۔ صبح کا بھوکا ہے۔" بشکو چلا گیا تو خدا بخش میری طرف مُڑا۔ "دیکھو میاں یہاں آج تمہارا پہلا دن ہے اور تم آج ہی طنز کرنے لگے ہو میرے آبا پر ——— اس علاقے کا ایک مقولہ ہے کہ سر جتنا بڑا ہوتا ہے۔ وردِ سر کا رقبہ اتنا ہی پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ آبا کو یہ پٹائیاں مجبوراً کرنی پڑتی ہیں۔ ——— نہ کریں تو زمینداری کیسے چلے ———" وہ رُک گیا، پھر بولا ——— "تم کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ جس لمبے چوڑے پلنگ پر ملک صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ اس کے پائے کتنے بڑے بڑے ہیں میں نے انھیں غور سے

دیکھا تو وہ لکڑی کے نکلے۔"

حیران ہو کر خدا بخش نے پوچھا: "لکڑی کے نہ ہوتے تو اور کس کے ہوتے؟ تم نے پہلے کیا سمجھا تھا؟"

میں نے کہا: "میں سمجھا یہ پائے نہیں، بلکہ پلنگ کے ہر کونے کے نیچے ایک ایک مسکین کھڑا ہے۔"

"گاؤں کی کھلی فضا کا تم پر اُلٹا اثر ہوا ہے۔" خدا بخش بولا "تم چکرا گئے ہو۔"

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اور خدا بخش۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر یہ چاروں مسکین پلنگ کے چاروں گوشوں کے نیچے سے نکل جائیں تو پلنگ زمین پر آ رہے۔"

"گھوڑے تیار ہیں چھوٹے ملک۔" بشکو ہمارے سروں پر بولا۔

بشکو کے بائیں ہاتھ کی بند مٹھی پر چمڑے کا دستانہ چڑھا ہوا تھا جس پر لارنس آف تھلیبیا بیٹھا تھا۔ اس کے پنجے میں باریک سی ایک زنجیر تھی جس کا آخری سِرا دستانے میں ٹکا ہوا تھا۔ باز کی آنکھوں پر چمڑے کے کھوپے چڑھے ہوئے تھے۔ خدا بخش نے سر اٹھا کر یہ کھوپے ہٹائے تو میں نے دیکھا کہ باز کی آنکھوں میں بلا کی وحشت تھی۔

"کیوں کیسا ہے میرا باز؟" خدا بخش نے پوچھا۔

اور میں نے اس کے کان میں کہا: "بازوں کا بڑا ملک معلوم ہوتا ہے!"

خدا بخش ہنس پڑا۔ مگر یوں ہنسا جیسے نہ ہنستا تو اور کیا کرتا۔ اس نے باز کی آنکھوں پر پھر سے کھوپے چڑھائے اور ہم لوگ اصطبل کی طرف چلے۔

خدابخش نے قسمیں کھا کھا کر مجھے یقین دلایا کہ اس نے جو گھوڑا مجھے سواری کے لئے دیا تھا وہ ملک صاحب کے اصطبل کا مسکین ترین گھوڑا تھا۔ "اتنا موٹا تازہ گھوڑا مسکین تو نہیں ہو سکتا۔" میں نے شبہ ظاہر کیا۔ مگر اس نے مجھے بتایا۔ "اس کے اندر کا گھوڑا پنا مار دیا گیا ہے اب یہ طبیعت کا بہت غریب گھوڑا ہے اسے موٹا تازہ رکھنا بہت ضروری ہے ضلع کے افسر لوگ جو اس طرف دورے پر آتے ہیں اچھے سوار نہیں ہوتے، ہوتے بھی ہیں تو کاروں میں پھیل پھیل کر بیٹھنے کی عادت پڑی ہوتی ہے۔ اور گھوڑے کی پیٹھ پر چوکس ہو کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ سو آپا نے اس کام کے لئے یہ گھوڑا چنا کہ اس پر افسر سوار ہو تو اس کی افسری کی شان بھی قائم رہے اور یوں بھی نہ ہو کہ لگام کو ذرا سا بھی ڈھیلا پا کر وہ افسر کو اپنی پیٹھ پر سے ریٹائر کر دے۔ چنانچہ اس گھوڑے پر یا تو ڈپٹی کمشنر بیٹھے ہیں یا آج تم بیٹھے ہو۔"

میں نے کہا۔ "تو جبھی اس وقت تم مجھے پٹواری لگ رہے ہو۔"

خدابخش کا گھوڑا بہت منہ زور تھا۔ کنوتیاں اٹھا کر اور نتھنے پھلا کر وہ جیسے لگام کو چبا کر اڑ جانا چاہتا تھا۔ مگر خدابخش اچھا سوار تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو میرے گھوڑے سے آگے نہ بڑھنے دیا جس کی کنوتیاں تو اٹھی ہوئی تھیں مگر چل یوں رہا تھا جیسے سسرال کے صحن میں پہلی بار داخل ہوتے ہوئے دلہنیں چلتی ہیں۔ بشکو باز کو ہاتھ پر بٹھائے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ بھاگ بھی نہیں رہا تھا اور چل بھی نہیں رہا تھا۔ بس بین بین کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔

کیکروں کے گنجان ذخیرے کا موڑ کاٹتے ہی حدِ نظر تک پھیلا ہوا ایک چٹیل ویرانہ تھا۔ جس میں کہیں کہیں بہت فاصلے پر کیکر اُگے ہوئے تھے، مگر

یہ کیکر بیمار سے لگتے تھے ۔ ان کے قد بہت چھوٹے اور شاخیں بہت ٹیڑھی اور ننگی تھیں ۔ لالیاں شام سے پہلے انہی اِکا دُکا کیکروں پر آکر بیٹھتی ہیں ـــــ"
خدا بخش نے مجھے بتایا" اور لالی باز کا من بھاتا کھاجا ہے ۔ میرا لارنس لالی کو دیکھتا ہے تو پاگل ہو جاتا ہے ۔ لالی کا گوشت میرے لارنس آف تھلیبیا کی ڈِسکی ہے!

میں نے کہا" خدا بخش لالی تو بڑا ہی معصوم پرندہ ہے ۔ یہ تو چڑیا سے بھی زیادہ معصوم ہوتا ہے ۔ اس کی پیلی پیلی کچّی کچّی باچھیں اس پر کیسا بچپنا سا طاری کئے رکھتی ہیں ۔ پھر یہ پرندوں میں شاید سب سے زیادہ بے ضرر ہے ۔ یہ تو نہایت مسکین مخلوق ہے ۔ آخر تم لوگوں کو مسکینوں کا خون پینے کا اتنا شوق کیوں ہے ۔؟

خدا بخش بولا" اگر تمہیں تقریر کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو راستے میں ابھی کوئی ٹیلا آئے گا، تم اس پر چڑھ جانا اور اپنی تقریر جھاڑنا ۔ میں اور بشکو دست بستہ سنیں گے ۔ مگر ابھی ذرا رُک جاؤ ۔ میرے لارنس کو دیکھو، بشکو کی مٹھی پر کیسے بار بار پھڑپھڑا جاتا ہے ۔ اس نے ویرانے کی بُو، سونگھ لی ہے ۔"

"لالی"! بشکو سانپ کی طرح پھنکارا اور خدا بخش نے گھوڑا روک لیا ۔ میرا گھوڑا تو اس کی دیکھا دیکھی چل رہا تھا ۔ چنانچہ وہ بھی رُک گیا ۔

خدا بخش نے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اُتارنے سے پہلے مجھے غور سے تماشہ دیکھنے کی تلقین کی ۔" یہ تمہاری زندگی کا ایک کبھی نہ بھولنے والا تجربہ ہوگا ۔"
اس نے کہا" مزہ آجائے گا جب باز لالی پر جھپٹے گا تو ایسی آواز پیدا ہوگی جیسے ہوا کو تلوار کاٹ رہی ہے ـــــ دیکھو"

خدا بخش نے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اتارے اور اس کا رُخ دور

ایک ٹیڑھے میڑھے کیکر کی طرف کر دیا جس پر تقدیر نے ایک لالی کو لا بٹھایا تھا۔ ایک دم باز پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس نے دیکھ لیا لالی کو۔ خدا بخش نے خوش ہو کر مجھے بتایا اور بشکو نے باز کے پنجے کو اپنے دستانے سے آزاد کر دیا۔ موت کی تلوار ہوا کاٹتی ہوئی چلی گئی اور لالی اڑ گئی۔ مگر باز نے آن کی آن میں اس کو جا لیا۔ لالی کی ایک چیخ نے اس ویرانے کو ذرا سا چونکا دیا، اور پھر باز لالی کو اپنے پنجوں میں دبائے واپس بشکو کی مٹھی پر آ بیٹھا تب اس نے لالی کی چیر پھاڑ شروع کر دی۔ اس کی مڑی ہوئی چونچ لالی کے خون میں رنگ گئی، پھر اس نے لالی کی بوٹیاں نوچنا شروع کر دیں اور خدا بخش مسلسل بولتا رہا۔ "اس کے کھانے کا قرینہ دیکھو ــــ ہڈی پر سے گوشت کیسے اُتارتا ہے، انسان کو بھی ایسا سلیقہ نصیب نہیں اور پھر یہ نوکیا گوشت ہے تازہ اور وٹامن سے بھرپور!"

"لعنت!" میں نے کہا۔ "تمہاری ذہنیت تو آدم خوروں کی سی ہے۔"

مگر خدا بخش ہنستا رہا اور میری طرف یوں دیکھتا رہا جیسے میں بیمار ہوں اور وہ میری دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔

باز جب لالی کو چبا چکا تو جیسے اسے نشہ ہو گیا، اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا بخش بولا۔ "لارنس آف تھلیبیا آؤٹ ہو گیا ــــ" پھر ہنستا ہوا وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ باگ موڑی مگر پھر رک گیا۔ کچھ سوچ کر بولا۔ "کیوں بشکو یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو بابا یارو کو کیوں نہ دیکھتے چلیں۔؟"

بشکو بولا۔ "بابا یارو کی آنکھ بھی باز کی طرح تیز ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے

ہمیں دیکھ ہی لیا ہو، ہم واپس چلے گئے تو وہ ضرور گلہ کرے گا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" خدا بخش میری طرف مڑا۔ "چلو تمہیں گُل کی چائے پلائیں۔ یہاں قریب ہی ہمارے پرانے مزارعے بابا یارو کا ڈیرا ہے، وہاں چلتے ہیں۔ تم اس سے مل کر خوش ہو گے۔"

باز نے جس وحشت سے لالی کو کھایا تھا، اس سے میری طبیعت بالکل کھس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "جہاں چاہو چلے چلو۔"

ڈھائی تین میل کا فاصلہ طے کر کے ہم سُرخی مائل مٹی سے لپے ہوئے ایک گھروندے کے پاس پہنچے۔ خدا بخش نے چپکے سے اترنے اور آہستہ آہستہ قریب جانے کی تجویز پیش کی۔ وہ بولا۔ "بڑا لطف آئے گا۔ ایک بار میں اور دشکو یونہی چپکے سے آئے اور بابا یارو کے پاس ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ بابا یارو اپنی رسیاں بٹنے میں مگن رہا، مائی بیگاں چولہے میں پھونکیں مارتی رہیں اور رنگی ٹوکے سے چارہ کترتی رہی کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔ پھر جب انھیں پتہ چلا تو بابا یارو اتنا شرمندہ ہوا کہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ منہ سے بس پھپ پھپ کر کے رہ گیا۔ مائی بیگاں اپنے بڑھاپے کو گالیاں دیتی رہی۔ اور رنگی تو اتنا ہنسی کہ جب بابا کی پھٹکار پر بھی اس کی ہنسی رُکنے میں نہ آئی تو وہ اندر کوٹھے میں بھاگ گئی۔"

گھروندے کے پچھواڑے گھوڑوں پر سے اُتر کر ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھے، صحن میں کیکر کے بڑے بڑے درخت تھے، نیچے ایک گائے اور چند بھیڑیں بکریاں شاید عادتاً بیٹھی تھیں۔ کیونکہ درختوں کے سائے اپنے تنوں کے سائے سے بہت دُور جا چکے تھے۔ ان بھیڑوں کے پاس کھٹولے پر بابا یارو بیٹھا اُون بٹ رہا تھا۔

دیوار کے ساتھ لگے ہوئے چولہے میں آگ جل رہی تھی اور مائی بیگاں ہانڈی میں چمچہ چلا رہی تھی جیسے پتھر اُبال رہی ہے۔ دونوں اپنے اپنے کام میں ایسے محو تھے کہ انھیں ہمارے آنے کا پتہ نہ چلا۔ پھر اچانک مائی بیگاں بولی "بابے مجھے تو بہت چنتا لگ رہی، رنگی کو اب تک تو آجانا ہی چاہیئے تھا۔"

"آجائے گی۔" بابا یارنہ بولا۔ "کہاں گئی ہے؟ اپنے ملکوں کے ہاں گئی ہے نا؟ تو پھر اپنے ہی گھر گئی ہے جانتی نہیں ہو ملک کی بیٹی اس کی کتنی پکی سہیلی ہے؟ وہ دوپٹہ یاد ہے جو اس نے پچھلی گرمیوں میں رنگی کو دیا تھا؟ اتنا بڑھیا ریشم تھا کہ رنگی اسے تہ کرتی گئی اور آخر وہ اتنا ذرا سا رہ گیا کہ تمہارے چمٹے کے چھلے میں آگیا۔ سو روپے کا ہوگا یہ دوپٹہ۔ وہ اپنی اتنی پیاری سہیلی کے پاس گئی ہے تو فکر کی کون سی بات ہے۔ رات بھی رہ لے تو سمجھو فرشتوں کے گھر مہمان ہے۔"

خدا بخش نے آہستہ سے کہا "میرے خیال میں واپس چلنا چاہیئے۔ ان بے چاروں نے ہمیں دیکھا تو خاطر مدارات میں لگ جائیں گے۔"

بشکو بولا۔ "اور پھر چائے پکانا تو مائی کو آتا ہی نہیں جوشاندہ گھولتی ہے۔ رنگی ہوتی تو پی لیتے۔ ایسی چائے پکاتی ہے کہ نشہ ہو جاتا ہے۔"

خدا بخش بے اختیار ہنس پڑا تو مائی اور بابا نے چونک کر دیکھا اور ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ خدا بخش سے رُکنے، بیٹھنے اور چائے پینے کی یوں التجائیں کرنے لگے جیسے اگر خدا بخش نے ان کی بات مان لی تو ان کا گھروندا سونے چاندی کے محل میں بدل جائے گا اور ان کی بکریاں گھوڑیاں بن جائیں گی۔ خدا بخش نے انھیں سمجھایا کہ "سورج ڈوبنے کو ہے اور ہم دشمنوں والے

لوگ ہیں۔ شام کے بعد تو ہماری حویلی کی فصیل پر رائفلوں والوں کا پہرہ ہوتا ہے۔ تم تو جانتے ہو بابا یارو! میں شام سے پہلے گھر نہ پہنچا تو بڑے ملک قیامت مچا دیں گے، ہمارا باز لالی کا شکار کرنے آیا تھا، سوچا تمہیں دیکھتے چلیں، ٹھیک ہو نا؟ کوئی تکلیف تو نہیں۔ اچھا اب تم بیٹھو ہم چلے۔" رکاب میں پاؤں رکھے ہوئے خدا بخش بولا " رنگی کی فکر نہ کرو، اگر اسے دیر ہو گئی تو میری بہن اسے روک لے گی ــــ اور اب تو دیر ہو ہی چکی ہے۔"

بابا یارو بولا " آج صبح اسے ایک جھاڑی کی جڑیں اُگی ہوئی بہت سی چونگیں ملیں۔ اس کی سہیلی کو چونگیں بہت پسند ہیں اس لئے رٹ لگا دی کہ وہ ملکوں کی حویلی میں جائے گی۔ کپڑے دھوئے، سکھا کر پہنے اور پھر دوپہر کو چونگوں کی پوٹلی باندھ کر چلی گئی۔ ویسے تو وہ سیانی ہے پر سوچتا ہوں، اگر اسے راستے میں شام پڑ گئی تو ــــ تو ویرانہ ہے، ڈر لگتا ہے۔"

خدا بخش نے اسے تسلی دی " ہماری زمینوں پر ایک چڑیا تک کو خطرہ نہیں، تو رنگی کو کیا ڈر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ رنگی بابا یارو کی بیٹی ہے اور سب جانتے ہیں کہ بابا یارو کس کا آدمی ہے ــــ تم فکر نہ کرو، لو ہم چلے۔"

واپسی پر خدا بخش نے بازوں اور شکروں کے سلسلے میں بے حساب معلومات سے مجھے لاد ڈالا، میرے ذوق کی رعایت سے اس نے خوش حال خاں خٹک اور علامہ اقبال کے شاہینوں کا بھی ذکر کیا اور بعض پرانے سکوں، تلواروں کے قبضوں اور لبادوں کے بٹنوں پر بازوں کی تصویروں کے بارے میں بتا کر ثابت کیا کہ باز ایک شاہی پرندہ ہے، آخر میں اس نے یہ مسکت دلیل دی۔

"تم نے آج تک کبھی نہیں سنا ہوگا کہ کسی غریب آدمی نے باز پالا ہو۔"

"غریب آدمی تو لالیاں پالتے ہیں۔" میں نے کہا۔

خدا بخش میرے طنز کا کچھ جواب دینے ہی لگا تھا کہ اس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ کیکروں کے ذخیرے کے موڑ پر یکایک ایک نوجوان لڑکی ہمارے سامنے آ گئی تھی ـــــ وہ رنگی تھی۔ نہ جانے اس کا اصل نام کیا تھا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ رنگوں کا ایک پیکر ہے ـــــ سات رنگوں میں سے کوئی بھی رنگ ایسا نہ تھا جس سے اس کا وجود محروم ہو۔ اس کی آنکھوں، بالوں، چہرے اور ہونٹوں سے جو رنگ بچ رہے تھے وہ اس کی تہ بند، کرتے اور اوڑھنی میں جذب ہو گئے تھے۔ اس وقت سورج سپاٹ میدان کے پرلے کنارے پر ٹھوڑی ٹیکے، جیسے زمین کا آخری نظارہ کر رہا تھا۔ آسمان کے وسط میں بادل کے چند ٹکڑے ابھی سے گلابی ہو گئے تھے اور یہ گلاب کیکروں کے ذخیرے کے اس موڑ پر برس رہا تھا۔ اگر ایک بے رنگ چپلی میں سے نکلے ہوئے رنگی کے پاؤں کے ناخن ٹوٹے ہوئے نہ ہوتے تو اسے زمینی مخلوق قرار دینے کے لئے مجھے اپنے آپ سے خاصی طویل جنگ لڑنی پڑتی مجھے ایسا لگا کہ کٹر سے کٹر ملحد کو بھی رنگی کی ایک جھلک دکھا کر اسے ایک ایسے خدا کا قائل کیا جا سکتا ہے جو اس انتہا کا حسن کار ہے۔

یہ سب کچھ میں نے ایک لمحے میں سوچا جس میں بس اتنا ہوا کہ خدا بخش نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ رنگی ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی اور بشکو پیچھے سے بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔" دیکھا چھوٹے ملک؟ رنگی کتنی بے وقوف ہے۔ اری یہ بھی کوئی وقت ہے اتنے لمبے سفر کا؟ تجھے ملکانی نے روکا نہیں ـــــ؟"

"چل واپس ـــ" خدابخش نے بڑی اپنائیت سے حکم دیا۔" جو ہمارے دشمن ہیں وہ ہمارے مزارعوں کے بھی دشمن ہیں، اور ہمارے دشمن بے شمار ہیں۔ سورج ڈوب رہا ہے، چاند کی رات بھی نہیں ہے، اتنا لمبا ویران راستہ ہے اور چل کھڑی ہوئی ہے اس وقت چل واپس۔ میں جا کر اپنی بہن کی خبر لیتا ہوں کہ ایسا سلوک کیا جاتا ہے اپنی سہیلی سے۔ غریب سہی پر کیا انسان نہیں ہے رنگی؟ چل رنگی۔"

رنگی صرف دو لفظ بولی مگر آنکھوں نے بھی اس کے حسن میں جیسے ایک چھنا کا سا پیدا کر دیا۔" بابا بے چارہ۔"

"ہم سمجھا آئے ہیں بابا کو ـــ" خدابخش فوراً بولا۔" ہم نے کہہ دیا تھا کہ اگر رنگی ہمیں گاؤں کے پاس مل گئی تو ہم اسے واپس حویلی میں لے جائیں گے ـــ ایسے وقت ویرانوں میں نہیں نکلتے نادان۔ زمانہ بڑا خراب ہے چل۔"

رنگی ہمارے ساتھ چل پڑی۔ گاؤں میں پہنچ کر وہ بشکو کے ساتھ حویلی کی طرف چلی گئی اور ہم چوپال پر آ گئے۔ رات کے کھانے کے بعد بڑے ملک صاحب نے مجھ سے باز کے شکار کا پوچھا اور پھر کافی دیر تک بازوں، شکروں، کتوں اور گھوڑوں کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے خدابخش سے سرگوشی کی۔ کیا تمہارے ہاں شکروں اور کتوں ہی کی باتیں ہوتی ہیں؟ انسانوں کی نہیں ہوتیں۔؟"

"ارے چپکے رہو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔" ورنہ ابا پکڑ کر سکین بنا ڈالیں گے۔"

بڑے ملک اٹھ کر چلے گئے تو چھوٹے ملک کی گپوں کی باری آئی۔ وہ بیشتر وقت اپنے لارنس آف تھلیبیا کی تعریف کرتا رہا۔ اور ایک بار بشکو نے آ کر اس سے کوئی بات کی۔ اور وہ رکا سننے والوں کو داد و تحسین کا موقع ملا۔" بابا جمن

کہتا ہے کہ وہ ایک صدی کا ہو رہا ہے مگر آج تک اس نے اس بلا کا باز نہیں دیکھا' وہ کہتا ہے۔ چھوٹے ملک کا باز' بازوں کا ببر شیر ہے۔"

جب خدا بخش بھی حویلی میں چلا گیا۔ اور بشکو بھی میرا بستر جما کر اور تپائی پر پانی کا ایک جگ رکھ کر روانہ ہو گیا تو میں اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ آسمان اتنا صاف تھا کہ سیاہ ہو رہا تھا۔ تارے اتنے بے شمار تھے کہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے سر چکرا جاتا تھا۔ گاؤں پر مکمل سناٹا تھا۔ رات کا آغاز تھا اس لئے کتے تک سو گئے تھے' صرف جھینگر جاگ رہے تھے مگر جھینگروں کی آواز بھی تو سناٹے کا ایک حصہ ہی ہوتی ہے۔

تب رنگی کا پیکر میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس تناؤ اور اعتماد کے ساتھ جیسے وہ کہہ رہی ہے کہ کوئی نقص ڈھونڈ سکتے ہو تو ڈھونڈو ——! میں نے رنگی کے اس پیکر کو جسے میں نے شام کے ایک گلابی لمحے میں اپنے ذہن کے اندر محفوظ کر لیا تھا ہر زاویے سے جانچا اور تب میں نے کہا ——" ہاں رنگی تم میں ایک نقص تو موجود ہے اور وہ نقص یہ ہے کہ تم انسان ہو' اور انسان بڑی کمزور مخلوق ہے۔"

چوپال کے زیریں آنگن میں کیکر پر چڑیوں نے واویلا مچایا' میری آنکھ کھلی۔ قریب ہی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی جانے والی تھی اور کوئی اونچی آواز میں تکبیر پڑھ رہا تھا۔" قد قامت الصلوٰۃ' قد قامت الصلوٰۃ!" صبح کے ہلکے ہلکے اجالے میں مسجد کے مینار آسمان کے پس منظر میں متحرک معلوم ہو رہے تھے۔ پھر ایک مینار کے کلس پر ایک چیل اتری اور اسے اپنا توازن قائم رکھنے کے لئے دیر تک پروں کو بار بار پھیلانا پڑا۔ اس پر بھی جب ٹک کر نہ بیٹھ سکی تو اڑ گئی۔ منہ اندھیرے

یہ چیل کہاں سے آگئی ؟ میں نے سوچا۔ پھر میں نے خود کو جواب دیا " جہاں سے یہ چڑیاں آئی ہیں "

سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ جب بشکو میرے لئے ملائی سے اُٹا ہُوا دودھ کا ایک گلاس لایا۔ غسل خانے میں منہ پر پانی کا ایک چھینٹا مار کر میں باہر آیا تو خدا بخش چوبال کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا " چلو ذرا ذخیرے تک گھوم آئیں " اس نے کہا " وعدہ کہ آج میں تم سے فسانوں کی باتیں کروں گا "

" چلو ــــ " میں نے کہا، پھر میں سیڑھیوں پر رُک گیا ــ " سنو، کیا رنگی چلی گئی ؟ "

دفعتاً خدا بخش کو اس زور کی ہنسی چھوٹی کہ وہ ہنستا ہنستا میرے پلنگ پر جا گرا " آخر کار پتھر میں بھی جونک لگی تو ــــ " قہقہوں کے دوران وہ اپنی رانوں کو پیٹ کر کہتا رہا ــــ " برف کی تہہ بہت موٹی تھی مگر آخر ٹوٹی تو " پھر وہ مجھ سے لپٹ گیا " یار ، مجھے تم پر ایک دم بہت سا پیار آگیا ہے۔ میں سمجھا تھا تم اُلّو کے اُلّو ہی ہو " بڑی مشکل سے سانسوں پر قابو پانے کے بعد بولا " وہ رنگی یونہی کیسے جا سکتی ہے ؟ " لسّی پیئے گی، پراٹھا کھائے گی ، اس کی سہیلی اسے یوں آسانی سے تھوڑی جانے دے گی ۔ امّاں بیمار نہ ہوتی تو رنگی کو میری بہن اپنے کمرے میں سُلاتی۔ ابھی تو وہ اُٹھی بھی نہ ہو گی " پھر ذرا سا رُک کر بولا " جانے لگی تو تمہیں دکھائیں گے۔ بلکہ آج شام کی چائے وہیں بابا یارو کے یاں کیوں نہ پئیں ؟ "

" چھوٹے ملک " بشکو چلّایا۔ اور اتنی تیزی سے بھاگتا ہوا آیا کہ کیکر پر سے سب چڑیاں ایک ساتھ اُڑ گئیں ۔

" کیا ہے ؟ امّاں تو ٹھیک ہیں ؟ " خدا بخش نے گھبرا کر پوچھا ۔

"جی وہ تو ٹھیک ہیں ـــــ پر ـــــ" بشکو کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں، نتھنے پھول رہے تھے اور منہ مسلسل کھلا تھا۔

"پر کیا؟ ـــــ کچھ بکو۔" خدا بخش نے اسے ڈانٹا۔

اور بشکو نے جیسے کائنات کے سب سے بڑے حادثے کی اطلاع دی "کسی نے آپ کے لارنس کی گردن مروڑ کر پھینک دی ہے۔ لارنس مرا پڑا ہے۔"

خدا بخش کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ ایک خاصے وقفے کے بعد بولا "رنگی کو یہاں لے آؤ۔"

بشکو واپس بھاگا تو میں نے خدا بخش سے پوچھا "رنگی کو بلانے کا کیا مطلب ہے؟"

"ہے ایک مطلب۔" خدا بخش بولا۔

حادثہ شدید تھا اس لئے میں خاموش رہا فوراً بعد بشکو واپس آیا "رنگی تو منہ اندھیرے ہی چلی گئی چھوٹے ملک۔"

اور خدا بخش اپنی لہولہان آنکھیں مجھ پر گاڑ کر بولا "دیکھا میں نہ کہتا تھا ـــــ میرے باز کو اسی کمینی نے مارا ہے، رات وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ وہ مجھے مار ڈالے گی۔ میں نے کہا، لالیاں بازوں کو نہیں مار سکتیں نادان۔ اسی نے مارا ہے میرے لارنس کو، میں جانتا ہوں یہ قتل اسی بدذات، کنگلی، قلاش لڑکی نے کیا ہے۔ میں اس کی کھال اُدھیڑ دوں گا۔ میں اس کی ....."

"افکار کراچی"

جیلانی بانو

بہار کا آخری گلاب

"تم بھی تو شاید شاعری کرتی تھیں؟"

آج انھوں نے چولہے کے پاس روٹی کھاتے کھاتے یہ بات پوچھی۔ اور دال کی ہانڈی میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی — میں نے روٹی کے بغیر خالی ہاتھ جلتے توے پر ٹکا دیا — اور پھر جلے ہوئے ہاتھ کو پھونکنے کے بہانے اپنی نظریں جھکا لیں مگر دماغ اچانک نہ جانے کدھر دوڑنے لگا میرے سامنے ایک خیالی سطریں جیسے دھوئیں میں اُبھرنے لگیں۔

"... تم شاعری کرتی ہو — ایسی شاعری جو میری رُوح میں اُتر جاتی ہے۔ اور میں جھنجلا کے اپنی کہانیوں کی کاپی پھینک دیتا ہوں — اتنی من موہنی شاعری — اتنی سربلند شاعری! تم شاعری کرتی ہو تب میں تمھیں دُنیا کی ہر حسین عورت سے زیادہ خوبصورت دیکھتا ہوں — آئندہ مجھے اپنی صورت کی تفصیل نہ بتانا۔ صرف یہ کہو کہ آج تم نے کیا لکھا —؟"

"ہاں میں بھی شاعری کرتی تھی!"

کسی اندھے کو یہ جتانا کہ تو اندھا ہے، کیسی دل خراش بات ہے۔ پھر وہ مجھے بار بار شاعری کا طعنہ کیوں دیتے ہیں۔ میں تو خود اپنے اس جرم کا اقرار کر چکی ہوں۔ اور ہر بار سچ مچ توبہ کی ہے کہ آئندہ یہ قصور کبھی نہ ہوگا۔

اُنھوں نے میرا گھونگھٹ اُٹھا کے سب سے پہلے یہی کہا تھا۔ "سنا ہے تم شاعری کرتی ہو ۔۔۔! یہ بات ہمیں پسند نہیں ہے۔"

میرے دل پر ایک پتھر آپڑا تھا۔ مگر میں نے پھر اپنا لہولہان دل تھام کر کہا تھا۔ "اچھا میں شعر کہنا چھوڑ دوں گی۔"

پھر میں نے ان کا ہاتھ تھام کر سوچا ۔۔۔ اب میں وہی کروں گی جو تم چاہو گے۔ کیونکہ میں ماضی اور مستقبل میں بٹنے وقت لٹکنا نہیں چاہتی۔ میں اس شاخ سے ٹوٹ کر الگ ہونا چاہتی ہوں۔ جہاں سے میرے بندھن نکل چکے ہیں آج سے میں صرف تمہاری ہوں۔ تمہاری ۔۔۔ تم جو کبھی مجھ سے مسکرا کے بات نہیں کرو گے۔ ہمیشہ شک وشبہ کی زہریلی نگاہوں سے مجھے دیکھو گے۔ اور میں اپنا یہ خود دار اور ضدی سر تمہارے قدموں میں جھکائے رکھوں گی۔

پھر میں نے اپنی آنسوؤں بھری آنکھیں کھولیں تو میں سچ مچ اُن کے قدموں میں جھکی ہوئی تھی۔ اور وہ بڑے تعجب سے بڑی پریشانی سے میرے چہرے کو گھور رہے تھے۔ شاید وہ گھبرا گئے ہوں گے کہ میں پتہ نہیں کس قصور کے اعتراف میں سر جھکائے ہوئے ہوں! مرد ذات ۔۔۔ سوچ رہے ہوں گے نہ جانے کتنے گناہ آج پہلی بار بخشوانا چاہتی ہے۔

اس رات وہ شک کے دریا میں ڈوب ڈوب جاتے تھے۔ جیسے میں کوئی ایسا گھر ہوں جہاں چوروں نے ہر چیز کا صفایا کر ڈالا ہو۔ اب وہ ان لٹیروں کے قدموں کے نشان جگہ جگہ ڈھونڈ رہے تھے۔

صبح کو انھوں نے جب خالی بوتل کی طرح مجھے ایک طرف رکھنا چاہا تو میں پھر ان کے شانے سے لگ گئی۔

"میرے محبوب —— میں نے کہاں کہاں تمہارا انتظار نہ کیا۔ تمہارے لئے کیا کیا سوغات لئے بیٹھی تھی۔ آج میں نے اپنی جھولی کے سارے پھول تم پر نچھاور کر دیئے ہیں۔ اب تم میری خالی جھولی میں کوئی کلی، کوئی ستارا، کوئی پیار بھرا بول بھی نہ ڈالو گے؟ میں سوچ رہی تھی کہ کیا یہ بات ان سے کہہ دوں! مگر انھوں نے اپنی بات شروع کر دی۔ اماں کو خوش کرنے کا گر یہ ہے کہ دن رات ان کے ساتھ چولہے کے پاس بیٹھی رہا کرو۔ وہ تمھیں چند دن میں سب کام سکھا دیں گی۔"

"نا بھئی، میں اپنی دُلہن کو شاعری واعری نہ کرنے دوں گی۔ یہ موا ادبار جس گھر میں گھسا، لاکھ کا گھر خاک کیا ——" باہر میری ساس اپنی کسی پڑوسن کو آگاہ کر رہی تھیں۔

اپنی ساس کی اس بات پر میں جی جان سے قربان ہو گئی۔ ہائے کتنی اچھی بات کہی انھوں نے! سچ مچ یہ شاعری لاکھ کے گھر خاک کرتی ہے۔ جس وقت میں نے اپنی نظمیں ایک ایک کر کے جلائی تھیں تو کیا یہ لاکھوں کی دولت نہ تھی؟ کوئی میرا ایسا سخی ہو تو لے جو اپنی کمائی کو اپنے ہاتھوں آگ لگا دے۔

"ہمیں سبزیاں بہت پسند ہیں۔ چاول بالکل نہیں کھاتے ـــــ اب رہا اچار ـــــ تو بھئی اچھا اچار بنانا تو تمہیں سب سے پہلے سیکھنا پڑے گا۔"

وہ پتہ نہیں کیا کیا کہے جارہے تھے لیکن میرے سامنے تو اپنی نظموں کا دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا۔ مجھے ایک آدھ جلے خط کی سطریں یاد آرہی تھیں۔ "... تمہیں کشمیر پسند ہے نا؟ اس لئے ہم کشمیر کی سیر کررہے ہیں، اور تمہاری آنکھوں میں چھپی ہوئی جھیل ڈل میں ڈوبے جارہے ہیں اور تمہارے کانوں سے کشمیری گیت سن رہے ہیں۔ تمہارے شاداب چہرے جیسے باغوں میں گھوم رہے ہیں اور تمہارے دل کی طرح وسیع میدانوں میں ہٹر گشت کررہے ہیں ـــــ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آج تم ضرور کوئی دلربا سی نظم لکھ رہی ہوگی ـــــ"

میرا دل ـــــ! میں نے اپنے دل پر ایک نظم بھی لکھی تھی۔ یہ دیوانہ مجھے جانے کون کون سے کنویں جھنکوائے گا۔ یہ دل جو اُلٹی مانے نہ سیدھی ـــــ دن نکلے تو رات کے غم میں روئے۔ رات ہو تو دن کی جدائی میں تڑپے۔

اپنی اس نظم کو پڑھ کر میں خود ہی رو پڑی تھی۔ جانے کیسی ہٹن دیوانی تھی میں، کہ اپنی نظموں سے خود ہی پیار کرتی ـــــ ہنستی تھی اور روتی بھی۔ یہ نظمیں میری رازدار تھیں جو بات دل میں آتی وہ خود بخود کاغذ پر پھیل جاتی تھی۔ اب میں کیسے کیسے جتن کرتی۔ کاغذ کے ان پرزوں کو چھپانے کے تکیوں کے اندر، صندوقوں کی تہوں میں، کورس کی کتابوں میں۔ پھر بھی ممتہ چڑیل دیکھ ہی لیتی تھی۔ پڑھتی جاتی اور روتی جاتی۔ کیسی عجیب سی بات تھی کہ ہم دونوں بہنوں کا دکھ ایک تھا۔ معمولی سی صورت شکل، گھر پر چھائی ہوئی مفلسی اور نظر سے ٹھکرائے جانے کا دکھ۔ ابا کا

سیاہ رنگ اور اماں کا بے ڈھنگا نقشہ ہم دونوں بہنوں میں تقسیم ہوا تھا۔

بہت دنوں کی بات ہے جب میں شاید ساتویں یا آٹھویں کلاس میں فیل ہوا کرتی تھی، ایک دن اپنے پڑوس میں ہم ایک دلہن دیکھنے گئے۔ ہائے کیسی خوبصورت دلہن تھی۔ سچ مچ چاند کا ٹکڑا۔

"دیکھا بجیا، ایسی ہوتی ہیں دلہنیں۔ گوری گوری ——" نمّو نے رشک بھری نظروں سے دیکھا اور پھر اداس لہجے میں بولی "بجیا اب اپنا بیاہ تو نہیں ہوگا۔ کیونکہ سب دولہا گوری دلہن چاہتے ہیں۔"

"چُپ بے شرم۔" میں نے اسے دھکا دے کر کہا۔ مگر دل میں نمّو کی بات نے چاقو چبھو کر چھوڑ دیا۔ واقعی میں نے بھی کالی دلہن کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اور پھر میں نے بڑے دُکھ کے ساتھ سوچا تھا کہ میرا دولہا کبھی نہیں آئے گا۔ مجھے کوئی بچہ امی کہہ کر نہیں پکارے گا۔

بس اسی رات میری شاعری کا آغاز ہوا تھا۔ میں نے پہلی نظم لکھی تھی۔ ایک ایسی لڑکی پر جسے اللہ میاں ہر چیز دینا بھول گئے تھے۔ دولت، صورت، محبت، بے فکری —— کوئی نعمت اسے نہیں ملی تھی ——

اور پھر تو یہ شاعری کا روگ جیسے میری جان کو لگ گیا تھا۔

ادھر اماں ہمارے بڑھتے ہوئے قد کو دیکھ کر ابّا کو کھائے ڈالتی تھیں کہ ان لڑکیوں کے لئے کچھ تو جمع کرو۔ گھر کی اس بے سرو سامانی کو دیکھ کر میرا دل ڈوبا جاتا تھا کہ یہاں کوئی کیا لینے آئے گا؟

انہیں دنوں ایک بار میں زہرہ خالہ کے ساتھ ان کے کالج کے ایک

فنکشن میں گئی تھی ۔ وہاں کوئی ناچ ہوا نہ گانا۔ صرف ایک کالی، موٹی، بھدّی بیچاری کی صورت عورت آئی تھی اپنی کہانی سُنانے، مگر اللہ جانے اس میں کیا بات تھی کہ خلقت خدا کی اسے دیکھنے کو ٹوٹی پڑتی تھی ۔ کالج کی لڑکیاں اس کے آٹو گراف لینے کو مری جارہی تھیں ۔ اور وہ تھی کہ خوشی کے مارے کھلی جارہی تھی ۔ ایک ایک سے جھک جھک کر مِل رہی تھی ۔ جب میں نے ایک لڑکی سے پوچھا کہ یہ کون ہیں تو سب کو میری جہالت پر بڑا ترس آیا۔" اے ہے جاہل بے چاری چاندی کو نہیں پہچانتی ۔ اتنی مشہور افسانہ نگار کو ؟"

اس دن میں گھر لوٹی ہوں تو چاند سورج میرے ساتھ ساتھ آئے ۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ میں بھی چاندنی بنوں گی ۔ لوگوں کی حقارت بھری نظروں کو لات مار کے شہرت کے آسمان پر جا بیٹھوں گی ۔ دیکھوں تو پھر دنیا مجھ سے کیسے منہ پھیرے گی ؟

رات ہوئی تو میں نے ممّو کو چاندنی کا قصّہ سنایا ۔ اسے بھی کسی طرح یقین نہ آیا کہ ایسی بدصورت عورت کی اتنی عزّت ہو سکتی ہے ۔

دوسرے دن ہم دونوں برقعوں میں کتابیں دبائے اسکول کی طرف دوڑ رہے تھے ۔

پھر دوڑتے ہی چلے گئے — اتنے تیز کہ ممّو مجھے چھوڑ کر آگے نکل گئی ۔ اس نے ایم ۔ اے کیا اور ایک کالج میں لیکچرار ہو گئی ۔

لیکن میں شاعری کے کانٹوں میں اُلجھ کر صرف بی ۔ اے کر سکی — بقول امّاں کے شاعری نے مجھے برباد کر ڈالا تھا ۔ کورس کی کتابوں کو بھول کے

بھی نہ دیکھتی۔ سارے دن انگلش کی دوسری اَلا بلا کتابیں پڑھے جاتی۔ ان کتابوں
کو پڑھ پڑھ کر میرا دماغ اور بھی خراب ہو رہا تھا۔ رات بھر ٹہل ٹہل کر نظمیں لکھی
جاتیں اور دن بھر پلنگ پر اوندھی لیٹی ایڈیٹروں کے تعریفی خطوط پڑھے جاتی تھی۔
امّاں کہتی تھیں کہ میری صورت پر ٹھیکرے برسنے لگے ہیں۔ سر پیر کا ہوش نہیں رہا ہے۔
یہ شہرت جانے کب اور کہاں سے نکل کر میرے ساتھ چلنے لگی تھی۔ میں چونکی
تو ہر رسالے کا ایڈیٹر کہہ رہا تھا کہ آپ کی نظم نہیں آئے گی تو ہمارا رسالہ مکمّل
نہ ہوگا۔

ڈاکیہ آتا تھا تو اپنے جھولے کے آدھے خط ہماری کھڑکی میں پھینک جاتا تھا۔
پھر امّاں بڑی کاہلی سے اُٹھتیں اور سوپ میں خط بٹور کے میرے پلنگ پر انڈیل دیتیں۔
”لو بٹو، تمہاری ڈاک آگئی۔ بیکار خط سوپ میں ڈال دینا مجھے چولہا
جلانا ہے۔“

تب مجھے خیال آتا کہ نمّو کی کمائی سے ہنڈیا چولھے پر رکھی جاتی ہے اور
میری کمائی سے چولہا سلگتا ہے۔

ابّا ہمارے دو لقمے کا انتظار کرتے کرتے قبر میں جا سوتے تھے۔ امّاں بھی
ہمارے بوجھ سے تھکی جارہی تھیں۔ انھیں دل دھڑکنے کی بیماری ہوگئی تھی۔
اب گھر کی کیبون ہار نمّو تھی۔ اور نمّو کی آنکھوں میں کیسی چمک تھی! اس کی
چال میں کتنی خود اعتمادی تھی! اس کے سیاہ رنگ میں سُرخی جھلکتی اور وہ ہر
وقت ہنسے جاتی تھی۔ بعض اوقات میں جھنجلا کے سوچتی کہ کون سا قارون کا
خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے اس لڑکی کو؟

پھر امّاں نے ایک دن سچ مچ نمّو کے ہاتھ قارون کا خزانہ لگ جانے کی خوشخبری سنائی۔ اس کا پیغام آیا تھا۔ لڑکا نمّو کے کالج میں لیکچرار تھا اور نمّو کو بہت چاہتا تھا۔ یہ سُن کر میں کبھی بہت ہنسی —— میری پیاری بہن آخر تجھے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی نا! آج مجھے بھی قارون کا خزانہ مل گیا تھا—— مگر امّاں ہمیشہ کی بےرحم میرے قہقہوں کو روک کر کہنے لگیں "نمّو شادی سے انکار کر رہی ہے۔ کہتی ہے میں تم دونوں کو کس سہارے چھوڑ دوں!"

شام کو نمّو کالج سے آئی تو کہنے لگی "بجیا آپ کا پلنگ کتنا جھلنگا ہو گیا ہے ذرا اٹھیے میں نواڑ کس دوں"

میں نے غور کیا —— نمّو ٹھیک کہتی ہے۔ میں نے لیٹے لیٹے اس گھر کے پلنگ توڑ ڈالے ہیں —— پھر میں نے امّاں سے کہا۔

"اس لیکچرار کا پیغام نہیں رد کیا جائے گا۔ نمّو کوئی خدا ہے کہ ہمیں پالے گی! میں کسی اسکول میں ملازمت کر لوں گی۔ اس پر نمّو بہت روئی چلائی۔ وہ کہتی تھی "بجیا آپ نوکری نہیں کر سکتیں۔ آپ کی شاعری کا موڈ آف ہو جائے گا اور آپ شاعری نہ کریں گی تو مجھے بڑا دکھ ہوگا۔ لوگ، کیا کہیں گے ....؟"

لوگ —— لوگ —— ! ان لوگوں کے لئے ہم نے کیا کیا نہ کیا۔ پھر بھی ہم ان کے خوف سے مرے جاتے تھے۔ یہ لوگوں کا خوف ہی تو تھا جو اتنی شہرت نے مجھے پاگل نہ ہونے دیا۔ حالانکہ مجھے بہکانے والوں کی کمی نہ تھی۔ اپنے دیس میں تو ایک عورت کا نام ہی کتنے والے مردوں کو دیوانہ بنا دیتا ہے اور اگر اس نام کے آس پاس شہرت کی جھلک دمک ہو تو ہزاروں دیوانے مرمٹنے کو

تہیہ کر ڈالتے ہیں۔ اب مجھے اپنی ڈاک دیکھ کر چاندی یاد آتی تھیں۔ اب انھوں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا، اور تیسرے شوہر سے بھی طلاق لے کر سُنا ہے پنجاب کے کسی گاؤں میں گمنامی کی زندگی گزار رہی تھیں۔

میرے آگے بھی دنیا بہت بڑی تھی — اور بھی پھیل جاتی اگر کمل ہر طرف سے میرا راستہ نہ بند کر دیتا۔

اُن دنوں میں بڑی بیباکی اور اعتماد کے ساتھ دوسرے شہروں کے مشاعروں میں جاتی تھی، نشے میں چور ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے شاعروں کے ساتھ راتوں کو سڑکوں پہ چلتے وقت مجھے ذرا ڈر نہیں لگتا تھا۔ کیونکہ ہر جگہ دو جھکی جھکی نگاہیں میری نگرانی کرتی تھیں۔ ہر وقت ایک سایہ میرے پیچھے پیچھے چلتا تھا جیسے میں کسی کی پناہ میں ہوں۔ میرے راستے کے سارے خطرے کوئی آگے سے ہٹاتا جاتا تھا۔ میرے یوں آزاد گھومنے پر اماں کو سخت اعتراض تھا۔ تو بھی اظہارِ ناپسندیدگی کے طور پر دروازہ کھولنے کے بعد یہ جتانا نہ بھولتی کہ اب رات کے دو بجے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے میری نظموں پر بات کرنا چھوڑ دی۔ میری ڈاک سے اسے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ جن رسالوں میں میری نظمیں چھپتی تھیں انہیں اپنی میز سے اُٹھا کر میرے پلنگ پر ڈال دیتی تھی، البتہ اس کا خلوص کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

”بجیا، آج آپ کے لئے ایک ہینڈلوم ساڑھی لائی ہوں۔“

”بجیا کے لئے ایک گھڑی خریدنا ہے۔“

کھانے کے وقت بھی وہ خوب شور مچاتی۔

"بجیا آپ تو دماغی کام کرتی ہیں، اماں، آپ انہیں روز گوشت کا سوپ پلایئے میرے لئے دال کافی ہے۔"

"تب میں سوچتی، نمّو کیسی ڈپلومیٹ ہے، وہ کتنی کھری کھری سنا کر خود سے درخواست کر رہی ہے کہ میں اس گھر سے چلی جاؤں۔"

میں اپنی شاعری کے پنکھ لگائے آسمانوں پر اُڑتی رہی۔ اور نمّو نے کتنی مضبوطی کے ساتھ اپنے قدم دھرتی پر جما لئے تھے۔ ہم دونوں نے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کیا تھا۔ مگر میں کتنی غلط راہ پر چل پڑی۔ کانٹوں اور پتھروں نے میرے سارے ارادے لہولہان کر دیئے تھے۔

بعض وقت نمّو، ہنس کر کہتی "بجیا، آپ بغیر سوچے سمجھے جانے کیسے ہر کام شروع کر دیتی ہیں۔"

نمّو کی یہ بات میرے دل میں اُتر جاتی۔ واقعی میں جانے کیسے ہر بات سوچے سمجھے بغیر کر بیٹھتی ہوں۔ اب اسی بات کو لے لو۔

کسی طرح یاد نہیں آتا کہ کمل سے میں نے مِلنا جُلنا کب اور کیوں شروع کیا تھا۔ حالانکہ وہ ہندی کا بہت مشہور افسانہ نگار تھا اور ہندی والوں سے ہم اُردو کے شاعروں کی ویسے بھی کب بنتی ہے؟ پھر کمل تو یوں بھی بَلا کا جھگڑالو تھا، ویسے اور کوئی خوبی بھی نہ تھی اس میں ــــ پانچ بچّوں کا باپ، بیمار اور چڑچڑی بیوی کا تابع دار شوہر۔ سوکھا چمرخ ــــ کسی اخبار کے آفس میں ہزار ڈیڑھ ہزار کا ملازم تھا۔ مگر جانے یہ کیسے ہونے لگا کہ میں جس مشاعرے سے واپس آتی وہ میرے ساتھ ہوتا۔ سڑک پر چلتے چلتے مجھے جب بھی اس کا

خیال آتا وہ میرے سامنے کھڑا ہوتا۔ میں ڈائس پر جاتی تو وہ سب کے سامنے بیٹھا مجھے دیکھے جاتا تھا ــــ میں اُتر کے نیچے آتی تو وہ آگے بڑھتا۔

"اُفوہ، آج تو آپ نے ہمیں ہلا ڈالا۔ ذرا اپنے لکھنے کی رفتار دھیمی رکھیئے محترمہ ورنہ اس شہر کے سارے شاعر اپنا منہ کالا کر کے فرار ہو جائیں گے۔"

پھر اس نے مجھے ایک خط لکھا۔ بہت ہی مہذب سا ــــ یہی کہ میری نظموں نے اسے بہت متاثر کیا ہے۔

یہ خط مجھے بڑا بے ضرر سا لگا۔ اس کی کچھ طلب کرتی ہوئی، چاروں طرف راستہ گھیرتی ہوئی آنکھوں سے زیادہ پُرسکون بخش۔

ویسے بھی مجھے اطمینان رہتا تھا کہ کبھی کوئی ایسا آدمی میری طرف نہیں بڑھ سکے گا۔ جس نے مجھے قریب سے دیکھا ہو جو میری فضول سی صورت، بے ڈھنگے پن اور سطحی قسم کی باتوں سے واقف ہو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مقامی ادبی حلقوں میں کبھی میری ہمت افزائی نہیں ہوئی۔

کمل کے خط بڑھتے گئے۔ چند دن بعد تو یہ ناممکن سا ہو گیا کہ اس کا روز ایک خط نہ آ جائے۔ مجھے اپنی ہر نظم اسی طرح یاد ہے کہ کمل نے اس کے بارے میں کیا لکھا تھا۔ وہ جہاں ہوتا، جس موڈ میں ہوتا مجھے روز ایک خط لکھا کرتا تھا۔ چاہے آفس کے کسی کام سے کشمیر جائے، بچے کے ساتھ ہسپتال میں ہو، بیوی کے میکے میں ہو یا کسی ادبی محفل میں۔ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خط لکھے جاتا تھا۔ کوئی سُنتا تو کبھی یقین نہ کرتا کہ میں نے ان محبت اور سرشاری سے لبریز خطوں کا ایک بار بھی جواب نہیں دیا۔ ہم دونوں میں ایک خاموش سا سمجھوتہ ہو چکا

تھا کہ وہ جو جی میں آئے مجھے لکھے جائے گا۔ اور میں صرف سُنا کروں گی۔

مگر وہ کب تک محتاط بنا رہتا! اس نے پہلے اپنے خلوص کو عقیدت میں بدلا، پھر محبت میں، اور پھر پاگل پن میں، اور جتنے اس کے خط بڑھتے گئے اتنا ہی وہ خود بہت کم ملتا تھا — ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی کبھی کہیں نظر بھی آجاتا تو بڑا اجنبی بن کر بڑے تکلف کے ساتھ بات کرتا۔

ایک دن آخر کمل مل ہی گیا۔

ایک بہت بڑا آل انڈیا مشاعرہ تھا۔ ہندی والے بھی اس کے لئے مالی مدد کر رہے تھے۔ مشاعرہ شروع ہونے میں کچھ ہی دیر تھی۔ لوگ باہر گیلری میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کمل کو اکیلا دیکھ کر میں اس کے پاس چلی گئی۔ اسے ساتھ لئے جان بوجھ کر اس طرف بڑھنے لگی۔ جہاں کوئی نہیں تھا۔ جہاں درختوں کی آڑ نے اندھیرا سا کر دیا تھا۔

"مجھے بتاؤ کمل، میں نے آج تک تمہارے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ پھر تم مجھ سے اس کی شکایت کیوں نہیں کرتے؟"

"کیونکہ مجھے تمہارے جواب کا انتظار نہیں ہے۔" اس نے سنبھل سنبھل کر کہا۔

اس وقت ہمارے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو شبہ کبھی نہ ہوا ہوگا کہ اس وقت ہم دونوں کیسے بھنور میں گھرے ہچکولے کھا رہے ہیں۔

"تم — تم اتنے اونچے آدرش رکھتی ہو۔ اتنی مہان کلاکار ہو، اور پھر تم ابھی صرف بیس برس کی ہو۔ تمہارے لئے دنیا ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے۔ عزت، دولت شہرت ہر چیز تمہاری منتظر ہے۔ میں تمہاری راہ کیوں کھوٹی کروں۔ میں تو ایک غریب

آدمی ہوں۔ بیوی بچّوں والا۔ چالیس برس کا بوڑھا۔ اب میرے جیون کا صرف ایک ہی مصرف ہے کہ اپنی ہر ذمہ داری کو پورا کرتا رہوں مگر ___ مگر پھر بھی میں تمہارا ممنوں ہوں کہ تم نے میری کسی بات کا بُرا نہ مانا ___ مجھے اپنی تنہائی کے صحرا میں ایک گلاب مہکانے کی اجازت دے دی۔ میں نے تمہاری بدولت جان لیا کہ کسی کے لئے اپنی ذات کو بُھلا دینے کا سُکھ کیسا ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا۔ مگر مجھ سے تو اس نے ایک لمحہ میں ہر سُکھ چھین لیا تھا۔ اس خود غرض انسان نے جو میری بہار کی ساری ادھ کھِلی کلیاں اُجاڑ کر اپنے من میں گلاب مہکا رہا تھا۔

اگر اس وقت میرے قریب' ایک لگائی بجھائی کرنے والا چغل خور شاعر نہ کھڑا ہوتا تو شاید میں کمل کی باہوں میں جا گرتی۔ شاید زور زور سے رونے لگتی۔ نمّو کہتی تھی "بجیا، آپ ہر بات سوچے سمجھے بغیر کیسے کر ڈالتی ہیں؟" مگر اس روز میں کتنی مصلحت پسند تھی! اگر اس دن میں ان باتوں پر غور نہ کرتی تو شاید وہ دن کبھی نہ آتا جب مجھے کمل کے ہر خط کے ساتھ اپنی ایک نظم جلانا پڑی تھی۔ اور جب سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا تھا تب میں نے سوچا کہ اگر میرے بس میں ہو تا تو اس راکھ کا انتساب کمل کے نام کرتی۔

لیکن میں کچھ بھی نہ کر سکی تھی۔ بلکہ صدرِ مشاعرہ کو آتے دیکھ کر میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ انھیں سلام کیا تھا۔

"اب کیسے ہیں آپ!" یہ بات میں نے پاس سے گزرتے ہوئے کسی شاعر سے کہی تھی یا کمل سے! خون میرے کانوں میں سَنسنا رہا تھا۔ اور میں گرنے سے

پہلے کسی سہارے کو تھامنا چاہتی تھی مگر چلو۔ تم اب گھر واپس چلی جاؤ۔ اپنے گھر جاؤ۔" کمل مجھے تھام کر کہہ رہا تھا۔ "نہیں گھر میں بھی جگہ نہیں رہی۔ کہیں بھی جگہ نہیں ہے۔" پھر کمل مجھے رکشا میں بٹھا کر گھر لایا۔

جب مجھے ہوش آیا تو امّاں مجھے موسمی کا رس پلا رہی تھیں کمل سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ ننّو اس سے کہہ رہی تھی۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں کمل بھائی پیغام تو بجیا کے بھی کئی ہیں۔ مگر بجیا بیاہ کے لئے راضی ہی نہیں ہوتیں۔ اللہ جانے کس کا انتظار کر رہی ہیں۔"

"ایک لڑکا تو سیکریٹری ایٹ میں تین سو کا نوکر ہے۔" امّاں نے فوراً تفصیل شروع کر دی۔

"وہ خود بھی شاعر ہے۔ سُنا ہے مولانا بلبل بلگرامی کا شاگرد ہے، چائے، سگریٹ، شراب کچھ نہیں پیتا۔ پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے۔"

"مگر بجیا ——— بجیا کا موڈ ——— بجیا کی پسند ——— ننّو میری طرف دیکھ دیکھ کر گھورتی جا رہی تھی۔

"بس بس بہت ہو چکا تمہاری بجیا کا لاڈ ———" امّاں نے غصے میں ننّو کی بات کاٹی۔ "جانے کیوں اللہ میاں نے اس کا دماغ ہی اوندھا کر دیا ہے جب ہی تو ایسی حالت ہو گئی۔ اب میں کچھ نہ سوچوں گی۔ کمل صاحب، آپ اپنی دونوں بہنوں کا ساتھ ساتھ بیاہ کر دیجئے، بتایئے بھلا میں کسی مرد کے بغیر ان دونوں کے فرض سے کیسے سبکدوش ہوں گی؟"

"وہ تو ٹھیک ہے، میں سب کچھ کروں گا۔ آئندہ آپ کو میرا فرض یاد دلانے

کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اماں ؛ کمل جان بوجھ کر میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔
مگر ان کا جیون ساتھی کوئی آرٹسٹ ہونا چاہیئے۔ بڑے لطیف ذوق والا،
بڑے حوصلے والا۔ جو انھیں سنبھالے رہے — ان کی شاعری کی رفتار مدھم نہ
پڑ جائے، ورنہ عام لکھنے والیوں کی طرح کہیں گھرداری میں گھر کے.....
کہیں..... کہیں....."

"بس بس رہنے دیجئے —" میں نے جھنجلا کے کہا؛ "شراب سگریٹ چائے
کچھ نہیں پیتا — تین سو روپے کماتا ہے، اور کیا چاہیے مجھے۔ اماں تم نمّو کے
بیاہ کی تیاری کرو — اب تاریخ مقرر کر دو۔"

پھر میں نے سوچا کہ جانے میرے لئے اس پیغام کو ڈھونڈنے کے لئے
نمّو نے کتنی جدوجہد کی ہوگی۔ میں کب تک اس گھر میں بیٹھی رہوں گی۔ کوئی
ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ نمّو نے میرا ؛ نمّو کو کتنا ارمان ہے دلہن بننے کا۔ ہم دونوں
بہنوں کو بٹھایا گیا تو اچانک نمّو ہنس پڑی۔ اس نے اپنا گھونگھٹ ہٹا کے
مجھے دیکھا اور آہستہ سے بولی "بجیا آج مجھے بڑی ہنسی آرہی ہے۔"
"تو ہنسو نا —"

"مگر آپ — آپ — ؟" وہ میرے چہرے پر جانے کیا دیکھ کر گھبرا گئی۔
"ہاں مجھے بھی ہنسی آرہی ہے نمّو — آج تو جی چاہتا ہے۔ دنیا کی ہر
بات پر ہنسوں، ہر چیز کا مذاق اُڑاؤں۔"
"..... تم جب دلہن بنو گی، میں اس وقت بہت دُور بیٹھا تمھیں دیکھ رہا
ہوں گا۔ جانے تمہارا دولہا اس خوبصورتی کو دیکھنے کی تاب کہاں سے لائے گا!

آج تمہارے چہرے پر کتنے خوبصورت خوابوں کا اُجالا ہوگا؟

"اس سمے جب تم ادب، شاعری اور میری بکواس سے پرے ـــ کسی پر اپنا تن من نچھاور کر رہی ہوگی تو تمہیں کہاں یاد آئے گا کہ کوئی تمہیں اپنی روح کی گہرائیوں کے ساتھ مبارک باد دے رہا ہے۔

"آج تمہارے سُکھ کا گلاب تمہارے دولہا کے چہرے پر کھلنے والا ہے۔"

"اب میں تمہیں کبھی خط نہ لکھوں گا۔ بس ہر نئی نظم میں
تمہاری کامرانیوں کی خبریں سن لیا کروں گا۔"

جلتی ہوئی ردّی کو جلدی سے راکھ میں چھپا کر میں سوچتی ہوں کہ میں نے اپنی کامرانیوں کی کوئی خبر کہیں نہ بھیجی۔

یہ کیسی اچھی بات ہے کہ میری بہار کا آخری گلاب ابھی تک نہیں مُرجھایا۔ کہیں میرا ایک خوب صورت سا، ہنستے گلاب جیسا خیال زندہ ہے کمسل میں چھپا ہوا۔

"بانو" دہلی

انتظار حسین

وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے

پھر یہی ہوا کہ یاجوج ماجوج رات بھر دیوار کو چاٹا کئے۔ یہاں تک کہ دیوار تحلیل ہوتے ہوتے انڈے کے چھلکے کی مانند ہو گئی اور پھر یاجوج ماجوج تھک گئے اور انھیں نیند آنے لگی اور وہ یہ کہہ کر سو گئے کہ باقی دیوار صبح کو چاٹیں گے۔ مگر جب وہ صبح کو اُٹھے تو دیوار پھر اُونچی اور موٹی ہو گئی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ پھر اپنی کوتاہی پر پچھتائے۔ اور انھوں نے پھر یہ عزم باندھا کہ آج تو ہم دیوار چاٹ کر ہی دم لیں گے۔ سو جب شام ہوئی تو پھر وہ اپنی لمبی لمبی زبانیں نکال کر دیوار کو چاٹنے لگے۔ چاٹتے رہے چاٹتے رہے۔ یہاں تک کہ رات کا گجرا پھیلنے لگا اور دیوار انڈے کے چھلکے کی مثال رہ گئی مگر یاجوج ماجوج اب تھک کر چور ہو گئے تھے اور زبان اینٹھنے لگی تھی اور پپوٹے نیند سے بوجھل ہو رہے تھے۔ انھوں نے آپس میں کہا کہ سدِّ سکندری کو ہم نے واقعی چاٹ لیا ہے۔ ذرا دم بھر کے لئے سو لیں۔ پھر تازہ دم ہو جائیں گے اور دو زبانیں پھیر کر اس کا سُتھراؤ کر دیں گے۔ سو یاجوج نے ایک کان نیچے بچھایا اور دوسرا کان اُوڑھ کر سو گیا۔ ماجوج نے

بھی اپنا ایک کان نیچے بچھایا اور دوسرا کان اوڑھ کر سو گیا۔

یاجوج ماجوج صبح کو سو کر اٹھے تو انھوں نے دیکھا کہ دیوار تو پھر پہاڑ کی مثال ان کے سروں پر کھڑی ہے۔ یہ دیکھ کر وہ ایسے ڈھے گئے جیسے برسات میں کچی دیوار ڈھے جاتی ہے۔ ماجوج نے بہت دکھ کے ساتھ یاجوج سے کہا کہ "اے یاجوج! کیا ہمارے عمل کا کوئی حاصل نہیں ہے؟"

یاجوج ڈھئی آواز میں بولا کہ "شاید ہماری تقدیر ہی یہ ہے کہ روز رات کو دیوار چاٹا کریں اور روز صبح کو دیوار کوہِ گراں کی طرح ہمارے سروں پر کھڑی ہو جایا کرے۔"

اس پر یاجوج مایوس ہو کر بولا کہ "اگر یہی بات ہے تو دیوار کو ہم چاٹا کیے تو کیا اور نہ چاٹا کیا تو کیا۔ پس قبل اس کے کہ وقت ہمیں چاٹ لے ہمیں چاہیے کہ دیوار کی طرف پشت کریں اور تھوڑا زندگی کو چکھیں۔"

تب قوم یاجوج ماجوج کا وہ بوڑھا جو اب اپنی عمر کے ہزارویں سال میں تھا۔ پہاڑ کی کھوہ سے نکل کر باہر آیا اور بولا کہ "اے یاجوج ماجوج ہر شے کے ایک معنی ہیں اور ہر عمل کا ایک حاصل ہے۔ کوئی دیوار ایسی نہیں کہ سدا کھڑی رہے۔ ڈھینا دیوار کا اور چاٹنا زبان کا مقدر ہے۔ اور میں نے تمہارے باپ یافث سے اور تمہارے باپ یافث نے اپنے باپ نوحؑ سے یہ سنا ہے کہ اولاد ان کی سدِ سکندری کو ایسے چاٹ لے گی جیسے دن رات کو چاٹ لیتا ہے۔ پھر وہ آزاد ہو کر کھلے میدانوں اور شاداب سبزہ زاروں میں پھیل جائے گی اور وہ زبانیں جو پتھر چاٹتی تھیں۔ شیریں چشموں تک پہنچیں گی۔ پہلے قوم یاجوج ماجوج کا اگلا گروہ طبرستان کے ٹھنڈے میٹھے چشمے تک پہنچے گا اور وہ اتنا پیاسا ہو گا کہ چشمے کا سارا پانی

پی جائے گا۔ جب پچھلا گروہ وہاں پہنچے گا تو خشک چشمے کو دیکھ کر کہے گا کہ شاید یہاں آگے کبھی پانی تھا۔

بوڑھا تو واپس پہاڑ کی کھوہ میں چلا گیا مگر اس کی بات ماجوج کے بیٹے نے سن لی تھی اور اس نے اپنے پہاڑ میں جا کر آلِ ماجوج کو جمع کیا اور سوال ڈالا کہ اے آلِ ماجوج، کیا تم سدِ سکندری کے ٹوٹ جانے پر بھی پیچھے رہ جانے والوں میں رہو گے؟

آلِ ماجوج نے پوچھا کہ "تو نے کیا دیکھا جو ایسا سوال زبان پر لایا؟"

ماجوج کا بیٹا بولا کہ "کیا تم نہیں دیکھتے کہ آلِ یاجوج نے سرسبز پہاڑ پر قبضہ کر رکھا ہے اور ہمارے حصے میں بنجر پہاڑ آیا ہے۔ وہ پیٹ بھر کر پھل کھاتے ہیں جبکہ ہم پتھر چاٹ کر پیٹ پالتے ہیں۔ اب جبکہ سدِ سکندری ٹوٹنے کو ہے تو میں نے قوم کے بزرگ سے یہ سنا ہے کہ جو گروہ اس قیدِ سکندری سے پہلے نکلے گا۔ وہ طبرستان کے شیریں چشمے پر پہلے پہنچے گا اور سیراب ہو گا۔ جو گروہ بعد میں نکلے گا وہ چشمے پر بعد میں پہنچے گا اور اسے خشک پائے گا تو اے ماجوج کے محروم بیٹو! کیا تم اس قید سے رہائی کے بعد بھی پیچھے رہ جانے والوں میں رہو گے؟"

یہ کلام سن کر آلِ ماجوج نے تاؤ کھایا اور چیخ کر کہا کہ اپنے باپ ماجوج کی اس لمبی زبان کے دم سے جو سدِ سکندری کو چاٹ کر پوست بیضا بنا دیتی ہے۔ ہم پیچھے رہ جانے والوں میں نہیں رہیں گے اور تشنہ لبوں میں شمار نہیں ہوں گے۔"

ادھر آلِ یاجوج کو بھی یہ خبر مل چکی تھی کہ سدِ سکندری اب ڈھینے والی ہے۔ اور آلِ یاجوج سب سے پہلے نکل کر طبرستان کے چشمے سے سیراب ہونے کے

لئے کمر باندھ رہی ہے۔ آلِ یاجوج نے یہ سُن کر غصہ کیا کہ ماجوج کی آل نے ابھی سے چشموں پر قبضہ کرنے اور سبزہ زاروں پر چھا جانے کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے ہیں۔ اُنھوں نے غصہ کیا اور اعلان کیا کہ ہم ان میں سے نہیں ہوں گے جو پیچھے رہ جاتے ہیں اور سوکھے چشمے سے کنکر چنتے ہیں سو ابھی رات باقی تھی، وہ اپنے پہاڑ سے نکلے اور دیوار کی سمت چلے۔ مگر اِدھر ماجوج کے بیٹے پوتے بھی اپنے پہاڑ سے نکل پڑے تھے اور آلِ یاجوج سے پہلے دیوار تک پہنچ جانا چاہتے تھے۔

رات کے اندھیرے میں یاجوج کے بیٹوں نے ماجوج کے بیٹوں کا راستہ کاٹا۔ اور ماجوج کے بیٹوں نے لپک کر یاجوج کے بیٹوں کو جا لیا تب یاجوج کے بیٹے ماجوج کے بیٹوں سے اُلجھے اور ماجوج کے بیٹوں نے یاجوج کے بیٹوں کو للکارا۔ وہ آپس میں لڑتے مرتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور اُنھوں نے دیکھا کہ یاجوج ماجوج سوئے پڑے ہیں اور سدِ سکندری پھر اُونچی اور موٹی ہو گئی ہے۔ یہ دیکھ کر انھوں نے اپنی راہ لی اور واپس اپنے پہاڑوں میں چلے گئے۔

جب پہاڑ سا دن کٹ گیا اور رات نے ڈیرہ کیا، تب یاجوج ماجوج نے پھر اپنی زبانیں تیز کیں اور دیوار چاٹنی شروع کر دی اور ابھی رات باقی تھی کہ دیوار کے ڈھے جانے کی امید لے کر اور شیریں چشمے سے سیرابی کا تصور باندھ کر آلِ یاجوج اپنے پہاڑ سے نکلی اور آلِ ماجوج اپنے پہاڑ سے برآمد ہوئی۔ اُنھوں نے پھر ایک دوسرے کا رستہ کاٹا اور پھر آپس میں دست و گریباں ہوئے۔

یاجوج ماجوج کے بیٹے رات بھر آپس میں لڑا مرا کئے اور خونم خون ہو گئے۔

جب تڑکا ہوا تو انھوں نے یہ دیکھا کہ یاجوج ماجوج سو گئے ہیں اور دیوار پھر پہاڑ کی طرح بلند اور سنگین ہو گئی ہے۔ یہ دیکھ کر وہ بیزار ہوئے انھوں نے اپنا اپنا رستہ پکڑا اور واپس اپنے اپنے پہاڑوں کو ہو لیے۔

دن پھر کسی نہ کسی طور کٹ گیا اور رات پھر آ گئی۔ مگر آج آلِ یاجوج یہ تہیہ کر کے نکلی تھی کہ روز روز کا ٹرخنشہ ختم کیا اور رستے کا کانٹا نکال پھینکو۔ تو انھوں نے بے خبری میں آلِ ماجوج کو جا لیا اور ان کے پہاڑ سے نکلنے سے پہلے ان پر حملہ بول دیا۔ انھوں نے ان کے گھروں کو لوٹا، جوانوں کو قتل کیا اور عورتوں کو بے عزت کیا۔ یہ قیامت دیکھ کر ماجوج کی بیٹی اپنے خیمے سے نکلی اور یاجوج کے بیٹوں سے مخاطب ہوئی کہ "اے مرے دادا کے بیٹے کے بیٹو، کیا تم ہم میں سے نہیں ہو اور ہم تم میں سے نہیں ہیں، کہ تم ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو؟"

یاجوج کے بیٹے نے یہ سُن کر تاؤ کھایا اور کہا کہ "اے ماجوج کی بیٹی ہم تم میں سے کیونکر ہو سکتے ہیں اور تم ہم میں سے کیسے ہو جبکہ ہم یاجوج کی اولاد ہیں اور اپنے پہاڑ میں رہتے ہیں۔ اور تم ماجوج کی اولاد ہو اور اپنے پہاڑ میں آباد ہو۔"

ماجوج کی بیٹی یہ سُن کر چلّائی اور بولی کہ "اے مرے دادا کے بیٹے کے بیٹے، کیا تو اس سے انکار کرے گا کہ یاجوج ماجوج ایک باپ سے پیدا ہوئے اور ایک ماں کی گود میں پلے۔"

یاجوج کا بیٹا قطعی انداز میں بولا کہ "اے ماجوج کی بیٹی، بس اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ ہم یاجوج کے بیٹے قوم یاجوج ہیں اور اپنے پہاڑ سے پہچانے جاتے ہیں۔"

ماجوج کے بیٹوں نے یہ سُن کر بہن کو پیچھے دھکیلا اور اونچی آواز میں کہا کہ

"ہم ماجوج کے بیٹے قومِ ماجوج ہیں اور اپنے پہاڑ سے پہچانے جاتے ہیں۔"
اور پھر آلِ یاجوج نے آلِ ماجوج پہ اور آلِ ماجوج نے آلِ یاجوج پہ حملہ بولا۔
یاجوج کی اولاد نے ماجوج کی اولاد کے خون میں اور ماجوج کی اولاد نے یاجوج کی اولاد کے خون میں ہاتھ رنگے۔"

صبح ہوئے پر ماجوج کی بیٹیوں نے جسموں پر ٹاٹ باندھے، بال پریشان کئے اور برہنہ پا نالہ کناں ماجوج کے پاس پہنچیں اور چلائیں کہ "اے ہمارے باپ، تو گریہ کر کہ تیرے بھائی کے بیٹوں کے ہاتھوں ہمارے گھر برباد ہوئے، ہمارے سہاگ اُجڑے اور ہمارے ماں جایوں کے خون سے ہماری زمین لالہ زار ہو گئی۔"
ماجوج نے اپنی آل کا یہ حال دیکھا اور یاجوج کے پاس جا کر بولا کہ "اے یاجوج تیرے بیٹوں نے میرے بیٹوں کو تہہ تیغ کیا اور میری بیٹیوں کو رسوا کیا۔"
یاجوج یہ سن کر لال پیلا ہوا اور بولا کہ "اے ماجوج، تیرے فرزند ان میں سے ہیں جو شیریں چشموں سے سیراب ہونا چاہتے ہیں اور دوسروں کو پیاسا رکھنے کے در پے ہیں۔"
یاجوج ماجوج میں تکرار ہونے لگی اور بات بڑھتی ہی چلی گئی۔ یاجوج نے طیش کھایا اور کہا کہ "جو زبان سدِ سکندری کو چاٹ کر انڈے کے چھلکے کی مثال بنا دیتی ہے وہ ماجوج کو بھی چاٹ سکتی ہے۔" ماجوج جھنجھلایا اور بولا کہ "ماجوج کی زبان چاٹنے میں یاجوج کی زبان سے زیادہ تیز ہے۔"
بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ شام ہوئے پر یاجوج ماجوج نے اپنی اپنی زبانیں نکالیں اور سدِ سکندری کو چاٹنے کی بجائے عالمِ غیظ میں ایک دوسرے کو

چاٹنے لگے۔ وہ رات بھر ایک دوسرے کو چاٹتے رہے حتیٰ کہ یاجوج ماجوج کے چاٹنے سے اور ماجوج یاجوج کے چاٹنے سے انڈے کے چھلکے کی مثال رہ گیا۔ یاجوج نے دل میں سوچا کہ اب ماجوج میں رہ ہی کیا گیا ہے۔ اب سوئے جاتا ہوں۔ صبح اُٹھ کر ایک زبان ماروں گا اور ماجوج کو چاٹ جاؤں گا۔ سو اس نے اپنا ایک کان بچھایا اور دوسرا کان اوڑھ سو گیا ماجوج نے بھی دل میں یہی کہا کہ یاجوج کے نام کا تو اب ایک چھلکا رہ گیا ہے۔ تھوڑا آرام کر لوں۔ صبح اُٹھ کر ایک زبان پھیروں گا اور اسے صفا چٹ کر جاؤں گا سو وہ بھی ایک کان نیچے بچھا دوسرا کان اوپر سے لے پڑ رہا۔

جب یاجوج ماجوج سو کر اُٹھے تو یاجوج نے ماجوج کو اور ماجوج نے یاجوج کو تازہ دم پایا اور حیران ہوئے۔ پھر یاجوج کے پاس آلِ یاجوج اور ماجوج کے پاس آلِ ماجوج نالہ و شیون کرتی پہنچی کہ رات بھر آلِ یاجوج نے آلِ ماجوج کا آلِ ماجوج نے آلِ یاجوج کا خون بہایا تھا۔ تب پھر یاجوج نے ماجوج پر دانت کچکچائے اور کہا کہ میں تجھے اور تیری آل کو یوں چاٹوں گا جیسے سدِ سکندری کو چاٹتا ہوں۔ اور ماجوج نے یاجوج پر زبان تیز کی اور چلایا کہ میں سدِ سکندری کو بعد میں اور تیری آل کو پہلے چاٹوں گا۔ اور شام پڑے سے وہ پھر ایک دوسرے کو چاٹنے لگے اور چاٹتے ہی چلے گئے حتیٰ کہ دونوں انڈے کے چھلکے کی مثال رہ گئے۔ مگر اب ان کی زبانیں اینٹھ چکی تھیں اور آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ یاجوج نے طے کیا کہ ماجوج بوند برابر تو باقی رہ گیا ہے۔ اتنا صبح کو چاٹ لوں گا۔ سو وہ اپنا ایک کان نیچے ڈال دوسرا کان اوپر تان سو گیا۔

ماجوج نے بھی یہی سوچا کہ باقی ماندہ یاجوج کو صبح چاٹ کر ختم کروں گا۔ وہ بھی ایک کان کو گدا بنا کر اور دوسرے کان کو لحاف کی طرح اوڑھ کر سو گیا۔

صبح جب یاجوج کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے کان کے اندر سے جھانک کر ماجوج کو دیکھا اور اسے تازہ دم دیکھ کر متحیر ہوا۔ پوچھا کہ "اے ماجوج کیا میں نے تجھے چاٹ نہیں لیا تھا؟" ماجوج خود اسے تندرست دیکھ کر متعجب تھا۔ پوچھنے لگا۔ "مگر اے یاجوج میں نے تجھے کیا چاٹ نہیں لیا تھا؟" اور پھر دونوں کی آل، خونم خون اپنے اپنے بزرگ کے پاس پہنچی اور فریادی ہوئی۔ یاجوج ماجوج اپنی اپنی اولاد کی فریاد سُن کر پھر ایک دوسرے پر غرّاتے پھر ان کی لمبی لمبی زبانیں ان کے منہ سے یوں باہر نکلیں جیسے بانبی سے سانپ نکلتے ہیں۔

یاجوج ماجوج ایک دوسرے کی طرف زبان لہراتے تھے کہ بوڑھا دانشمند پھر اپنی کھوہ سے باہر نکل آیا۔ یاجوج ماجوج کو دیکھ کر اس نے افسوس کیا اور کہا کہ "اے یاجوج ماجوج، تمہارا بُرا ہو کہ تم سدِّ سکندری کو تو نہ چاٹ سکے مگر ایک دوسرے کو سچ مچ چاٹے لے رہے ہو۔"

تب یاجوج نے اپنی آل کا حال سُنایا اور ماجوج نے اپنی آل کا ماتم کیا۔ دونوں نے بوڑھے سے انصاف چاہا۔ بوڑھا دانشمند دونوں کی بات سُن کر بولا کہ "میں ہابیل اور قابیل کے درمیان تو فیصلہ کر سکتا تھا کہ کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے کہ ان میں سے ایک قاتل تھا اور دوسرا مقتول تھا مگر یاجوج کے باب میں کیسے فیصلہ کروں کہ میں یاجوج کی زبان کو ماجوج کے خون سے اور ماجوج کی زبان کو یاجوج کے خون سے لال دیکھتا ہوں۔"

یاجوج نے کہا کہ "اے بزرگ، کیا تو چاہتا ہے کہ آلِ ماجوج طبرستان کے چشمے سے سیراب ہو، اور میری آل سوکھے چشمے کے کنکر پتھر چاٹے؟"

ماجوج بولا کہ "اے بزرگ، کیا تو یہ گوارا کرے گا کہ آلِ یاجوج طبرستان کا پورا چشمہ ڈکوس جائے اور میری آل تشنہ لب پھرے؟"

بوڑھا بولا کہ "طبرستان کا چشمہ کس نے دیکھا ہے۔ وہ تو سدِ سکندری کے اُس طرف ہے۔ اس چشمہ سے تو وہ سیراب ہوگا جو پہلے پتھر چاٹے گا تاکہ وہ جو لہو چاٹے گا۔"

تب یاجوج نے اعلان کیا کہ میں پہلے ماجوج کو چاٹ لوں، پھر سکندر کے کھڑے کئے ہوئے پتھر چاٹوں گا۔ ماجوج گرجا کہ میں یاجوج کو اس کے آخری بچے تک چاٹ لوں گا۔ پھر میں سدِ سکندری کو چاٹوں گا اور اپنی آل کو لے کر طبرستان کے چشمے تک پہنچوں گا۔"

بوڑھے نے انھیں افسوس کے ساتھ دیکھا اور کہا کہ "چاٹنا یاجوج ماجوج کی زبانوں کا مقدر ہے۔ وہ سدِ سکندری کو نہیں چاٹیں گے تو اپنا لہو چاٹیں گے۔"

اور یاجوج ماجوج اپنی لال لہو زبانوں کے ساتھ پھر آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔

بوڑھے دانش مند نے انھیں گتھم گتھا دیکھ کر بصد افسوس کہا کہ "یافث کی اولاد دومنہا سانپ بن گئی کہ خود ہی کو ڈس رہی ہے۔" اور یہ کہہ کر وہ واپس اپنی کھوہ میں چلا گیا۔

یاجوج ماجوج اس اندھیاری رات میں ایک دوسرے کو جھنجھوڑتے رہے، چاٹتے رہے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو چاٹا، اتنا چاٹا کہ دیو ہیکل یاجوج ماجوج گھٹ کر انڈے کے چھلکے سے بھی کم رہ گئے۔

"فنون" لاہور

الطاف فاطمہ

نیون سائنز

اور ہم نے سرما کی سرد اور اندھیری راتوں میں لارنس جانا چھوڑ دیا ہے۔ اور اس بات کا مجھے قلق بھی بہت ہے۔

پوچھو! وہ کیوں؟

یوں کہ لارنس کی ٹھٹھری ہوئی کالی راتوں میں رات کی رانی کی آوارہ مہک اور لانبے لانبے گھنے اور عمر رسیدہ درختوں کے مہیب سائے بہت یاد آتے ہیں۔

گھپ اندھیرے میں اونچے درختوں اور بے چراغ لیمپ پوسٹوں سے گھری پختہ سیاہ روش اور دور درختوں کے کنج میں سے ٹم ٹم نظر آتی تربت مراد شاہ کے مزار کے دیوں کی روشنی بہت ہیبت زدہ کر دیا کرتی تھی۔ نامعلوم سی دہشت کی ایک خنک اور جما دینے والی لہر سارے وجود میں دوڑ جایا کرتی تھی۔

اور خوف و دہشت انسان کے لئے کتنی اہم اور ضروری شے ہے۔

کہ انسان خوف زدہ نہ ہو تو بہت پھیلتا ہے اور آدمی سے آدمی دور بھاگتا ہے

اور جب وہ دہشت زدہ ہوتا ہے تو وہ سکڑتا ہے — اور ایک دوسرے کے
بہت قریب ہونا چاہتا ہے۔

ہاں تو ہم اپنی سانسوں اور آہٹوں سے ڈرتے لرزتے جسم تھانے والی سڑک
پر چلتے چلتے پنجاب کلب کی جانب آنکلتے۔

کلب ہال کے شیشوں سے چھن چھن کر آتی روشنی اور سایوں کے سوا ایک آواز
بھی نہ سنائی دیتی اور ہمیں خوب معلوم ہوتا تھا کہ اندر تاشوں کی بازی اور وہسکی کے
پیگ پر بزنس پیکٹ طے ہو رہے ہونگے، لین دین کے معاملے اور خفیہ معاہدے
زور شور سے کئے جا رہے ہوں گے۔

وہسکی کے ایک پیگ کے گردش میں آنے اور کسی عورت کے ادھر سے اُٹھ
کر اُدھر بیٹھ جانے پر لاکھوں اور ہزاروں کے وارے نیارے ہو رہے ہوں گے۔

اور ہمیں بھی خوب معلوم ہوتا تھا کہ اب لوگ شراب پی کر بدمست نہیں ہوتے،
بے خود ہونے کے بجائے اپنی بزنس کے سارے معاملے اسی عالم میں کرتے ہیں اور
اگر لوگ شراب پی کر بدمست ہو جایا کرتے تو انھیں ایل ایس ڈی ایجاد نہ کرنا پڑتی۔

پھر بھی اس سڑک پر آ کر خون جمنے لگتا اور ہر لحظہ یوں معلوم دیتا جیسے کوئی ابھی
جھومتا جھامتا آپڑے گا — قدم تیز اُٹھتے، سانس تیز تیز چلتی اور ہم سردی میں ٹھٹھرتی
ہوئی گاڑیوں میں بے آرامی سے سوئے ہوئے ڈرائیوروں کو دیکھتے، اور ان سے بھی
ڈرتے جلد جلد قدم اٹھاتے اس گیٹ پر آنکلتے جس کے عین مقابل آرٹ کونسل کی
عمارت ہے۔ اور جس کے ساتھ برگد کا گھنا اور اتنا زبردست درخت ہے کہ اس کی جڑوں
نے پختہ اور شفاف سڑک کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ کو جا بجا سے شق کر دیا ہے اور

وہ ایک بہت بڑے جڑیلے کارٹیکل کی صورت میں اُبھر آئی ہے اور اس درخت تلے آتے ہی ہمارے قدم ٹھٹک جایا کرتے تھے۔ برگد کا درخت ترچھی ہوئی فٹ پاتھ برگد کے تنے میں اُبھرے ہوئے پھوڑے اور موکھلے اس کی گھنی مہیب ڈالوں کے اندھیارے سے لٹکتی جٹائیں یعنی برگد کی داڑھیاں، خاموشی، اور مہیب اندھیرا۔

وقت تھم جاتا، زمانہ کی پائلیں بج اُٹھتیں۔ برسوں پرانی زندگی چھم چھم رقصاں نظر آتی۔۔۔ گئے وقتوں کے قافلے قطار در قطار گزرتے اور اس بوڑھے برگد کے ریشے ریشے میں خلیئے خلیئے میں کتنے عہد خوابیدہ ہوتے، اور کتنے نئے زمانے انگڑائی لیتے محسوس ہوتے، تاریخ سر برہنہ کھڑی ہوتی۔

اور یہ ساری طلسمات اندھیرے اور تاریکی کی تھی۔

ہر شب یہی کچھ ہوتا!

داستانی انداز میں بولتے بولتے وہ اچانک یوں خاموش ہوگئی۔ جیسے کسی پہاڑی چشمے کے سوتے قطرہ قطرہ ٹپکتے ٹپکتے اچانک خشک ہو جائیں۔

تب اس نے اندھیرے کمرے میں سڑک کے لیمپ پوسٹ کی شیشوں میں سے چھن کر آتی روشنی کی مدھم لکیروں سے قائم ہونے والی روشنی میں ٹٹول کر تھری کاسل کی سبز ڈبی نکالی، ٹٹول کر سگریٹ نکال کر روشن کیا۔ اور ڈبیہ آگے سرکا دی۔

"پینا ہیں؟"

پھر وہ اندھیرے میں ہنسی۔

میں نے سگریٹ کا کوئی برانڈ مقرر نہیں کیا ہے۔ کارلٹن سے لیکر "ادگے" اور "کے ٹو" تک سارے کے سارے میرے ہی برینڈ ہیں۔ البتہ ماچس کا برانڈ ضرور مقرر ہے کہ

میں ہمیشہ اور ہر کام کے لئے فلاور باسکٹ ماچس استعمال کرتی ہوں کہ اس کی تیلی لکڑی سے نہیں، مومیائے ہوئے کاغذ سے تیار کی جاتی ہے۔ اور میرے نزدیک لکڑی کو آگ دکھانا گناہ ہے۔

لکڑی جو خود درخت ہوتی ہے، جو برگ و بار لاتی ہے اور درخت جتنا پرانا ہوتا ہے اتنا ہی خاموش، پُروقار اور مہربان ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کبھی انسان بھی پُروقار اور مہربان ہوا کرتا تھا۔

ہاں تو پھر کیا ہوا۔ ایک دم ہی داستانی انداز پھر لہجے پر غالب آگیا تھا۔

ایک رات یوں ہوا۔

ایک سرے پر برگد کا درخت تھا اور دوسری طرف وکٹوریہ گیٹ اور اس کے آگے دیواروں سے گھرا ہوا راستہ یعنی چڑیا گھر کی سڑک۔

تو کیا ہوا کہ اس شب برگد تلے وقت کی چھاگلیں خاموش رہیں اس کی ایک بھی پائل نہ بجی۔

اگلے اور پچھلے زمانوں کے سارے قافلے گم تھے۔ جیسے کسی نے بھولے سے رات کے بجائے دن کو کوئی کہانی سُنا دی ہو۔ اور سارے زمانے رستہ بھول گئے ہوں۔

اور ہم نے چونک کر دیکھا تو وکٹوریہ گیٹ کے نکڑ پر کوکا کولا کا ایک بہت بڑا سا نیون سائن نصب تھا۔ ایک بڑا سا گول دائرہ۔ اور اس کے اندر کئی دائرے۔

ہر دائرے کا رنگ دوسرے سے مختلف تھا۔

ہر دائرے کا اپنا الگ رنگ تھا۔

اور سارے دائروں پر حاوی۔

کوکا کولا کا نام تھا۔

یہ سارے دائرے۔

گاہ جل اُٹھتے اور گاہ بجھ جاتے۔

آنکھوں میں چکاچوند سی ہوئی، نظر تلملائی۔

اس طرف برگد کا پرانا درخت تھا۔ اور اس طرف فری میسن ہال کی تاریکی کی متلاشی پراسرار عمارت۔

ہمارے اس ہاتھ کو واپڈا بلڈنگ کا پیالہ نما سبز روشنی سے لبریز رقبہ تھا اور اس سے کچھ آگے۔ الفلاح کی روشن جبین۔ اور اس کی نیون سائنز سے دمکتی پیشانی پر سروس شو والوں کا بار بار لپکتا ہوا جوتا۔

حد ہو گئی تھی......

ہمارے عہد کی راتیں سوگوار اور راز کناں تھیں۔ تم نے راتوں کی خلوتوں پر چھاپے مارے ہیں۔ پہلے تم نے ہماری اذانوں کے اسرار گم کئے۔ مائی کروفون کی لہروں پر کرخت آوازوں میں دی جانے والی اذانوں میں کوئی بھید اور کوئی راز باقی نہ رہا۔

اور اب تم نے ہماری راتوں کے سہاگ بھی لوٹ لئے۔

اور شبوں کا تقدس تو ان کی افسردگی، ان کی ظلمتوں اور بھیدوں سے عبارت ہے۔

اب نہ ہماری راتوں میں سکوت باقی ہے اور نہ ظلمتیں۔ انسان اب راتوں کو بھی اتنا ہی نڈر ہے جتنا وہ دن کو تھا۔

نیون سائنز نے رات کی چادر کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔

نیون سائنز۔ رات کے جسم پر چمکتے ہوئے داغ سب مجھے ان سے خوف آتا ہے۔ اور ان کے نظارے سے میری یہ آنکھیں درد کرنے لگتی ہیں۔

پھر اس روشنی میں انسان کچھ بھی تو نہیں دیکھ سکتا۔ اور اس دنیا میں کتنی بہت سی چیزوں کو انتظار ہوتا ہے کہ ان کی طرف دیکھا جائے۔

مگر اے نیون سائنز۔

ہمیں تاریکی اور ظلمتوں کی ضرورت ہے۔

کہ بہت سی روشنی نظر کو خیرہ کر دیتی ہے۔

وہ پھر اندھیرے میں ہنسی۔

اور عجیب بات ہے کہ اتنی بہت سی پگلی اور بے سر و پا باتیں کرنے کے باوجود اس کی ہنسی میں ذرا بھی پگلا پن نہ تھا۔

اور پتہ ہے کیا ہوتا ہے۔ جب ہم بہت دیر تک چندھیا دینے والی روشنی کی طرف دیکھتے ہیں تو وہ ہماری آنکھوں میں بس جاتی ہے۔

ہم آنکھیں کبھی بند کر لیں تو بھی ان بند آنکھوں میں وہ روشنی در آتی ہے۔

اور پتہ ہے کیا ہوا۔

شاید یہ نیون سائنز میری آنکھوں میں سما گئی ہیں۔ یہ ہر گھڑی رنگت بدلتی اور اندھیرے اُجالے سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی میری آنکھوں میں بس گئی ہیں۔

جب ہی تو میں نے یہ نیون سائنز انسانی چہروں پر جلتی بجھتی دیکھی ہیں۔

اب اس کی آواز پر دحشت تھی۔

دیکھو مجھے لگتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نہیں نہیں لگتا کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے۔

میں کریک ہو گئی ہوں، مجھے لگتا ہے کہ جیسے میرے دماغ کا ایک حصہ قیرہ خراب ہے۔

"میں روشنی کر دوں" اس کے ساتھی نے گھبرا کر پوچھا۔

تم روشنی کر کے کیا پاؤ گے، جبکہ اندھیرے اور اُجالے میں فرق ہی نہیں رہ گیا۔

اُجالے اب اتنے عنقا تو نہیں۔ اب تو راتیں بھی اندھیری نہیں ہوتیں۔

تاریکی میں سگریٹ کا روشن سرا بجھ جانے والی شمع کے گل کی طرح دمک رہا تھا۔

پھر بھی روشنی کر لینے میں کیا حرج ہے۔ تم یوں سدا اندھیرے میں تو نہیں بیٹھ سکتیں۔

تم روشنی کر لو۔

تب اس نے بتی جلائی۔ اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ نہایت مطمئن اور باہوش نظر آ رہی تھی۔

اس کو اطمینان سا ہوا۔ اور حیرت بھی۔

ارے!

ارے کا کیا مطلب، تمہیں کس بات پر حیرت ہوئی!

کچھ نہیں، اس نے بات بنائی، تمہارے گرد قلم ہیں، کاغذ ہیں، برش ہے"

رنگ اور روغن ہیں۔ تم کیا ایک وقت میں دو دو کام کرتی ہو۔

دراصل میں کچھ بھی نہیں کرتی ہوں، جب ہم سب کچھ کر دینا چھوڑ دیتے ہیں تو اپنے ارد گرد بڑا طمطراق اکٹھا کر لیتے ہیں اور لوازمات کا ایک جال بُن لیتے ہیں، اور بہت بولتے ہیں۔

اچھا، اب تم نے اصل بات کہنے سے گریز کر کے دوسری بات کیوں کی تھی۔ اس لئے نا کہ تم نے یہ نہیں کہنا چاہا تھا کہ 'ارے تم تو ذرا بھی پاگل نہیں نظر آ رہی ہو' نہیں میں پاگل نہیں ہوں، لیکن میرے دماغ کا ایک حصہ ضرور خراب ہے۔ جب ہی تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے ارد گرد، میرے چاروں جانب کاروں اور ان لوگوں کے چہروں پر جن سے میں خوب اور اچھی طرح واقف ہوں یہ بڑے بڑے سے بورڈ آویزاں ہیں جو گھڑی گھڑی رنگ بدلتے اور جلتے بجھتے ہیں۔

اور اب یہ حال ہے کہ میں کسی کو بھی نہیں پہچان پاتی۔

اب ہر شخص اجنبی اور ہر گھڑی نیا نظر آئے گا۔ لوگوں کی محبتیں، وفائیں، نفرتیں اور سارے اصول گھڑی گھڑی بدلتے ہیں۔

کون کیا تھا؟ اور اب کیا ہے؟

یہ فیصلہ مشکل ہو جائے گا۔

کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے، میں یہاں اجنبی ہوں اور اپنی بستی سے ناواقف۔

جیسے میری بستی کھو گئی ہو۔

میرے رستے گم ہو گئے ہوں۔

چہرے بہت جلد جلد اپنے رنگ بدل رہے ہیں، یگانگت اور بیگانگی کے فاصلے ختم ہو چکے ہیں۔ ایک ایک انسان کے بے شمار روپ مجھے اپنے محیط میں لے رہے ہیں۔

تب اس کی آنکھوں کی چمک سے گھبرا کر اس نے ایک بار اور التجا کی۔ میں روشنی گل کر دوں۔ بتی بجھا دوں۔

ہاں، ضرور، اس نے فوراً جواب دیا۔ اندھیرے اور ظلمات میں بڑا تحفظ اور بڑی

یکسانیت ہے۔ اندھیرے بڑے پردہ پوش ہوتے ہیں۔

بنتی بجھی تو وہ اچانک چونک کر پوچھنے لگی۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی۔

کیا بہت ضروری ہے کہ انسان کچھ نہ کچھ کہتا ہی چلا جائے؟

ہاں، کم سے کم اس کے لئے بہت ضروری ہے۔ جیسے ہر چہرے پر چھوٹے بڑے بے حساب دائرے نظر آتے ہوں۔ گھڑی گھڑی جلتے بجھتے، رنگ بدلتے اور تمام دائروں پر محیط کوئی نہ کوئی اشتہار نمایاں اور خوبصورت حروف میں لکھا ہو۔

اب انسان کس کس سے کہے اور کس کس کو جتاتا پھرے کہ میں نے تمہارے کون کون سے اور کتنے روپ دیکھے ہیں۔ اور یہ بتاؤ کہ تمہارا کوئی سچا اور اپنا روپ بھی ہے۔

اب گئے دن کی بات ہے کہ میں نے وہ چہرہ دیکھا جس سے میں بہت واقف تھی اور میں نے اسے بہت دیکھا تھا۔ اور اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کتنا بدلا اور میں نے اس پر کتنے دائرے اور کتنے رنگ دیکھے۔ حد تو یہ ہے کہ اس پر لکھے ہوئے اشتہار بھی گھڑی گھڑی بدلتے تھے اور اس چہرے کے مقابلے میں کوکا کولا کا وہ نیون سائن کتنا بہتر لگا تھا کہ جس کے دائرے گھڑی گھڑی رنگ بدلتے اور جلتے بجھتے تھے۔ لیکن کم سے کم ایک چیز تو مستقل اور برقرار تھی کہ اس پر مستقل کوکا کولا کا اشتہار آویزاں تھا۔

اور اب کیا تمہارا خیال ہے کہ مجھ پر یہ فرض تھا کہ میں اپنی اس واقف اور دوست کو یہ بتاتی کہ مجھے تمہارے چہرے پر مختلف دائرے نظر آئے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس پر کوئی مستقل قسم کا اشتہار بھی تحریر نظر نہیں آیا ہے۔

نہیں یہ بات درست نہیں، کسی کو اس کے بارے میں بتانا اور جتانا بڑا خطرناک اور غیر منفعت بخش سودا ہے۔ دوسروں کے پردے فاش کرنا ہم پر لازم نہیں۔

کہ خداوند ستّارالعیوب ہے۔ وہ خود پردہ پوش ہے۔ اور اس نے انسان کو نیون سائنز عطا کئے ہیں۔ کہ وہ اپنے چہروں کے نقاب اندر رکھیں۔

لیکن یہ بات بھی ہے کہ دیکھنے والی نظر کا خیال نہ کیا۔ کہ یہ گھڑی گھڑی جلتی بجھتی روشنیاں نظر پر ظلم کرتی اور بڑا دُکھ دیتی ہیں۔ اور بسا اوقات نظروں میں سما کر رہ جاتی ہیں، کہ میں اس رات کو بہت کوستی اور نہیں چاہتی ہوں کہ جس رات میں نے برگد تلے سے کھڑے ہو کر دکٹوریہ گیٹ کے نکڑ پر جھلمل کرنے کوکا کولا کے اس نیون سائن کو دیکھا تھا۔ اور پھر اس شب کے بعد اُجالے اور اندھیرے نے اپنے آپ کو ان کے محیط میں محصور پایا۔

لارنس کی راتیں اب بھی ویسی ہی سرد، خاموش اور اندھیری ہیں۔ اور روش روش رات کی رانی کی آوارہ مہک بھٹکتی ہے۔ اب بھی جم خانے اور پنجاب کلب کے باہر شیشوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنیوں کی کرنیں تاریکی کے پردے چاک کرنے کی ناکام کوششوں میں مصروف نظر آتی ہیں۔ اب بھی وہاں تاش کی بازیوں اور عورتوں کے اُلٹ پھیر سے معاملے اور سودے طے ہوتے ہیں۔ لوگ بڑھیا سوٹوں میں ملبوس، بڑھیا شرابوں کے جام ہاتھوں میں اُٹھائے اپنے چہرے پر نیون سائنز کے بورڈ آویزاں کئے ہنس بول رہے ہیں۔ اور رات گئے یا صبح کاذب کے دھندلکے میں کوئی بیرا ان کو نیم بے ہوشی کے عالم میں گھسیٹ کر ان کی گاڑیوں میں ڈال دیتا ہوگا اور ڈرائیور کا شانہ ہلا کر اس کو بیدار کرتا ہوگا۔ "انھیں لے جاؤ کہ ان کے معاملے اور سودے مکمل ہو چکے ہیں۔"

وقت دبے قدموں یوں ہی اپنے کاموں میں مصروف رہے گا۔ اور میں شاید

اندھیرے اور ظلمتوں کی عافیتوں کی تلاش میں یوں ہی بے کل رہوں گی۔ میرے اردگرد نیون سائنز کے بورڈ کسی درخت کی ڈالوں پر تیزی سے بڑھتے ہوئے پتوں کے اضافی اور ضربی عمل کی صورت میں بڑھتے جائیں گے۔ اور کہتے ہیں جب درخت ناقص پتوں اور ڈالوں کا بوجھ اٹھائے اٹھائے اکتا جاتا ہے تب خزاں کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ اور خزاں کے دامن میں بہاروں سے کئی گنا زیادہ رنگ ہوتے ہیں۔ پتے پتے کا روپ بدلتا ہے۔ پتے پتے کا رنگ جدا ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا ہے کبھی فصلِ خزاں کا وہ دور جب پتہ پتہ رنگ بدلتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے تمام رنگ آپس میں گڈمڈ ہوتے ہیں تو مکمل اور بھرپور خزاں آتی ہے۔

اور یہ کہیں فصلِ خزاں تو نہیں۔

کہیں تم نے خزاں کے پاؤں کی چاپ تو نہیں سنی!

نہیں ٹھہرو۔ پہلے میں اپنی کھڑکیاں اور دروازے مضبوطی سے بند کر لوں۔ تب کوئی جواب دینا۔

اچھا چھوڑو! مجھے نیند آرہی ہے۔

میں نے تکیہ پر سر رکھ لیا ہے۔

اور اب تم بھی سو جاؤ!

اس کے ساتھی نے اس کی نیند میں ڈوبی آواز کو آخری بار سنا۔

اور بہت دیر بعد مکمل سکوت کو محسوس کیا۔ بجز دھیرے دھیرے آتی ہوئی نرم نرم سانسوں کے۔

کھڑکی کے شیشوں میں سے چھن چھن کر آتی ہوئی روشنی میں اس کے چاروں

طرف بکھرے ہوئے کاغذ تھے اور پلاکیپ کا ایک قلم تھا۔ جس کی روشنائی شاید ختم ہو چکی تھی۔ اور سگرٹوں کی راکھ سے لبریز راکھ دانی۔ برش، رنگ و روغن کھڑکی کے شیشوں میں سے آتی ہوئی مدھم روشنی اپنے ساتھ درختوں کی ڈالوں کے جو سائے لائی تھی وہ دیوار پر مدھم اور پراسرار نقش ابھار رہے تھے۔

پھر اس نے اُٹھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا اور کھڑکی کے دروازے کھول کر دیکھا۔ سامنے کوکاکولا کا نیون سائن گھڑی گھڑی جل بجھ رہا تھا۔

"سیپ" کراچی

مسعود اشعر

آنکھوں پہ دونوں ہاتھ

"کیا سائرن ہوا تھا؟ یہ سب لوگ باہر کیوں نکل آئے؟" اس نے اپنے برابر ریلنگ پر جھکی اس لڑکی سے پوچھا جس سے بات کرنے کے لئے وہ صبح سے کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا — لیکن اس وقت تو وہ کسی سے بھی یہ سوال کر سکتا تھا۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ اس کے قریب وہی لڑکی کھڑی تھی۔ اسے یاد ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ کس آواز پر یا کس کے کہنے پہ ہڑبڑا کر اپنے کیبن سے باہر نکل آیا تھا۔

وہ لڑکی ریلنگ پر اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اس کا سینہ اس کے دونوں بازوؤں میں چھپ گیا تھا اور اس کی کمر نے لچک کر اس کے بھرے بھرے کولہوں کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔

"تم تو اس کے گول گول کولہوں پر ہاتھ پھیرنے کے لئے مرے جا رہے ہو اور بس ——!"

اور بس —— ؟! —— ارے یہ کبیر کدھر گیا؟ اس نے گھوم کر کبیر کے کیبن کی

طرف دیکھا۔ سب لوگ اپنے کیبنوں سے باہر نکل آئے تھے۔ ہر شخص ریلنگ پر جھک کر اندھیری ندی کے پانی میں کچھ نہ کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیبنوں کی کھڑکیوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنی سے اسٹیمر کے آس پاس ندی کا تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا تھا۔ مگر روشنی میں پانی اور بھی مٹیالا ہو گیا تھا اور اسٹیمر کے چلنے سے جو لہریں پیدا ہو رہی تھیں اس سے وہ گدلا پانی بار بار رنگ بدل رہا تھا۔ کبھی اس کا رنگ کالا ہو جاتا، گہرا کالا، کبھی نیلا اور کبھی سُرخ۔ ندی سے اُٹھنے والے بھاپ کے بھورے اور کالے بادل سرچ لائٹ کی تیز روشنی کا رستہ روک رہے تھے۔ سامنے بھاپ کی بھوری دیوار کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ شاید اسٹیمر ٹھہر گیا ہے۔ مگر جب اس نے غور سے سُنا تو انجن اور پانی کی ملی جلی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اسٹیمر چل رہا ہے۔ اور اصل نے اپنی رفتار بھی ابھی تک کم نہیں کی۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل مطمئن کھڑی تھی، جیسے اُس کے لئے طوفان آکر گزر بھی چکا ہو، جیسے وہ صدیوں سے اسی طرح پُرسکون کھڑی ہو۔ مگر ڈیک کا عجیب عالم تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہاں جو آرام کرسیاں ترتیب سے رکھی تھیں وہ تتر بتر ہو گئی تھیں۔ کچھ کرسیاں چھوٹی میزوں پر رکھ دی گئی تھیں اور کچھ اُلٹی پڑی تھیں۔ ریلنگ کے ساتھ لٹکنے والی لائف بیلٹ کھول دی گئی تھی۔ ڈائننگ ہال کے بیرے اور مشین روم کے لوگ اِدھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے۔ ڈائننگ ہال کے اندر سے بھی کھٹ پٹ کی آوازیں آ رہی تھیں جیسے برتن پٹخے جا رہے ہوں اور الماریوں کے دروازے کھول کھول کر بند کئے جا رہے ہوں۔

پھر اس نے کچھ اجنبی چہرے دیکھے جو ڈائننگ ہال کے دروازے سے نکل کر تیزی

سے لوئر کلاس کی طرف جاتے اور اسی تیزی سے واپس آجاتے۔ وہ حیران ہوا کہ
یہ کون لوگ ہیں اور اچانک کہاں سے آ گئے؟ پہلے تو اس نے انھیں نہیں دیکھا!!
یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟؟

مگر وہ تینوں غیر ملکی کہاں گئے! اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔
ایک سفید فام لڑکا، ایک بوڑھی عورت اور ایک بوڑھا مرد۔ مرد نے پادریوں والا سفید
فراک پہن رکھا تھا۔ بوڑھی عورت سر پر سفید رومال باندھے تھی اور لڑکے نے سفید
قمیص اور خاکی پتلون پہن رکھی تھی۔ وہ لڑکا بھی دن بھر خاموشی سے اس لڑکی کو دیکھتا
رہا تھا جو اس وقت اُس کے ساتھ ریلنگ پر جھکی ہوئی تھی۔ بوڑھی عورت آرام کرسی
پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھتی رہی تھی اور بوڑھا مرد ٹہلتا رہا تھا۔ وہ تینوں جب تک اس
کے سامنے رہے بالکل خاموش رہے۔ اسے تو ایسا لگا کہ انھوں نے اپنے کیبن میں جاکر
بھی کوئی بات نہیں کی ہوگی وہ حیران تھا کہ اگر یہ بولتے تو ان کی آواز کیسی ہوگی؟ وہ
ڈیک پر خاموش بیٹھے رہے یا ٹہلتے رہے۔ پھر ڈائیننگ ہال میں اسی کلیسا والی
متبرک خاموشی کے ساتھ کھانا کھاتے رہے۔ زیادہ رات ہوئی تو اپنے کیبن یا کیبنوں
میں چلے گئے۔۔ پھر۔۔۔! وہ بھی کتنا پاگل ہے۔ وہ تو راستے ہی میں کسی گھاٹ پر
اتر گئے تھے۔ آدھی رات کے وقت۔! مگر کس گھاٹ پہ اتر گئے تھے۔؟!

تو کیا آدھی رات ہو چکی ہے! اس نے ریلنگ پر اُلٹا لٹک کر آسمان کو دیکھنے
کی کوشش کی۔ مگر وہاں ایک بھی ستارہ نہیں تھا، اور بادل اتنے کالے اور اتنے
گھنے تھے کہ اس کی آنکھوں کی روشنی انھیں پار نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اس نے اپنے
سامنے ندی کے کنارے پر نظر جمانے کی کوشش کی کہ شاید ادھر کوئی ایسی چیز نظر

آ جائے جس سے وقت کا اندازہ ہو سکے مگر راستے میں لڑکی کھڑی تھی اور ندی کا کوئی کنارہ نہیں تھا۔

"میں اپنے کیبن میں تنہا ہوں اور اس میں دو بستر ہیں۔"

لڑکی نے گھنگھور آنکھوں پر سے لانبی اور گھنی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا جیسے اس کی بات سن لی ہو اور اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر میز پر آگے کو جھک کر اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"خوب صورت ہیں آپ بہت خوب صورت! مگر اس لینڈ اسکیپ میں آپ کا یہ تنگ لباس کچھ اچھا نہیں لگا — یا — اچھا لگتا ہے! ایں — ؟!

"تمہارا کیا خیال ہے۔ ؟" یہ بات اس نے کبیر سے کہی اور زور سے کہی۔

"کس بارے میں — ؟"

"لابسٹر بہت مزے کی چیز ہے۔"

"اور لابسٹر بھی اس اسٹیمر کے۔"

ساری حرکت کبیر کی تھی۔ اس نے کیبن الگ الگ لئے اور ڈائیننگ ہال کی چاروں میزوں میں سے چھانٹ کر اس میز پر بیٹھتا تھا جو بالکل اس لڑکی کے سامنے تھی۔ پھر وہ پلکیں نہیں اٹھیں۔ یا خود اس نے ہی ڈر کے مارے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

"اب ہم کل دو پہر تک کھلنا پہنچ سکیں گے۔"

"کیوں ۔ ۔ ؟"

"اسٹیمر نے راستہ بدل دیا ہے۔"

"راستہ کیوں بدلا۔؟"

"دریا ناراض ہو گئے ہیں۔ ہم خلیج بنگال کے قریب ہیں اور سارے طوفان یہیں جنم لیتے ہیں۔"

"سارے طوفان یہیں جنم لیتے ہیں؟ اس نے دریا میں تیرتے ہوئے جل کگڑی کے پودے پر بیٹھی تتلی کو دیکھا۔ یہ تتلی جو ایک کنارے سے چلی ہے اور جل ککڑی کے پودے پر بیٹھے بیٹھے دریا پار کر جائے گی۔ مگر اس تتلی کو دریا پار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ ایک ہی کنارے پر زندگی کیوں نہیں گزار دیتی۔ اُس نے اُس لڑکی کو دیکھا۔ وہ بھی شاید اسی تتلی کو دیکھ رہی تھی اور اس کا ساتھی گھوم پھر کر تصویریں اُتار رہا تھا۔ اسے ہنسی آگئی۔

وہ دونوں بیک وقت ایک تیسری چیز کو دیکھ رہے ہیں۔ کتنا شاعرانہ خیال ہے! وہ اور ایک خوب صورت لڑکی۔ اور تیسری شے! دونوں میں مشترک! ـــــ اور پھر مشترک حقیقت۔ یہ سفر۔!

پھر اسے شبہ ہوا کہ اس نے اس لڑکی سے کچھ پوچھا بھی تھا یا محض اس کا خیال تھا کہ اس نے پوچھا ہے؟

"کیا سائرن ہوا تھا؟ سب لوگ باہر کیوں نکل آئے۔؟!"

اس نے زور سے کھنکار کر گلا صاف کیا اور چاہا کہ پھر اس سے وہی سوال کرے۔ لیکن پھر سوچا کہ سوال کرنے سے کیا حاصل؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ لوگ اپنے کیبنوں سے باہر نکل آئے ہیں اور ریلنگ پر ٹک گئے ہیں، جو ریلنگ پر نہیں ٹک سکے وہ ایک دوسرے کا منہ تکتے پھر رہے ہیں۔ جیسے دوسروں کی آنکھوں میں انھیں اپنی حفاظت

کا سامان نظر آئے گا۔ وہ خود ریلنگ پر لٹکنے والوں میں سے تھا کیونکہ جن آنکھوں میں وہ اپنے بچاؤ کی تدبیریں پڑھنا چاہتا تھا وہ بھی ندی کے مٹیالے اور تاریک پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"ارے یہ کیبن کدھر گیا۔ ؟!" اس نے گھوم کر اس زینہ کی طرف دیکھا جو لوئر کلاس کے تنگ و تاریک غار کی طرف اترتا تھا اور جس کی طرف جانے کے لئے وہ صبح سے کئی مرتبہ ارادہ کر چکا تھا۔ مگر جب بھی قدم بڑھاتا وہ آنکھیں اس کا راستہ روک لیتی تھیں۔ کیبن یقیناً نیچے ہوگا بلکہ ہو سکتا ہے وہ مسافروں کا سامان اکٹھا کر کے انھیں گھاٹ پر اتارنے کے لئے تیار کر رہا ہو۔ مگر کونسا گھاٹ ؟۔ ایک گھاٹ تو گزر گیا۔ اب کونسا گھاٹ آئے گا؟ اور وہ تینوں غیر ملکی جس گھاٹ پر اترے وہ کونسا گھاٹ تھا؟ وہ رات کا کونسا پہر تھا؟ اسے پتہ کیوں نہیں چلا!! ہو سکتا ہے وہ بھی وہیں اتر جاتا —— تو پھر وہ سندربن کیسے پہنچتا ؟!

"اب اسٹیمر سندربن کے راستے جائے گا"—— اسے یہ اطلاع دوپہر کے کھانے پر ملی۔

"اچھا —— !!!" وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ وہ خوش تھا کہ مقررہ وقت سے پہلے ہی وہ سندربن دیکھ سکے گا۔

"مگر وہ تو آدھی رات کے بعد کہیں آئے گا۔ آپ کیا دیکھ سکیں گے ؟"

"کچھ بھی نہ دیکھ سکیں! اس کی خوشبو تو سونگھ سکیں گے۔"

پھر اس نے پہلی بار گھٹاٹوپ آنکھوں اور کھاپ دیتے سانولے جسم کی گرم گرم خوشبو اپنی ناک، آنکھوں اور ہونٹوں کے قریب محسوس کی۔ وہ بھاری بھاری پلکیں بڑی تکلیف سے اٹھیں، پھر سارے دریاؤں کی گہرائی نے اس کا جائزہ لیا اور جھک کر

نگیں گالوں پر جھک گئیں۔ اس نے جلدی سے لابسٹر کی نرم نرم بینگ سے اپنا منہ بھر لیا اور محسوس کیا کہ چٹ پٹی چیز کھاتے ہوئے بھی منہ میں پانی بھر سکتا ہے ــــ اب سفر اچھا کٹ جائے گا ــ اس نے سوچا۔!

پھر دائیں ہاتھ والی میز سے تینوں غیر ملکی اُٹھے اور اپنے کیبنوں کی طرف چلے گئے۔ ان کے بائیں جانب میز پر تنہا بیٹھے گنجے پولیس افسر نے اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ بھی خاموش تھا۔ تینوں غیر ملکی بھی خاموشی سے اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ وہ لڑکی بھی اپنے ساتھی سے کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ سفید وردی میں ملبوس ویٹر بھی ایک کونے میں بت بنا کھڑا تھا حتیٰ کہ کبیر بھی خاموشی سے لابسٹر کی ٹانگیں توڑ رہا تھا۔

اس مکمل سکوت سے اسے ڈر لگا۔ اتنی گہری اور گمبھیر خاموشی!؟ بنگال کے تمام دریاؤں کی گہرائی اور سارے جنگلوں کا سناٹا اس وقت اس ڈائننگ ہال میں گھس آیا تھا۔ اتنے گہرے سکوت کے بعد کچھ نہ کچھ ضرور ہو جاتا ہے، مگر کیا ہو جاتا ہے؟ پھر اس نے خاموشی توڑنے کے لئے بھاری دستے والی شیفیلڈ کی چھری اٹھائی اور اپنے سر کے پاس لے جاکر زور سے لکڑی کے فرش پر چھوڑ دی اور سامنے کھڑکی کے شیشوں میں سے کھلے آسمان کو دیکھنے لگا۔ آٹھ آنکھوں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور ویٹر چونک کر چھری اٹھانے کے لئے لپکا۔ کبیر نے پہلے تو آنکھیں پھاڑ کر اس کو دیکھا پھر مسکرا کر گرم گرم جھینگے چبانے لگا۔ خاموشی پھر چھا گئی۔

لوئر کلاس کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر مسافروں کی بھیڑ تھی۔ پتہ نہیں اتنے بہت سے لوگ کہاں سے آ گئے تھے۔ ہر شخص نیچے اترنے کے لئے بے قرار تھا اور چاہتا تھا کہ سب سے پہلے وہی نیچے پہنچ جائے مگر ایسا لگتا تھا کہ آگے کسی چیز نے راستہ

روک رکھا ہے۔ آگے والے سرک ہی نہیں رہے تھے۔ ہر آدمی اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ اس کے آگے والا قدم بڑھائے تو وہ بھی اپنا پاؤں نیچے اتارے۔ اس نے لوگوں کے سروں پر سے نیچے جھانکنے کی کوشش کی مگر اندھیرا اتنا تھا کہ کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر اسے کبیر دکھائی دیا جو اجنبی لوگوں کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ کبیر حسبِ معمول گھبرایا ہوا اور پریشان تھا۔ وہ بار بار اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتا، سر کھجاتا اور زور زور سے ہاتھ ہلاتا۔ اجنبی لوگ اس کے سامنے بالکل خاموش کھڑے تھے۔ جیسے کہنے کی ساری باتیں کبیر کے پاس تھیں اور وہ سننے کے لئے مامور کئے گئے تھے۔ ــــ مگر ـــــ انھیں اس کام پر کس نے مامور کیا تھا۔ اس وقت جبکہ اسٹیمر طوفان زدہ شہر بنا ہوا ہے یہ لوگ اتنے مطمئن اور اتنے پُرسکون کیوں ہیں؟ کبیر یقیناً ان لوگوں سے مدد طلب کر رہا ہوگا۔ تو گویا کبیر طوفان میں کسی کی مدد حاصل کر سکتا ہے۔

"کبیر۔۔۔ بھائی۔۔۔۔۔" اس نے زور سے آواز لگائی اور نیچے سے آنے والے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اتنے بہت سے لوگوں کی موجودگی میں اس کی آواز کبیر تک کیسے پہنچ سکتی ہے مگر حیرت اس بات پر ہوئی کہ اس کے قریب کھڑے لوگ بھی اس کی آواز پر نہیں چونکے تھے جیسے انھوں نے کوئی آواز سُنی ہی نہیں۔ تو کیا وہ خواب میں چیخ رہا ہے۔! ؟ یا صرف سوچ رہا ہے کہ وہ چیخ رہا ہے؟!

پھر اسے شک ہوا اپنے آپ پر، اپنے خیال اور اپنی سوچ پر۔ وہ لوگ جو راستے میں کسی گھاٹ پر اُتر گئے کیا واقعی غیر ملکی تھے؟ یا یہ بھی محض اس کا خیال ہی تھا؟ صرف ایپرن نما سفید فراک دیکھ کر ہی اس نے فرض کر لیا تھا کہ وہ غیر ملکی ہیں ایسا ہو سکتا ہے وہ غیر ملکی نہ ہوں، صرف انھوں نے لباس ایسا پہن رکھا ہو، مگر اس سے کیا

فرق پڑتا ہے کہ وہ ملکی تھے یا غیر ملکی۔ وہ مسکرایا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ وہ رات میں کسی وقت چپکے سے کسی گھاٹ پر اتر گئے۔ تو وہ کونسا گھاٹ تھا!! اس کی پریشانی برقرار تھی۔ اس لڑکی کو ضرور معلوم ہوگا۔ وہ بھی بڑی میٹھی میٹھی نظروں سے اس لڑکے کو دیکھ رہی تھی ــــ مگر ــــ اس کے دماغ میں اچانک ایک کوندا سا لپکا۔ اس لڑکی کا ساتھی نظر نہیں آیا۔ کہاں گیا وہ حبشی ــــ؟ حبشی ــــ؟

"عجیب بات ہے خوب صورت لڑکیوں کے ساتھ مرد ہمیشہ بدصورت ہوتے ہیں۔"

"ہوتے نہیں، لگتے ہیں۔"

اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اب اس کے ارد گرد کھڑے بہت سے چہرے اس کی طرف مڑ گئے اور ساری آنکھیں اس کے چہرے پر گڑ گئیں۔ نیم تاریکی میں اس نے دیکھا کہ اُن کالے بھجنگ چہروں سے تیل ٹپک رہا تھا اور ننگ دھڑنگ جسم اس طرح آپس میں چپٹے ہوئے تھے جیسے انھیں گوند سے چپکا دیا گیا ہو۔ پھر وہ چہرے ساکت ہوگئے اور سارے جسم پسینے میں چکنے گوشت کی دیوار بن گئے۔ اب صرف آنکھوں کی سفیدی جگر جگر کر رہی تھی۔ وہ ڈرا کہ کہیں اس کا جسم بھی تاریکی کے اس وسیع جسم میں تحلیل نہ ہو جائے۔ اس نے خوف سے جھرجھری لی اور زور سے آنکھیں بند کر لیں۔

نہ جانے رات کا وہ کونسا پہر تھا۔ جب وہ اپنے کیبن میں گیا تھا۔ اسی وقت اس نے بہت سے لوگوں کی آوازیں سنی تھیں، جو ایک ہی لے اور ایک ہی آہنگ میں۔

"اللہ بولو۔ اللہ بولو" کہہ رہے تھے۔ جیسے بہت بھاری بوجھ یا جہاز کی بھاری بھاری گانٹھیں اسٹیمر سے دھکیل کر گھاٹ پر لے جائی جا رہی ہو اور بوجھ اور تھکن کا احساس کم کرنے کے لئے "اللہ بولو" کی آواز لگائی جا رہی ہو۔ تو گویا وہ کوئی گھاٹ تھا اور وہ

تینوں ضرور اسی گھاٹ پر اُترے ہوں گے ـــــ مگر وہ کونسا گھاٹ تھا اور اسے اس وقت خیال کیوں نہیں آیا۔ اب کیوں آ رہا ہے۔؟

لوئر کلاس کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر جو جمگھٹا تھا اُس سے زیادہ مجمع اب اس کے پیچھے ہو گیا تھا اور سب مل کر اسے دبا رہے تھے۔ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور اس طرف دیکھنے کی ہمت کی جدھر وہ لڑکی ریلنگ پر جھکی ہوئی تھی۔ چاہا کہ آگے بڑھے مگر راستے میں ایک لمبی سی داڑھی والا دیوار بنا کھڑا تھا۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ نیچے اترنے والا راستہ تنگ و حشر تنگ ہجوم نے روک رکھا تھا اور اوپر جانے کا راستہ اس داڑھی والے نے۔ اس نے اپنے پیروں کو دیکھنے کی ناکام کوشش کی اور بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔

کیبرا چھا رہا ہے۔ پہلے ہی نیچے اتر گیا۔ اس نے داڑھی والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں جو ساکت تھیں اور اسے تکے جا رہی تھیں۔

"اس لڑکی کا ساتھی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ہے۔ وہ اکیلی ہے مجھے اوپر جانے دو۔"

پھر اسے یکلخت خیال آیا کہ کہیں وہ بھی تو ان تینوں کے ساتھ اس نامعلوم گھاٹ پر نہیں اتر گیا!! تو وہ لڑکی کو اکیلا چھوڑ گیا۔؟!! اس نے داڑھی والے کے کاندھوں پر سے اچک کر اوپر دیکھا۔ ڈائننگ ہال کے دروازے تک آدمی ہی آدمی تھے۔ اب تو ریلنگ کے پاس بھی انسانی جسموں کی دیوار بن گئی تھی۔ اب وہ اس مقام تک نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جہاں اس کا خیال تھا لڑکی کھڑی ہے۔ مگر یہ اتنے لوگ کہاں سے آ گئے؟! وہ حیران ہوا۔ اوپر آٹھ دس کیبنوں میں زیادہ سے زیادہ سولہ مسافر سما سکتے تھے۔ ڈائننگ ہال کے اسٹاف کو بھی شامل کر لیا جائے تو پانچ چھ افراد اور بن گئے۔

تو پھر یہ سینکڑوں ننگے تیل ٹپکاتے جسم کہاں سے آگئے۔! وہ خوف سے کانپ گیا۔ کہیں اسٹیمر ہی نہ ڈوب جائے۔!

"کبیر بھا۔۔۔۔۔ئی۔۔۔۔۔"

پھر اسے سب اُوپر بیٹھنے والوں کا خیال آیا۔ وہ جو شیشے کے گھروندے میں بیٹھ کر اسٹیمر کو راستہ بتاتے ہیں طوفان آیا تو سب سے پہلے وہی متاثر ہوں گے! مگر اس وقت ان کا کیا حال ہے ۔۔۔ ؟!

جس کلاس میں وہ سفر کر رہا تھا۔ اس میں سے اُوپر جانے کے لئے کوئی راستہ نہیں تھا۔ یا اگر راستہ تھا تو اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ اُوپر پہنچنے کے لئے سب سے نچلی کلاس میں اُترنا پڑتا تھا ۔۔۔ جب وہ اُوپر چڑھنے کے لئے نیچے پہنچا تو اس نے نچلی کلاس کے مسافروں کو بھی دیکھا جو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کی طرح لکڑی کے فرش پر اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ پسینے میں چمچماتے کالے بھجنگ مرد عورتیں اور بچے جو ہال میں کافی جگہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے اس طرح چمٹے ہوئے تھے کہ اگر علیحدہ ہوئے تو ان کا وجود ہی ختم ہو جائے گا ۔۔۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسٹیمر کی اصل زندگی یہی لوگ ہیں کہ بچوں کے پیشاب پاخانے، بوڑھوں کے بلغم اور جوان جسموں کی تیز بو نے اسے اور کبیر کو فوراً اُوپر پہنچا دیا۔

اوپر شیشے کے گھر میں بیٹھے اس شخص نے جو چرخی گھما رہا تھا اسے گھور کر دیکھا اور اپنے ساتھی سے کچھ کہا۔ پھر وہ دوسرا آدمی کیبن سے باہر آیا اور کبیر کو ایک طرف لے جا کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا ۔۔۔ کبیر نے بھی سب سے تعلقات قائم کر رکھے ہیں ۔۔۔ اس نے سوچا اور دُور درختوں کے درمیان تنگ ہوتی ندی کے ڈوبتے

لگا۔ ندی پُرسکون تھی۔ خاموش پانی میں بہتے جل کنڑی کے پودوں نے بھی جیسے زمین میں جڑ پکڑ لی تھی۔ کناروں پر کھڑے درخت بالکل خاموش تھے۔ صرف آسمان پر بادل تیر رہے تھے جو اتنے نیچے تھے جیسے ذرا سا اچک کر انھیں ہاتھ لگایا جا سکتا تھا۔ البتہ یہاں پہنچ کر دریا کا پاٹ دُور ہو گیا تھا اور کنارے بھی کہیں دُور بہتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ اسٹیمر کی چھت ہے!۔ اس نے اپنے آپ سے کہا اور ہم سب مسافروں کے سروں پر کھڑے ہیں!! پھر وہ دُور رسوں کے درمیان چلتا ہوا سب سے آگے اسٹیمر کے سرے پر پہنچ گیا اور نیچے جھانک کر دیکھا۔ نیچے ایک کشتی موٹے موٹے رسوں سے بندھی اسٹیمر کے ساتھ لٹک رہی تھی اور اس میں دو آدمی بیٹھے مٹھیاں بھر بھر کر بھات اور مچھلی کھا رہے تھے۔ وہ جھکا تو ان دونوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور منہ میں بھرے ہوئے مچھلی کے کانٹے زور سے ندی میں تھوک دیئے۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اسے ایسے لگا جیسے ان دونوں آدمیوں نے اسے دیکھ کر تھوکا ہے۔ مگر کیوں۔!!

اب وہ لڑکی اور اس کا ساتھی بھی اُوپر آ گئے اور اس کا ساتھی کیبن کو بیک گراؤنڈ بنا کر اس کی تصویر اتار رہا تھا۔ کبیر اس کے پاس آ گیا تھا اور بنگالہ کی جادوگرنیوں کا ذکر کر رہا تھا اور اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو اب کیبن کے قریب ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگائے، سینہ اُبھارے گردن کے ذرا سے خم کے ساتھ تھوڑی اُونچی کئے سیاہ بال ہوا میں لہرا رہی تھی اور اس کا ساتھی تصویر کھینچنے کے لئے کیمرہ ہی سیٹ نہیں کر پا رہا تھا۔

اسے پھر رسوں سے بندھی ہوئی کشتی کا خیال آیا۔ طوفان آ جائے تو یہی کشتی مسافروں کو کنارے تک پہنچاتی ہے۔ مگر ایک چھوٹی سی کشتی کتنے مسافروں کو کنارے

تک پہنچا سکتی ہے ؟ اور اگر وہ خود ہی اُلٹ جائے تو —— ؟

"تم تو ہمیشہ اُلٹی ہی بات سوچتے ہو۔!"

اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر کالے بسا بندے گوشت کی دیوار پر سے نیچے جھانکا کہ شاید کبیر کہیں دکھائی دے جائے۔ مگر اب اتنی تاریکی ہو گئی تھی کہ کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ سوائے ایک جسم کے جو اسٹیمر کے انجن کے ساتھ سانس لے رہا تھا اور یہی سانس ندی کی لہروں کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئی تھی۔ انسانوں، اسٹیمر اور ندی کی لہروں کے ایک ساتھ سانس لینے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسٹیمر بھی چل رہا ہے اور اس کی رفتار میں بھی فرق نہیں پڑا۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہی جیسے تاریک چہروں کا جائزہ لیا اور حیران ہوا کہ اس عرصہ میں کوئی بھی گھاٹ نہیں آیا کہ طوفان گزرنے تک اسٹیمر وہاں ٹھہر جاتا —— !! پھر اس نے وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ کیا وقت ہو گا۔ ؟ اس نے اس عرصے میں گزرنے والے تمام واقعات پر غور کیا۔ پھر سوچا کہ باہر ابھی تک کالی رات برس رہی ہے، اندر ویسا ہی بھیانک اندھیرا ہے جنگل کی خوشبو بھی ابھی تک نہیں آئی کہ سندربن آنے کی نوید ملتی سندربن آتا تو رات کا پچھلا پہر بھی آتا اور پھر صبح —— مگر اس کی گھڑی کہاں گئی ؟! اس نے گھبرا کر اپنی دونوں کلائیاں آنکھوں کے ساتھ لگا لیں۔ شاید وہ کیبن میں ہی بھول آیا۔ گھڑی ہوتی تو کم سے کم اسے وقت تو معلوم ہو جاتا۔ پتہ نہیں طوفان آیا تو اس کی گھڑی بھی مل سکے گی یا نہیں! ۔ اور اس کا باقی سامان ؟! کیا سب کچھ غائب ہو جائے گا —— ؟! —— کبیر نے بہت دھوکا دیا۔ خدا جانے وہ اسے چھوڑ کر نیچے کیوں بھاگ گیا۔ کبیر ہوتا تو وہ اس سے باتیں ہی کرتا۔ آگے بڑھنے یا واپس جانے کی باتیں۔

جوں جوں وہ آگے بڑھتی گئی۔ راستے میں دانے بکھیرتی گئی کہ واپسی میں راستہ نہ بھول جائے لیکن جب وہ طویل اور کٹھن راستوں پہ بھٹک کر لوٹی تو کوا سارے دانے چگ گیا تھا ـــــ مگر میں تو راستے میں دانے بھی نہیں بکھیر سکتا! اپنی بے بسی کا احساس کر کے وہ خوفزدہ ہوا۔ میرے آس پاس پانی ہی پانی ہے جو سارے نشان مٹا ڈالتا ہے ـــــ!

اب اس کے کپڑے بھی پسینے میں بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئے تھے۔ اور اسے اپنے جسم سے بھی دوسرے جسموں کی بو آنے لگی تھی۔ وہ کھڑے کھڑے تھک گیا تھا اور چاہتا تھا کہ کہیں تھوڑی سی جگہ بھی مل جائے تو بیٹھ جائے۔ اب تو وہ اندھیرے میں پگھلتے ہوئے جسموں کے قدموں میں بھی بیٹھنے کو تیار تھا۔ مگر ان جسموں کے پاؤں کہاں ہیں؟! اور میرے پاؤں ـــــ!! اس نے ہمت کر کے دایاں پاؤں اوپر اٹھانے کی کوشش کی مگر دوسری ٹانگوں کی طرح اس کا پاؤں بھی لکڑی کے فرش میں جم گیا تھا اور اس کی طاقت جواب دے گئی تھی۔

پھر وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا ـــــ یہ طوفان کب آئے گا؟! کیوں نہیں تھمتا ـــــ!! یہ کیسا عذاب ہے۔؟! اس نے جی کڑا کر کے ایک بار پھر کبیر کو آواز دینے کے لئے منہ کھولا۔ لیکن ابھی وہ حلق سے آواز نکالنے ہی والا تھا کہ اوپر ایک بلند چیخ بلند ہوئی اور سارا اسٹیمر لرز گیا، پھر تمام ساکت آنکھیں اپنے خول سے باہر نکل پڑیں اور کان لمبے ہو کر کیبنوں کی قطار تک پہنچ گئے۔

"اس نے ندی میں چھلانگ لگا دی ـــــ"

اس نے؟ کس نے؟! اس کون!! تو کیا وہ میں تھا۔!!! ـــــ مگر میں نے تو

ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

پھر اس نے زور سے دونوں آنکھیں بھینچ کر اور دونوں کان بند کر کے سینے کے پورے زور سے آواز لگائی۔

"کبیر —— بچا .... ئی ..... ای"

لیکن اس کے آس پاس کھڑے لوگوں میں سے کسی نے بھی اس کی آواز نہیں سُنی تھی۔

"فنون" لاہور

نوید انجم

ریپ

پہلے تو ایک ہی گھر تھا مگر جب جھگڑا حد سے بڑھا تو بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی گئی اور پھر جوں جوں وقت گزرنے لگا، نت نئے جھگڑے بڑھتے چلے گئے۔

پروین برآمدے میں مٹی کے تیل والا چولھا لئے، گہری سوچ میں غرق بیٹھی تھی۔ سر کے بال اُلجھے اُلجھے اور بکھرے ہوئے تھے۔ سر کا دوپٹہ رسّی کی صورت بل کھا کر گردن کے گرد پڑا تھا اور کچے فرش پر انگشتِ شہادت سے وہ بار بار لکیریں سی کھینچنے لگتی اور ایسے میں نظریں تھیں کہ بار بار دیوار پر جا پڑتیں۔

ابھی ابھی زینت بوا اس کے پاس سے اُٹھ کر باہر گئی تھیں۔

وہ خوب جانتی تھی جو کھچڑی مودی آپا کے ہاں پک رہی تھی اس کا مطلب کیا تھا اور بے قرار میاں جس اُلجھن سے نکلنے کو ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اس کی نوعیت سے بھی آگاہ تھی غضب یہ تھا کہ میاں اعظم کے بعد اب جیسے ساروں کا فکر اسی کو رہ گیا تھا اور فکر بھی ایسا کہ اس سے کچھ پوچھنا گویا ایسا گناہ تھا جو سرد ہو جاتا

تو جانو اسلام خطرے میں پڑ جاتا!

یہ جو سارے ہمدرد گھُس پھُس میں لگے تھے اس کی ابتدا کہاں اور کیسے ہوئی اب وہ کیا کیا سوچتی۔ سچ پوچھو تو جب سے اس نے ہوش سنبھالا یہی کانا پھوسی دیکھتی چلی آ رہی تھی، بات کی گہرائی میں کچھ اندر جاؤ تو یہ پھنکارتی ہوئی سرگوشیاں اسی دن سے وجود میں آئیں جس روز اس نے آنکھ کھولی۔

مودی آپا تو اسے ناجائز اولاد سمجھتی تھیں جب انہوں نے ہی ایسا جانا تو پھر دیوار پرے والے کیوں نہ ہاں میں ہاں ملاتے۔ ساروں کا کہنا ہے۔ کہ اعظم میاں ولایت کیا گئے کہ گوری چمڑی والی میم سے آنکھیں چار کر بیٹھے۔ اے وہ کیا جانے کلمہ کیا ہے اور دین اسلام کس چیز کا نام ہے۔ نماز نہ روزہ، زکوٰۃ نہ حج، کسی بات کی تو خبر نہیں اور لے آئے گھر والی کی نشانی اک لونڈے ایسی بچی۔ سچ کی بات تو یہ ہے کہ بڑی ساری جائداد ورثے میں پائی تھی۔ سو گلچھرے اڑائے گئے، جو من میں آیا کیا۔ روکنے ٹوکنے یا پوچھنے والا کون۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ بیں ٹانگ اڑاتا؟

سچی بات پوچھئے تو ساروں پر میاں اعظم کا بڑا رعب تھا، زندگی میں تو کبھی کسی نے چوں نہ کی۔ مودی آپا کبھی کبھار ناک بھوں چڑھا کر کوئی تیر یا سڑا جملہ کہہ دیتیں تو وہ یوں نظر انداز کر دیتے کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتیں اور پھر منہ کا مزہ بدلنے کو حج کرنے کی ٹھان لیتیں مگر پردین کی پیدائش کے سوا سال بعد ہی ستم یہ ہوا کہ اعظم میاں نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موندلیں اور بن ماں کی بچی انگوٹھا چوستی رہ گئی!

ستمبر کا مہینہ واقعی ستم گر بن کر آیا۔

یوں بچی کو سنبھالنے والے بہتیرے تھے، خیر سے سگی پھوپھی اماں بھی تھیں مگر اس ننھی سی جان کے ساتھ ڈھیر ساری جائیداد کی چمک کچھ اتنی تیز تھی کہ ادھر ادھر سارے آن اکٹھے ہوئے۔ قریبی رشتے داری جتانے کو سبھی نے لیاقت بگھاری۔ ہر ایک اپنی پوری قوت سے چیخا چلایا۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی گئیں۔ ایک پڑھے لکھے لائق میاں نے اپنی بیگم سمیت بچی کے سر پر ہاتھ بھی رکھ دیا۔

مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور رہا۔ ان کی بیوی کو بناؤ سنگھار کچھ زیادہ ہی مرغوب تھا اور غرارہ پہننے کی تو اتنی شوقین تھیں کہ نت نئے فیشن کے غرارے دیکھ کر مودی آپا کا منہ کڑوا ہونے لگا۔

جانے ان کے غرارے کو کس کی نظر کھا گئی کہ کچھ عرصے بعد وہ شوہر نامدار جس کی بند مٹھیاں دیکھ کر دیوار پرے والے سہم سہم جاتے اپنوں ہی کی سازش کا شکار ہو گئے اور ایک بار پھر ساروں کو پروین کے سر پر ہاتھ دھرنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ فاطمہ آپا تک گو دھیلائے پھس پھس کرتی دوڑی آئی اور ایک وہ لاغر سا بوڑھا جو خود کو سب کا غلام کہتے نہ تھکتا۔ ساتھیوں سمیت پہنچا۔ بڑی بوا کاہے کو پیچھے رہتیں وہ بھی اس دوڑ میں شریک ہوئیں اور عالیہ بوا ساری جائیداد کا حساب کتاب انگلیوں پر گنتی اور اعداد و شمار سے خود کو جائز قرار دیتے دیتے ایک دم سے اتنے ساروں کی ہڑبونگ دیکھ کر کچھ اتنی نڈھال ہوئیں کہ مستقبل کے پروگرام کا خاکہ دھندلانے لگا۔ پھر مرزا جی اپنی بیگم کا بازو تھامے بھاگے آئے اور مودی آپا کو ٹھینگا دکھاتی بیگم نے پُرسوز لہجے میں گانے کی کوشش کی تو نفرت سے منہ سکوڑ کر آپا مودی نے اپنے طور پر طنز کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا:

"اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک!"

اُنھوں نے گانے کی کوشش فوراً ترک کر دی۔ عالیہ بوا کو البتہ ترس آیا اور کچھ دیر کو اس کا جی بہلایا اور ہمدردی میں بڑی بوا کو کہا۔ "وہ بے چاری گانا تو الگ رہا، ایک شعر بھی سلیقے سے نہ پڑھ سکتی تھیں۔"

مرزا جی اپنے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھامے اس کا جی بہلانے کی کوشش کرتے رہے پر وہ مزاج کی ذرا تیز تھیں، اپنے پہ چوٹ نہ برداشت کر سکیں اور پھر تو وہ ساز نشیں ہو گئیں کہ اللہ کی پناہ!

پھوپھی اماں کبھی کبھار جب بات برداشت سے باہر ہونے لگتی تو چیخ کر سمجھانے کی کوشش کرتیں مگر نقار خانے میں کس کی آواز سنی جاتی ہے؟

دیوار پرے والوں سے تو کب کی ٹھن چکی تھی وہ مزے سے تماشہ دیکھا کرتے اور زیرِ لب مسکراہٹ قہقہوں کے روپ میں ڈھلا کرتی اور اکثر وہ اپنا صندوق کھول کر دھوپ دکھانے کے بہانے شال لا کر سامنے دیوار پر ڈال دیا کرتے اور ادھر لڑنے جھگڑنے والے وقفے وقفے سے للچائی نظروں سے اس کو گھور کر رہ جاتے۔

اس شال کا بھی عجیب قصہ تھا۔

اس خاندان میں بڑی پرانی چلی آ رہی تھی۔ یوں سمجھو کہ جب بھی اس گھر کا وارث پیدا ہوا اس کی پیدائش پر اسے اس قیمتی شال میں لپیٹا گیا اور اعظم میاں تک کو اس پر بڑا ناز تھا۔

مگر جب بیچ میں دیوار کھڑی ہوئی تو دیوار پرے والوں کے ساتھ اس شال کا تنازعہ شروع ہو گیا اور جب اعظم میاں کی آنکھیں بند ہوئیں تو یہ جھگڑا کچھ اور بھی بڑھ گیا۔

دراصل ستمبر کے مہینے میں جب سارا گھر اعظم میاں کی جدائی میں جمع ہو کر اشک بہا رہا تھا کسی کو دھوپ میں پڑی اس شال اور دوا اور ضروری کپڑوں کا خیال نہ رہا۔ سبھی تو جیسے ان قیمتی چیزوں کو بھولے ہوئے تھے!

دیوار پرے والوں کا جی للچایا۔ سوتیلے تھے تو کیا ہوا۔ کسی نہ کسی طرح اپنا حق تو جتایا جا سکتا ہی ہے سو آؤ دیکھا نہ تاؤ دوا اور قیمتی کپڑوں کے ساتھ شال بھی دیوار پرسے گھسیٹ لی۔ ادھر جانے کس کی نظر پڑی اور کوئی چلّایا "ارے ذرا لینا پکڑنا۔ وہ شال لے چلے۔ آ"

عالیہ بوا کا کہنا ہے۔ ادھر کسی نے شال نہیں پکڑی ورنہ دشمن کیوں کامیاب ہو جاتے، وہ تو اتفاق سے اس طرف لگی ایک کیل میں شال اُلجھ گئی تین حصے وہ لے گئے ایک حصہ کیل سے لٹکا جھولتا رہ گیا۔ اب کیل نہ ہوتی تو ساری شال ہاتھ سے گئی تھی!

مگر بڑی بوا کا کہنا تھا کہ اُنھوں نے شال گھسیٹتے دیکھا ادھر سے پلو پکڑ لیا۔ اور پھر وقتی طور پر تیز ہوتے جذبات کو آسودہ کرنا چاہا۔

تو اب شال تب سے اسی حالت میں دونوں طرف والے لئے بیٹھے تھے۔ تین حصے اُدھر اور چوتھا حصہ اِدھر اور کوشش دونوں طرف سے برابر یہ تھی کہ کسی ایک طرف پوری پوری شال آئے اور صندوق میں سما جاتے۔

ابھی اسی کشمکش میں کچھ وقت گزرا تھا کہ دشمنوں کی نظر لگ گئی اور سر پر وہ عذاب نازل ہوا کہ جسے اب سارے یاد کر کے توبہ توبہ کرتے ہیں۔

بات کچھ یوں ہوئی کہ اعظم میاں نے جائیداد کی دیکھ بھال کو ایک منشی رکھا تھا۔ نوجوان سا گورا گورا خوبصورت سا پٹھان، سبھی کو اس پر اعتماد تھا خاں میاں خاں میاں

کہتے کہتے سبھی کا منہ خشک ہوا جاتا اور وہ بھی ہر ایک کے آگے مسکین بنا جی حضوری کئے جاتا مگر وہ بڑا کائیاں نکلا!

سبھی اس کی طرف سے بے فکر بیٹھے تھے، یوں بھی اس پر بھروسہ کرنا ہی پڑتا تھا کہ ساری جائیداد کی تفصیل وہ خوب جانتا تھا۔ زمینوں کی آمدنی ان کا خرچ، مزارعوں کی باز پرس اور دیوار پرے والوں کی ندیدی نظروں کو گھور کر للکارنا اسے سبھی کچھ خوب آتا تھا۔

ناظمہ آپا سے لے کر عالیہ بوا تک اور بڑی بوا سے لے کر مرزا جی اور ان کی بیگم سبھی ان کی جانفشانی کے قائل ہو رہے تھے۔ اسے بلاتے پاس بٹھاتے حساب کتاب پوچھتے، حال احوال پوچھتے، شاباشیاں دیتے اور یوں ان کا حوصلہ بڑھتا چلا گیا۔

حوصلہ کچھ اتنا بڑھا کہ پھر اس کا جی گیارہ برس کی بردین کی حالت پر بڑا کڑھا!

اس کا کہنا تھا کہ وہ تو اس بن ماں باپ کی بچی کا ہمیشہ سے خیر خواہ ہے۔ اس کی پیدائش سے لے کر اس کے گیارہ برس تک کی ہونے کے سارے حالات وہ خوب جانتا ہے۔ جو جو ستم اس ننھی سی جان پر کئے گئے اس نے دیکھے اور صرف دیکھے ہی نہیں اچھی طرح سے جانے حتیٰ کہ کئی بار ایسا وقت بھی آیا کہ مرزا جی نے خود بُلا کر اسے جائیداد کی آمدنی میں حصہ دار بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔

میر خاں کا کہنا تھا کہ وہ پکا مسلمان تھا۔ دیندار تھا اور ایسی دھاندلی اسے بالکل پسند نہ آئی اور صاف انکار کر دیا۔

ایک بی بی کا کہنا تھا کہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ اصل میں وہ بی بی کہ جسے گانا تو ایک طرف رہا شعر پڑھنے تک سلیقہ نہ تھا۔ خان کی بڑی مداح تھیں اور یہ کہتے وقت ان بی بی کی آنکھیں چمکتیں تو بڑی بوا کی باچھیں کھل جاتیں اور پھر ہونٹوں پر بڑی گہری اور

زہریلی مسکراہٹ پھنکارنے لگتی۔

قصہ مختصر یہ سمجھو کہ ایک دن جب اس نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ اب اندرونِ خانہ ہر راز جاننے کے بعد وہ ہر اہم بات کا اہل بن چکا تھا۔

گیارہ برس کی پروین جی کو کچھ اتنا بھائی کہ وہ بے اختیار ہو گیا

جس نے سُنا دنگ رہ گیا۔ پھر بہت جلدی ایسے پیلے پھٹک، اتنے اتنے سے منہ نکل آئے۔ لو جی دیکھ لو یہ انجام ہوتا ہے بے اتفاقی کا، ہر دل اپنے آپ میں کڑھا اپنی اپنی استعداد پر غور ہُوا اور پھر ہولے ہولے دن گزرنے لگے تو خان کو خوش کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔

پہلے پہل تو پھوپھی اماں تک نے کہہ دیا۔" اسے جو ہُوا اچھا ہُوا۔ میں تو پہلے ہی خبردار کئے دیتی تھی کہ ہوش کے ناخن لو ـــــ کیوں آپس میں جو تم بیزار ہو رہی ہو ـــــ پر میری کون سُنتا ہے جوتیوں میں دال بٹ کے رہی۔ بہرا اب بھی سنبھل جاؤ۔ چلو اب بھی کچھ نہیں گیا۔ دیر ہوئی اندھیر نہیں ہوئی!"

لیکن پھر دیر کے ساتھ ساتھ اندھیر بھی ہو گئی!

سب سے پہلے یہ بات جس نے کی، اسے خود اپنے آپ پر اعتبار نہ تھا۔ ہے ہے گیارہ سال کی ناسمجھ کے ساتھ یہ ظلم!؟ توبہ! توبہ!

پھر عالیہ بوا نے سر اٹھایا اور یوں بھی ان کا ذہن کمپیوٹر کی طرح حساب کتاب میں بڑا ماہر تھا۔ جو جو دن گزرتا وہ خان کے گھر میں جمع ہوتا دھن حساب کے نقطوں کی صورت ان کے ذہن میں ڈھلتا اور وہ پھر سب کے عین درمیان بیٹھی اپنی انگلیوں کی پوروں پر تیزی سے گِنا کرتیں ـــ" ایک دو ـــــ تین، ہزار، لاکھ ـــ لاکھ۔ کروڑ ـــ کروڑ!"

لاکھ کروڑ کی باتیں سُننے والے کہتے عالیہ بوا کا دماغ چل نکلا ہے اور خوب ہنستے مگر پھر ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔

انہی دنوں کام کچھ اتنا پھیلا کہ بے چارہ خان تنہا کیونکر سر انجام دیتا۔ سو اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑانی شروع کر دی۔

اُس کی نظروں میں آنے کو سب دوبارہ پر تولنے لگے حالانکہ وہ ان سب کی اُمیدوں پر گھڑوں پانی بہانے کے بعد خوب کھل کھیلنے لگا تھا۔

مودی آپا مایوسیوں میں گھِر کر دو ایک بار اور حج کر آئی تھیں اور اب جائے نماز پر بیٹھی ناک بھوں چڑھایا کرتیں عالیہ بوا ابھی تک اپنے طور پر حساب کتاب میں اُلجھی بیٹھی رہتیں، بڑی بوا ناظمہ آپا کے سنگ مرزا جی کو ولایت خط پر خط لکھا کرتیں، وہ تو کبھی کے یہاں سے سارے رشتے ناطے توڑ کے سمندر پار جا بیٹھے تھے، عالیہ بوا کبھی کبھار چونک کر بتایا کرتی تھیں کہ ان کے خرچے پورے نہیں ہوتے وہاں ماما گیری کرے ہیں۔ اللہ! اللہ دیکھ لو بدلتے زمانے کا عالم!

پھر خاں بابا کے اِرد گرد نئی نئی شکلیں گھیرا ڈالنے لگیں، انہی میں ایک نوجوان باہر کے کام کرنے پر مامور ہوا۔ نک سک کا اچھا، جوانی کے خون کی لالی سانولے سے چہرے پہ سمٹے کئی ایک کو وہ بڑا بھلا نظر آتا۔ بڑی بوا کو اِک بار اک ہمدرد بی بی نے کان میں پھونکا۔
"خان کے اپنوں میں سے ہوگا"

کسی نے ہولے سے سرگوشی کی "پروین بھی تو خیر سے جوان ہو رہی ہے"
سبھی کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ یہ خاں بابا کیا کرنے لگا۔

پھر اِدھر اُدھر پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ معلوم ہوا نام تو کچھ اور تھا مگر تخلص بے قرار تھا۔ خون بھی گرم گرم تھا اور رہتا بھی ہر دم پارے کی طرح بیقرار تھا۔ باہر کے کاموں میں

بڑا ہوشیار اور خان بابا کے خلاف کوئی بات سننے کا تو بالکل روادار نہ تھا۔ جو کچھ کہنے کو کوئی آگے آتا تو جھٹ سے قمیض کی آستین چڑھا مقابلے کو تیار ہو جاتا۔

پھیلوں کے بارے میں تحقیق ہوئی تو خبر ملی کہ کسی سے کم نہ تھا۔ اینٹوں کے کئی بھٹوں کا تن تنہا مالک تھا اور پھر کیا تھا سبھی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے خان بابا نے پردیں کا بر تلاش کر لیا ہے۔

لیکن زمانے کی رفتار دیکھو، اِدھر بر ملا اُدھر آسمان بدل گیا۔

بات کچھ یوں ہوئی کہ مودی آپا کی ایک جاننے والی جو پردیس سے آئی تھیں ایک دن دیوار پرے والے گھر گئیں۔ دراصل وہ شال کے جھگڑے کو نپٹانے کی کوشش میں ہی پھیرے پہ پھیرے ڈال رہی تھیں کہ وہاں سے یہ بات سُن کر حیران پریشان سراسیمہ ہو کر بھاگی بھاگی مودی آپا کے ہاں آئیں۔

مودی آپا اس وقت قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھیں۔

حیران پریشان بی بی سینے پر ہاتھ مار مار کر وہ راز دبانے کی کوشش کرنے لگیں۔ مگر کب تک یہ کوشش ہوتی؟ پیٹ میں ڈھیر سارا درد اُٹھنے لگا۔ "اب مودی آپا کچھ سنو گی بھی کہ نہیں؟"

"کاہے کو مری جاتی ہو۔ دیکھتی نہیں یہ آیت ختم کر لوں"

"اے خوب دیکھ رہی ہوں بس اب تم یہ سلسلہ ختم کرو اور میری سنو"

مودی آپا اس بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتیں مگر ان بی بی کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ اس وقت جو بات تھی وہ کچھ زیادہ ہی اہم تھی۔ سو جلدی سے فارغ ہو کر پوچھنے لگیں "کیا ہوا جلدی بولو"

"یہ پوچھو کیا نہیں ہوا۔ اے بی یہ پوچھو کہ پچھلے چھ برسوں سے کیا کچھ نہیں ہو رہا!!"
اے ہمیں تو بس یہ خبر ہے کہ میاں بیقرار کو جلیبی کچھ زیادہ ہی پسند ہے سو بازار میں
مٹھائیوں کا بھاؤ۔۔۔۔" وہ تیزی سے بات کاٹ کر بولیں "بس بُوا تمہیں ہوا کیا ہے؟ کیوں
کنوئیں کا مینڈک بنی جا رہی ہو؟"

"تو پھر تم ہی بتاؤ دیر کیوں لگاتی ہو؟" مودی آپا کا سانس پھول گیا
"کیسے بتاؤں توبہ توبہ۔"

"اے اب کہہ بھی چکو۔ کیوں میرے دل کو دہلائے جاتی ہو؟"
"تمہاری قسم کس منہ سے کہوں! میں تو سنتے ہی دم بخود ہو گئی۔ بات کروں تو کیسے؟"
مودی آپا کو آگ لگ گئی۔ "میں کہوں بس تمہاری یہ بات اچھی نہیں۔ خواہ مخواہ مجھے
کوفت پہنچانے لگی ہو۔ اچھی طرح خبر ہے تمہیں، مجھ سے یوں پہیلیاں نہیں بوجھی جاتیں"
"اے بی وہ اپنی پروین کی بات ہے۔" وہ پھر رک گئیں۔
"اللہ اب کہہ بھی چکو۔" مودی آپا نے زچ ہو کر کہا۔ "تمہیں میری قسم!"
"ہائے! ہائے!" ٹھنڈا سانس بھر، وہ بی بی بولیں "بس یوں سمجھو کہ پروین کو خان
نے کہیں کا نہ چھوڑا!"

"ایں؟" مودی آپا نے بیچ ضبط کی
"کہنے والے نے تو قسم کھا کر کہا ہے کہ گیارہ برس کی بچی پر ہی یہ ظلم ہو گیا۔ اب تو خیر
سے سترہ برس کی ہو گئی ہے۔"
"ایں؟" آپا مودی کی پتلیاں پھیلیں "میں پوچھوں۔ اللہ قسم! ایں سچ کہو تمہیں
میرے سر کی قسم!"

ان بی بی نے آنکھوں پر پلو رکھ لیا۔ "میں کس منہ سے کہوں اے اعظم میاں کے بعد یہ حشر ہونا تھا۔ سچی آپا۔ یہ کیا اندھیر ہوا؟"

مودی آپا اس ظلم کا جان کر دہل گئیں بلکہ یوں سمجھو کہ انہوں نے جس کسی کو بتایا وہ پھٹی پھٹی آنکھیں لیے دانتوں تلے انگلیاں دبا تا رہ گیا۔

"نکاح ہو جاتا تو پھر بھی تھا" عالیہ بوا نے آنکھوں پر عینک جماتے ہوئے کہا۔

"ہے ہے معصوم پر یہ ستم! توبہ توبہ!"

یہ انکشاف سرگوشی کی صورت ابھرا اور پھر شعلوں میں ڈھل کر پھیلنے لگا۔ ساروں میں پھٹس پڑ گئی۔ سفید روئی ایسے سر کھچڑی بالوں بھرے سروں کے ساتھ جڑنے لگے۔ ناظمہ آپا، دولتے بی بی، عالیہ بوا اور دوسرے سب جو خود آپس میں ٹھن چکنے کے بعد ٹوٹی مالا کے موتیوں کی صورت بکھر چکے تھے اب اس آگ کی لپیٹ میں آئے کہ پلاسٹک کی طرح سکڑنے اور پیچ کر دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ آن لگے۔ یہ انکشاف جیسے وہ دھاگہ بن گیا جس نے دوبارہ انہیں ایک دوسرے کے قریب لا کر سی دیا۔

بہت سوچا مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ کریں تو کیا کریں۔ ہے ہے مسلمان کے گھر میں یہ ظلم۔ یہ تو کافروں سے بھی گئے گزرے ہو گئے۔

پھر سب کے سب برقعے اوڑھ پھوپھی اماں کے ہاں پہنچے،

وہاں کا حال نہ پوچھو تو اچھا ہے۔ ناظمہ آپا نقاب اٹھاتے پھنک پھنک کر روئیں۔ مودی آپا کا مارے ہچکیوں کے برا حال ہوا۔ وہ جو ہمیشہ مرد کی رائے کو ترجیح دیا کرتی تھیں، اس بڑے وقت میں پھوپھی اماں میں مردانگی ڈھونڈنے لگی تھیں، عالیہ بوا پوروں کو گن گن اور عینک سنبھالتے بے حال ہوئیں اور پھر بڑی بوا تک نے دو چار آنسو ٹپکائے

اور رو دلتے بی بی نے سرگوشیوں کا آغاز کیا۔

ہولے ہولے سب کاروتا دھوتا تڑپتے ہوئے لفظوں میں ڈھلا اور پھوپھی اماں کو بتایا گیا کہ بد نیت خاں نے معصوم کو زبردستی اپنی ہوس کا شکار بنا لیا تھا۔

ہر دن اس مظلوم پر نیا دُکھ لے کر آتا ہے اور سگے ہیں کہ اپنے اپنے جھگڑوں میں بے حال ہو رہے ہیں۔

ان کا خیال تھا کہ پھوپھی اماں کو اس واردات کی خبر ہی نہ تھی۔

پھوپھی اماں کی آنکھیں غصّے سے کھلیں اور تب انھوں نے بتایا کہ "اری کمبختو! مجھے تو یہ سب معلوم ہو چکا ہے میں تو اس انتظار میں تھی کہ تمہاری آنکھیں کھلیں تمہیں کچھ سمجھ میں آئے تو پھر سب مل کر اس کے تدارک کا بندوبست کریں۔!!"

"تو پھر اب کیا کیا جائے؟" کئی آوازیں بیک وقت اٹھیں۔

پھوپھی اماں دیر تک سفید سر پر دایاں ہاتھ رکھے سوچ میں ڈوبی رہیں۔ اور گلے میں پڑی سفید موتیوں کی مالا کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے مسلتے وہ افسردگی سے سر ہلاتی رہیں۔

"میرا خیال ہے حقّہ پانی بند کر دو اس کا۔" نصیراں بی بی پہلی بار بولیں۔ انھیں حقّہ پینے کا بھی شوق تھا۔

"بے وقوف نہ بن۔۔۔۔" مودی آپا نے ڈانٹا۔

"اے تو کیا وہ حقّہ نہیں پیتا؟" عالیہ بوا نے معصومیت سے پوچھا تو پھوپھی اماں کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لیں۔ "میں کہوں محموداں" انھوں نے مودی آپا کو مخاطب کیا۔ "تو جو اتنی عالم فاضل بنی رہتی ہے تو کچھ انہیں بھی عقل دی ہوتی۔!"

"اے پھوپھی اماں!" مودی آپا کی آنکھیں بھر آئیں"۔ مجھے کیا کہتی ہو میں تو آپ بیزار بیٹھی ہوں۔ یہ نگوڑیاں مجھ ہی کو کوستی رہتی ہیں کہ یہ تو پروین کی پیدائش ہی سے اس کے خلاف ہے"۔

"بھئی سچی بات کو جھٹلانا کیا" دولتے بی بی بولیں"۔ جب سے اعظم میاں سمندر پار گئے ہیں تو تم ہی نے تو مخالفت کی تھی..... "

"بس رہنے دو بڑی آپا" مودی آپا نے تنک کر کہا" گزری باتیں مجھے تو یاد نہیں جانے تم کون سی بات کہاں سے لے اُڑتی ہو۔ بغیر سیاق و سباق کے خاک معلوم ہوتا ہے اصل بات کیا ہے؟"

اب ناظمہ آپا بڑھے ہوئے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بولیں"۔ چلو جانے دو پُرانے گڑے مُردے اکھیڑنے سے فائدہ؟ اب تو یہ سوچنا ہے کہ معصوم کو اس کے پنجوں سے کیسے نکالیں!"

"معصوم کی فکر کسے ہے؟" پھوپھی اماں نے غصّے میں سچ بات کی"۔ سبھی کو اپنی اپنی ہانڈی روٹی کی فکر ہے"۔

سبھی نے نظریں نیچی کر لیں۔

"اب غصّہ تھوک دو پھوپھی اماں"۔ ناظمہ آپا نے التجا کی۔

" ورنہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے"۔ عالیہ بوا ہمت کر کے بولیں۔

خاندان میں جو مٹی سٹری ہوگی وہ الگ اور جو تھو تھو پکار پڑ رہی ہے وہ علیحدہ..."

ایک بی بی اور بولیں۔

"میں اور کیا کر سکتی ہوں" پھوپھی اماں نے کانپتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے پوچھا

"تم سب کچھ کر سکتی ہو۔ سب تمہیں جانتے ہیں پھوپھی اماں"۔ ناظمہ آپا بولیں"۔ آؤ

معصوم کو بچالو!"

"میری رائے بھی یہی ہے"۔ دولتے بی بی ناک پہ اُنگلی دھر کر بولیں۔

"بے چاری پر بڑا ظلم ہو رہا ہے"۔ عالیہ بوا بولیں "بس خوب جانتی ہوں۔ وہ بالکل معصوم ہے"۔

"گیارہ برس کی عمر میں اسے بھلا دنیا کی اُونچ نیچ کی کیا خبر تھی"۔ مودی آپا سر پر پلو لے کر ہولے سے بولیں "وہ کس سے فریاد کرے؟"

پھوپھی اماں کا دل بھر آیا۔

اب سب کے ہلتے ہوئے سر دوبارہ جڑ گئے اور پھر سرگوشیوں میں تدابیر پر تبادلۂ خیال ہونے لگا۔

آخر میں فیصلہ ہوا کہ پنچایت بلائی جائے۔

اس فیصلے کے بعد معلوم ہوا کہ پنچایت بُلوانا کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہ تھا۔ ناظمہ آپا، مودی آپا، دولتے بی بی اور عالیہ بوا وغیرہ سے کئی ایک خفا تھے۔ کئی بڑے بزرگ ان عورتوں کے کرتوت خوب جانتے بوجھتے تھے۔ اور بے حد نالاں تھے۔ کئی ایک تو ان کی رگ رگ سے واقف ہونے کے ناطے خان بابا کو سچّا اور مسلمان جانتے تھے۔

لیکن پھوپھی اماں ایک ایسی ہستی تھیں کہ جن کے سفید بالوں اور بڑھاپے کا ہی سب کو پاس تھا اور جب انہوں نے ان عورتوں کا ساتھ دیا تو کئی بزرگ ان کا اعتبار کرنے لگے۔ اسی اثنا میں ناظمہ آپا کا انتقال ہو گیا۔ تو کئی ایک ہمدردی میں ساتھ دینے لگے۔

ادھر بے قرار میاں کو جب اس سازش کا علم ہوا تو خان بابا کے کہنے کے مطابق انہوں نے ان کا توڑ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ "اچھے بھلے مرد کے منہ کو عورتیں آنے لگی ہیں۔ غضب خدا!"

اصل سچ بات یہ ہے کہ بے قرار میاں کو اپنے مالک پر پورا اعتبار تھا۔ اسے یقین تھا کہ پروین ایسی معصوم جس کی بدولت وہ ہر طرح سے صاحب الرائے بنا ہوا تھا خان بابا کے کسی ظلم کا شکار نہیں ہو سکتی۔ ادھیڑ عمر کا مرد اور اتنی سی بچی۔ قبر میں پاؤں لٹکانے والا اپنی عاقبت یوں خراب کاہے کو کرنے لگا۔؟

پنچایت بلوائی گئی۔ خوب شور مچا۔ بڑے بڑے حمائتی آئے دونوں طرف سے بڑی بڑی تقریریں ہوئیں اور جب پھوپھی اماں نے صاف صاف کہا کہ ان کو یقین ہی نہیں بلکہ اس بات کے شواہد بھی ہیں کہ خان بابا معصوم پروین کو اپنی ہوس کا شکار بنا رہا ہے۔ تو یوں محسوس ہونے لگا جیسے سب لوگ خان بابا کے مخالف ہیں اور سب ہی حق کا ساتھ دیں گے۔

پھر بحث شروع ہو گئی۔

خان بابا بھاگے پھرتے سب کو گلاب کے پھول پیش کرتے ــــ بے قرار میاں نے ان کے خلاف عاید کردہ الزامات کے جواب دیئے اور گرما گرمی میں بحث کا اختتام ہوا۔ بالآخر پنچایت نے آخری فیصلہ سنانا شروع کیا لیکن ابھی آغاز ہی ہوا تھا کہ بجلی فیل ہو گئی تب لالٹین کی روشنی میں پورا فیصلہ سنایا گیا جسے سنتے ہی مودی آپا دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں اور پھر ان کے رونے میں عالیہ بوا' بڑی بوا' دولتے بی بی اور سب ہی نے ساتھ دینا شروع کر دیا۔ رہ رہ کر ناظمہ آپا یاد آئیں۔ اچھا ہوا جو اس بُرے وقت کا منہ دیکھنے سے پہلے آنکھیں بند کر گئیں۔

ایک پھوپھی اماں تھیں کہ خاموشی سے سینے میں اُبلتے ہوئے جذبات دبا کر رہ گئیں اور آنکھوں میں ایک ذرا سا آنسو آیا تو اسے انھوں نے ضبط کر لیا اور لالٹین کی جلتی ہوئی بتی کو گھور کر دیکھنے لگیں۔ اس وقت منہ سے کچھ کہنا بیکار تھا۔ وہ جانتی تھیں اس

زمانے میں سونے کا ذرہ بھی سورج بن گیا ہے!!

ابھی خان بابا کے ہاتھوں زخم کھا کر کوئی سنبھلا بھی نہ تھا کہ ایک اور ظلم ہو گیا۔

دیوار پرے والوں نے شال کے تنازعے پر مشتعل ہو کر پروین پر حملہ کر دیا!!

غور سے سوچو تو یہ فساد یوں بڑھا کہ خان بابا کے ہاتھوں زخم خوردہ پروین دن بدن نڈھال ہو رہی تھی اور شال والے جھگڑے کی وقعت قدرے کم ہونے لگی تھی۔ کہ ایک روز دیوار پرے والوں نے شور مچا دیا کہ پروین دیوار پر سے چھلانگ لگا کر صندق تک پہنچی اور ابھی اس کا ڈھکنا اٹھا کر شال باہر نکالنے لگی تھی کہ انہیں خبر ہو گئی۔ سو انھوں نے اسے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کی دل دوز چیخیں سن کر اس کے حمائتی آ گئے اور یوں جھگڑا بڑھا۔

مگر جاننے والے جانتے کہ شال کے انتہائی قیمتی ہونے کے سبب ہر دو فریق اسے حاصل کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور اب پروین کو نڈھال دیکھ کر دیوار پرے والے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے انہیں اس طرف ہونے والے واقعات کی ساری خبر تھی۔ سو شال کا چوتھا حصہ بھی مل جاتے تو اور کیا چاہیئے۔

شال کا جھگڑا سب کے لئے انتہائی اہم تھا۔ سو ساری برادری نے اپنے اپنے جھگڑے بھول کر ایک جان ہو کر دیوار پرے والوں کا مقابلہ کیا۔

ساروں کا کہنا تھا کہ سب ہی نے مقابلے کا حق ادا کیا اور پھر انہی دنوں میں بے قرار میاں کو بھی معلوم ہو گیا کہ کہنے والے غلط نہیں کہتے تھے۔ خان بابا واقعی اس معصوم پر ظلم کر رہا تھا۔

یہ خبر یوں ہوئی کہ زخمی پروین سترہ گہرے زخموں کے مارے کراہتی اپنے پلنگ پر پڑی تھی کہ میاں بے قرار ڈاکٹر سے اس کے لئے دوا لے کر آئے اور اندر صحن میں

آکر دیکھا کہ سامنے کمرے کا دروازہ بند ہے۔

دھکا دیا دروازہ کھل گیا مگر.....

وہ دیکھتے ہی چکرا کر قدرے پیچھے کو ہٹے۔

خان بابا بے خودی کے عالم میں دنیا و مافیہا سے بے پرواہ بدیسی دارو کے نشے میں زخموں سے چور نازک سے بدن پر جھکا ہوا تھا۔

زخمی لہجہ فریاد میں ڈوب رہا تھا۔ "مجھے تنگ مت کرو بابا!"

"تنگ کدھر کرتا۔ تم تو میری جان ہے۔"

"تم نے کیا کیا ظلم نہ کئے ہیں"۔ سسکی سی اُبھری۔ "اب تو کچھ خیال کرو۔"

"ہم تمہیں خون و جگر سے پالتا، کیوں گھبراتا؟" خان بابا بولا

"مجھے چھوڑ دو۔" اس نے کسمسا کر اپنے آپ کو سمیٹنا چاہا۔ بھول ایسے چہرے پر بالوں کی لٹ بکھری پڑی تھی اور سینے کے اُبھار پر دو سفید کبوتر اپنی اپنی پیازی چونچیں چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ "مجھے چھوڑ دو خدا کے لئے!"

بے قرار میاں کا مارے غصے کے بُرا حال ہو گیا۔ سارے جسم کا گرم گرم خون پارے کی طرح چہرے پر آیا اور رخساروں پر مچلنے لگا، مٹھیاں بھینچ کر انہوں نے زور سے یا علیؑ کا نعرہ لگایا تو خان بابا کا سارا جسم کانپ گیا۔ گھبرا کر اس نے پروین کو چھوڑ دیا اور پلٹ کر بیقرار میاں پر حملہ آور ہوا۔

دونوں کو لڑتا دیکھ کر پروین سسکیاں لینے لگی اور اپنے نیم برہنہ جسم کو جس پر بڑے بڑے زخموں کے منہ کھلے تھے۔ ڈھانپنے کی کوشش کرتی کمرے کے کونے میں سمٹ کر لال لال جلدوں والی کتابوں کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

لڑائی ہوئی اور خوب ہوئی مگر بیقرار میاں کے ہاتھوں میں صرف دَوا کی شیشی تھی اور خان بابا نے لپک کر کمرے کے کونے میں پڑی سمندر پار بنی بندوق اپنے دائیں ہاتھ میں اُٹھالی اور بائیں ہاتھ میں وہ درانتی پکڑی جو ابھی پچھلے دنوں ایک مزارع نے اسے بطور تحفہ پیش کی تھی۔

ظاہر ہے شکست بیقرار میاں ہی کی ہونی تھی۔

رومال سے ماتھے سے ہار کا پسینہ پونچھتے وہ اس گھر سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئے تو راستے میں موری آپا مل گئی۔

دیوار پرے والوں کے ہاں جانے والی بی بی سے سارا حال سُن چکی تھیں۔ بڑی طنز سے مسکرائیں، بھتے کی اوٹ سے سلام کیا حال پوچھا اور یوں گویا ہوئیں یہ رومال کہاں سے لیا۔ بڑا قیمتی معلوم ہوتا ہے۔"

وہ کچھ نہ بولے تو پھر کہا کہ" میاں ہم تو پہلے ہی جانتے تھے تمہارا یہ حال ہوگا!"

ادھر پھوپھی اماں تھیں کہ سارا حال سُنا اور ضبط نہ کر سکیں پہلے ہی نیم مردہ ہورہی تھیں۔ اب جو ہر طرف سے اٹھتی ہوئی سرگوشیوں کی بھنکاروں میں گھیریں تو دل ہی دل میں پروین کو ظلم کے شکنجے سے بچانے کی آرزو لئے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔

پھر ہولے ہولے دن سرکتے چلے گئے۔

پروین نیم جان سی کمزور کمزور پیلے چہرے کے ساتھ اُٹھ کر برآمدے میں آن بیٹھی۔ مٹی کے تیل والا چولھا جلا کر خان بابا کے پیٹ بھرنے کا سامان تیار کرتی اور کھانس کھانس کر بے حال ہو ہو جاتی اور پکے فرش پر ڈھے جاتی۔

دیوار پرے والے خوش ہو ہو کر لڈو بانٹتے کہ پھر سُنا ان کے ہاتھ بھی ایک پروین ایسی

لڑکی آگئی ہے جو زخموں سے چور بھوک کے مارے بلکتی آہیں بھرتی رہتی ہے اور وہ ہیں کہ شال کے ذریعے اسکے زخموں کو ڈھانپنے کی کوشش کرتے کرتے تنگ آچکے ہیں۔

مودی آپا کو یہ سُنا کر عالیہ بوا بولیں " میرا تو خیال ہے اب اللہ اللہ کیا کروں ہر وقت حساب کتاب کرتے رہنے کی عادت نے دماغ شل کر کے رکھ دیا ہے۔"

پر مودی آپا کے تو عزائم ہی کچھ اور تھے " ابھی سے جی ہار بیٹھیں! تم نے ساتھ نہ دیا تو کون ہاتھ تھامے گا۔؟"

" اے اب تو میاں بیقرار بھی تمہارے ساتھ ہیں "

" لو اور سنو " مودی آپا ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں " مجھے تو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا میاں!"

" اے وہ کیوں؟"

" اے بوا۔ مجھے تو اس کی یہ چینی پسند کرنے والی عادت بالکل پسند نہیں غضب خدا کا زیادہ چینی کھاؤ تو شگر کی بیماری ہونے کا احتمال رہتا ہے۔

" کمال ہے مودی آپا " عالیہ بوا بولیں " پر میں تو تھک چکی ہوں "

" تھکاوٹ کی بات چھوڑو " مودی آپا ہمدردی سے بولیں " اے میری مانو تو اس گنہگار کے لئے لو۔ اللہ مدد کرے گا؟"

انہوں نے گنہگار کے لئے کیا لینے تھے۔ وہ تو اللہ نے ایسا سامان کر دیا۔

بیقرار میاں کا تو یہ حال تھا کہ گھر کے بھیدی تھے اس ڈر سے کہ کہیں لنکا نہ ڈھا دیں خان بابا نے دو ایک بار بلوا کر اندر ہی اندر معاملہ طے کرنا چاہا مگر پارے کی طرح مچلتا دل تھا۔ کہ ہر لمحے اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کو سوچا کرتا۔ یوں بھی دل کو پروین اتنا بھائی تھی کہ اب سوائے اس کے کچھ اور سوجھتا بھی نہ تھا۔

وہ معصوم سی صورت، غم اور دُکھ تلے زرد زرد سی، نوخیزی کی چمک اور بجھتی ہوئی راکھ تلے انگاروں ایسی آنکھیں۔ لمبی لمبی مگر اجڑی ہوئی پلکیں اور سوکھے سوکھے سے ہونٹ جن کی بناوٹ اپنی مثال آپ ہے۔ بیقرار میاں کے ذہن میں اس کا ہر انداز جھلک دکھاتا اور چھپ جاتا ان کی بیقراری بڑھنے لگی۔

یوں بھی جب تصور ہی تصور میں وہ پروین کے سر پر دوپٹے کی جگہ پوری شال اوڑھی دیکھتے تو بے اختیار دل سے ہوک نکل جاتی۔ حسن کچھ اور بھی نکھر جاتا۔!

گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے پر کمربستہ ہو گیا۔ بے قرار میاں نے باقاعدہ خان بابا کی حرکتوں کی ٹوہ لینی شروع کر دی اور پھر وہاں کے واقعات کا جب اپنے خاص انداز میں ذکر شروع کیا تو جو سنتا بس سنتا ہی رہ جاتا خان بابا کے ڈھول کے پول کھلنے کی دیر تھی کہ دھاگوں کے گولے کی طرح وہ کھلتے چلے گئے۔

شال کے جھگڑے میں بیقرار میاں نے جو کردار انجام دیا تھا وہ سب کی نظروں میں تھا۔ سوائے اس ایک بی بی کے جو دیوار پرے والوں کے ہاں آ جا کر جھگڑا نپٹاتے نپٹاتے جھگڑے کی شدت میں اپنی ستّی گم کر چکی تھیں۔ سب ہی سر آنکھوں پر بٹھانے لگے تھے۔

بیقرار میاں کی کوششیں رنگ لائیں۔ خان بابا کے خلاف ایک طوفان تیزی سے اُٹھا اور پھر جیسے چاروں طرف سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

ادھر بے قرار میاں کی پاٹ دار آواز تھی کہ نعرے پر نعرہ لگ رہا تھا۔

ادھر ناظمہ آپا کے جانشین مودی آپا کے ساتھ آ ملے۔ عالیہ بوا آئیں دولتے بی بی لٹک لٹک کر مشورے دینے کو موجود ہو گئیں بصیراں بی بی تو اپنے سمیت

بیقرار میاں کی مدد کو آئیں۔ اور تو اور اصغری خانم جو کسی زمانے میں خان بابا کی معتقدوں میں تھیں، کچا چٹھا جان کر اپنے میاں سمیت بیقرار میاں کی مدد کو آئیں۔

بڑی بوا، بڑی بی، بڑی چودھراین اور سب ہی دوسرے سروں نے اٹھ اٹھ کر چلانا شروع کر دیا، بقول بیقرار میاں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جنگل میں شیر کے مرنے پر ہر طرف سے کیڑے مکوڑوں نے یلغار کر دی ہو۔

اسی یلغار میں خان بابا کا دم گھٹ گھٹ گیا۔

اک صبح سب کو پیغام آیا، میزوں کے گرد بیٹھ کر دعوت اڑانے کی درخواست، بھنوں کے نتھنوں میں قسم قسم کے کھانوں کی مہک اٹھی، مودی آپا سمیت کئی ایک سگھڑ بیبیوں نے جلدی جلدی نئے سوٹ سلوائے، رنگ برنگ دوپٹے اوڑھے اور بے سوچے سمجھے دعوت میں شریک ہونے کو بھاگے۔

نہ گئے تو ایک بیقرار میاں اور ان کے رفیق لاثانی۔

دعوت سے بھی کوئی بھرم نہ رہ سکا تو ایک صبح مودی آپا یہ جان کر دم بخود ہو گئیں کہ خان بابا ہتھیار ڈال گئے۔!

"خان بابا بھاگ گیا!" ایک ساتھ کئی آوازیں اٹھیں۔

جانے کہاں گیا۔ کوئی کہتا اپنے شہر میں واپس بھاگ گیا۔ جہاں سے خیمہ اٹھا دیں پر خاک سمانے کو چل دیا۔ کہاں گیا کدھر گیا کب گیا کے شور میں عالیہ بوا کو فکر ہوا کہ وہ گیا تو خیر اسے جانا ہی تھا مگر اب پروین کہاں ہے؟

سارے کے سارے برقعوں میں لپٹے لپٹائے، شالیں اوڑھے، رنگین دوپٹوں کو لہراتے پروین کے سر پر اپنے ہاتھ دھرنے دوڑے۔

مگر گھر کے باہر ہی روک دیئے گئے۔

خان بابا جاتے جاتے اپنے ایک بھائی ذکریا کو پروین کے پہرے پر چھوڑ گیا تھا!!

گھر کی دہلیز پر قدم دھرنے کا ارمان پورا ابھی نہ ہوا تھا کہ سینے میں گھٹ کر رہ گیا۔ کولہوں پر ہاتھ دھرے منہ لٹکا کر کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ چوڑی چھاتی تانے انہیں روکے ہوئے کہہ رہا تھا" فکر مت کرو۔ پروین خیریت سے ہے۔ ہم اس کی مدد کرے گا!"

عالیہ بوا نے وہیں پر ماتھا تھام لیا اور صاف کہہ دیا" اے مودی آپا! مجھ میں تو اب بالکل ہمت نہیں ـــــ میں تو گھر چلی۔ اللہ اللہ کرنے کے دن آ گئے۔"

اصغری خانم نے فوراً ہی ساتھ دینے کا ارادہ ظاہر کیا مگر مودی آپا کی سُرخ سُرخ آنکھیں دیکھ کر فوراً ہی توبہ توبہ کر کے دوبارہ ہاتھ تھام کر کھڑی ہو گئیں۔

یوں بھی ابھی انہیں اس خارزار میں قدم دھرے دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ کہ توبہ توبہ کر لیتیں؟

باہر تو یہ حال۔ اور اندر صحن میں پروین مٹی کے چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔

صبح سویرے کا وقت تھا۔ سورج ابھی نکلنے کو تھا۔ جب پہلی کرن پھوٹے گی تو سامنے اس دیوار پر پڑے گی اور پھر سارا گھر جگمگا جائے گا۔

پہلے تو ایک ہی گھر تھا۔ مگر جب جھگڑا حد سے بڑھا تو بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی گئی اور پھر جوں جوں وقت گزرنے لگا نت نئے جھگڑے بڑھتے چلے گئے۔ ابھی ابھی زینت بوا اس کے پاس سے اُٹھ کر باہر گئی تھیں۔

انہوں نے اسے سب کچھ بتایا تھا۔ مودی آپا کے ہاں سارے جمع تھے۔ سب ہی اس کے بارے میں پریشان ہو رہے تھے مگر اس کے دل میں کیا ہے کوئی بھی تو

پوچھنے نہیں آتا تھا۔

بچے فرش پر انگشتِ شہادت سے اُلٹی سیدھی لکیریں کھینچتے اسے سب کے چہرے یاد آرہے تھے۔ ان سب کے جو اس کے ہمدرد تھے۔ اور ان سب کے جو ہمدرد کہلوانا چاہتے تھے، مگر یہ کیسی ہمدردی تھی کہ دن کے چڑھتے سورج کی روشن کرنیں بھی کالا روپ دھار کر آتی تھیں۔

ابھی ابھی زینت بوا اسے بتا کر گئی تھیں کہ ذکریا خان نے پنچایت بلوائی تھی اور وہ اس کی قسمت کا فیصلہ کرے گی۔

فیصلے کے لئے بڑے زور شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بیقرار میاں سے لے کر مودی آپا تک اپنا حق جتانے کے لئے بھاگ دوڑ میں ہیں۔

چولہے کے قریب اُلجھے بالوں کو سنوارتے ہوئے پروین نے سامنے دیوار پر دیکھا۔ ابھی تک سورج کی پہلی کرن نہ جگمگائی تھی۔

اسے اس کرن کا انتظار تھا جو واقعی سنہری اور روشن ہوتی ہے!

"ادبِ لطیف" لاہور

نکہت مرزا

ماتمِ یک شہرِ آرزو

ہال میں دبی دبی سرگوشیاں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی مانند ڈوبتی اُبھرتی ہیں۔ کبھی کبھی کسی میز پر سے کوئی قہقہہ گونجتا اور پھر اپنے اچانک پن پر شرمسار جلد ہی دھوئیں اور کافی کی ملی جلی خوشبو میں غائب ہو جاتا ہے۔ ابھی پردہ اُٹھنے میں کچھ دیر باقی ہے۔

میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھا یہ شخص جو انتہائی انہماک کے ساتھ پائپ پینے میں مصروف ہے۔ جیسے دنیا میں اس کے لئے اس سے زیادہ دلچسپ اور اہم کام کوئی نہیں۔ یہ میری بہن کا دیور ہے۔ میں اس کے پائپ میں انہماک اور اپنے وجود سے عدم توجہی پر چپکے سے دل میں مسکراتی ہوں۔ تو یہ طے ہے کہ تم عورتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تمہارا خیال ہے میں تمہاری آنکھوں کی زبان نہیں پڑھ سکی۔ خوب! قاسم میاں آؤ تمہیں ایک زمانہ کی بات بتاؤں سنو کیا تم نے کبھی شکاری کتّوں کو دیکھا ہے جب وہ اپنے نتھنے پھُلا کر ہوا میں اپنے شکار کی خوشبو سونگھتے ہیں اور کس قدر جلد اپنے شکار کو جا لیتے ہیں۔ عورتیں، اپنے شکار کو ان سے بھی جلد پہچان لیتی ہیں ایک

پہلی نظر ہیں وہ مرد کی آنکھوں میں اُتر کر اپنا مقام تلاش کر لیتی ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے میں میز پر آگے کو جھک کر اُسے یہ بات بتاؤں اور اس کے منہ پر ہنسوں مگر یہاں میں اکیلی نہیں۔ میرے دائیں ہاتھ کی کرسی پر بیٹھی عورت جو آگے کی طرف جھک کر دبے دبے لہجے میں کوئی کتھا کہہ رہی ہے، میری بہن ہے۔ میں اس کے چہرے کو پل کی پل غور سے دیکھتی ہوں وہاں دن بھر کے واقعات کا ہلکا سا سایہ بھی نہیں۔ یہ اس کا "پبلک فیس" PUBLIC FACE ہے، ابھی کلب آنے سے گھنٹہ بھر پیشتر یہی عورت ایک چھوٹی سی بات پر اپنے خاوند سے جھگڑی تھی اور دونوں نے انتہائی تلخ لہجے میں ایک دوسرے کو کھری کھری کہہ سنائی تھیں۔ مگر اب وہ چہرے پر مسکراہٹ طاری کئے اپنے خاوند سے یوں باتیں کر رہی ہے جیسے مدتوں سے ان میں لڑائی جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اور بائیں طرف بیٹھا مرد جو سنجیدگی سے اور دلچسپی سے اس کی باتیں سُن رہا ہے، میرا بہنوئی ہے میرا جی چاہتا ہے میں اس کے کان میں سرگوشی کروں "کیا آپ نے میری بدمزاج بہن کو معاف کر دیا ناصر بھائی"۔ مگر اس کے چہرے سے ایسا لگتا ہے جیسے سامنے بیٹھی عورت ہی اس دنیا میں اس کی واحد دلچسپی ہے۔

اسپرنگ دار دروازہ بغیر کسی شور کے کھُلتا بند ہوتا ہے۔ میزیں تقریباً ساری بھر چکی ہیں۔ غیر ملکیوں نے اب سارے آداب پسِ پشت ڈال کر اُونچے اُونچے قہقہے لگانا اور تیز تیز باتیں کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہال کے وسط کی ایک میز ابھی تک خالی ہے اور پردہ اُٹھنے میں چند منٹ باقی ہیں۔ اچانک میری بہن کہانی اُدھوری چھوڑ کر دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایک لحظے کے لئے بدلتے ہیں مگر پھر وہ خوش باشی اور بے فکری کے ساتھ اپنے خاوند کی طرف نظریں

موڑ لیتی ہے ـــ" ناصر ـــ ایک عجیب بات سنو۔ ڈاکٹر آفریدی اپنی بیگم کی بجائے سلمیٰ کے ساتھ آیا ہے۔ اس نے بات کے دوران اپنے میاں کو اطلاع دی اور پھر اپنی بات شروع کردی۔ میں نے آنکھیں اُٹھائیں اور دیکھا ہال کے وسط کی جو ایک میز خالی تھی اس پر ڈاکٹر آفریدی اور سلمہ بیٹھ رہے تھے۔ میں نے دائیں ہاتھ جُھک کر سرگوشی میں پوچھا۔ "یہ سلمیٰ وہی نئی ڈاکٹر ہے نا جس کے ساتھ آفریدی کا AFFAIR چل رہا ہے۔" معظمہ نے گھُور کر مجھے دیکھا اور تنبیہہ کے انداز میں بولی "بی بی کنواری لڑکیوں کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔" قاسم نے منہ سے پائپ نکال کر معظمہ کو تمسخر سے دیکھا۔ لگتا ہے ابھی وہ اپنا فلک شگاف قہقہہ لگائے گا مگر وہ صرف مسکرانے پر اکتفا کرتا ہے پھر پائپ منہ تک لے جاتے ہوئے رُک کر اچانک معظمہ کو مخاطب کرتا ہے۔ "اور کنواری لڑکیوں کو ایسی جگہوں پر آنا چاہیئے۔ کیوں بھابی؟" اس کا لہجہ کچھ کچھ سوالیہ ہے مگر چہرے پر سوائے تمسخر آمیز سنجیدگی کے اور کچھ نہیں۔ معظمہ پہلے میری طرف دیکھ کر میرے چہرے کے تاثرات سے کچھ جانچنے کی کوشش کرتی ہے اور اطمینان سے کہتی ہے "لیکن یہ کوئی ایسی ویسی جگہ تو نہیں قاسم، اچھی خاصی شریف لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔" اب کے قاسم قہقہہ لگاتا ہے مگر اس کا قہقہہ معمول کی مانند بلند نہیں۔ میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنے بارے میں ان کی بحث سُنتی ہوں ـــ "تو آپ کے خیال میں ڈاکٹر آفریدی شریف انسان نہیں۔" اب معظمہ قاسم کی بات پر تقریباً جھنجھلا کر ناصر کی طرف دیکھتی ہے اور ناصر کچھ کہنے کو لب کھولتا ہے۔ مگر درآنی اچانک بار کا پردہ ہٹا کر نمودار ہوتا ہے اور اسٹیج کے قریب کھڑے ہو کر اناؤنس کرتا ہے۔ "خواتین و حضرات۔ اب ہمارا پروگرام شروع ہوتا ہے۔" اور اس کے بعد وہ پروگرام کی تفصیل بتانے لگتا ہے۔ قاسم اپنی نشست کا رُخ اسٹیج کی طرف

کرلیتا ہے۔ میں اپنی دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر آگے کی طرف جھک جاتی ہوں۔ میں عمر بھر میں پہلی بار "بیلے ڈانس" دیکھ رہی ہوں اور اُسے پوری طرح دیکھنا اور اس سے پورا لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔ مگر میرے سامنے کی میز پر آفریدی کا بڑا سا سر ہے، جو مصری رقاصہ کی بجائے سلمہ کے چہرے کا طواف کر رہا ہے۔ میں معظمہ کی آستین کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اسے مخاطب کرتی ہوں "آفریدی کی عمر کتنی ہوگی معظمہ باجی۔" وہ ناگواری سے مجھے گھورتی ہیں "یہ تم ڈانس دیکھنے کی بجائے لوگوں کے زائچے کیوں بنا رہی ہو؟" میں خفت مٹانے کو ہنس دیتی ہوں اور پھر ایک دوسرے شخص کے گانوں سے اپنے قہقہے کو ہال میں اُبھرتا، گونجتا اور پھر ڈوبتا سُنتی ہوں، قاسم گردن موڑ کر مجھے دیکھتا ہے۔ پریشان سی نظر کہ آخر ہنسنے کی کیا بات تھی؟؟

مصری رقاصہ کا نیم عریاں جسم دودھیا روشنیوں میں جگمگا رہا ہے۔ اس کے سیاہ بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں اس کے جسم میں بلا کی پھُرتی ہے مرد اپنے ہاتھوں میں جلتے سگریٹ تک بھُلا بیٹھے ہیں میرا جی چاہتا ہے میں اس وقت قاسم کے برابر کی نشست پر ہوتی اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتی۔ ایک نیم عریاں جسم رقص میں ہے۔ مجھے مصری رقاصہ کا رقص بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ میں کوئی مومنہ نہیں لیکن شبانہ زندگی کی عریانیاں دیکھ کر مجھے انتہائی صدمہ پہنچا ہے، آج سے پہلے کبھی کسی زمانے میں بھی عورت کو اتنا ذلیل نہیں کیا گیا۔ عورت پہلے حرم میں ناچی، پھر غلاموں کی منڈی میں ناچی، لیکن اب ـــ اب عورت ہر جگہ عریاں ہے۔ ہر اسٹیج پر، ہر اشتہار میں عورت ہے اور عریاں ہے۔ یہ عورت کا سراسر تجارتی و فحش استعمال ہے۔ میرے منہ کا ذائقہ انتہائی کڑوا ہو جاتا ہے۔ میں اپنی توجہ ہٹانے کو سلمہ کے چہرے کی طرف دیکھتی

ہوں پچیس چھبیس کے لگ بھگ ایک خوب صورت چہرہ، اس کے چہرے کا حسن پکار
پکار کر اس کے ایرانی النسل ہونے کا یقین دلاتا ہے میں نے اسے کل سہ پہر میں روڈ پر
دیکھا تھا۔ وہ سفید اور لال ایک بازو پر ڈالے دوسرے میں پرس لٹکائے بڑے مزے
میں اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے اپنا سر خاص چونکا دینے کی حد تک اُوپر
اُٹھایا ہوا تھا۔ جیسے اسے اپنے اردگرد چلتے لوگوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ جیسے اس
کا مقام وہاں آسمان کی وسعتوں میں تھا۔ تب معظمہ نے مجھے بتایا تھا کہ یہ ڈاکٹر سلمیٰ ہے
آفریدی کے پاس ایک VACANCY تھی اس پر آئی ہے۔ اور آفریدی نے
اس پر ایک نظر ڈالتے ہی اپنی بیوی کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا آج کا رویہ اس
بات کی پوری گواہی دے رہا تھا ـــــ مصری رقاصہ اپنا رقص ختم کر کے جا چکی ہے۔
آفریدی سلمیٰ کی طرف دیکھ کر کچھ کہہ رہا ہے اور وہ شرمیلی سی ہنسی ہنس رہی ہے ہنستے
میں اس کی گالوں میں ننھے ننھے سے گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ قاسم نے اپنی نشست کا رُخ
ٹھیک کر لیا ہے اور میز پر پائپ رکھ کر جیب سے تمباکو کی ڈبیا نکال رہا ہے۔ ناصر مصری
رقاصہ کے رقص کے بارے میں معظمہ کو کچھ بتانے کی کوشش کر رہا ہے۔ غیر ملکی جن میں
زیادہ تعداد امریکیوں کی ہے مل کر خاصا شور کر رہے ہیں۔ فضا دھوئیں اور کافی کی خوشبو
سے بوجھل ہو رہی ہے۔

درّانی پروگرام لسٹ نکال کر پھر اسٹیج کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے، اب مصری
حسینہ عربی کا ایک گیت سنائے گی۔ قاسم نے گردن موڑ کر اپنا رُخ پھر اسٹیج کی طرف
کر لیا ہے۔ میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھی ہوں۔ مصری حسینہ
کا گیت بھی مجھے اپنی طرف نہیں کھینچ سکا۔ میں بے بسی کے احساس کے ساتھ تمہیں

بند کرلیتی ہوں۔ اور اچانک وہ کوچہ جسے میں کوسوں پیچھے چھوڑ آئی ہوں میری آنکھوں میں روشن ہوجاتا ہے۔ میں یہاں سب کے درمیان اپنی کتھا کہنا چاہتی ہوں مگر میرا اندر کا جی رو رو کر ہلکان ہوا جاتا ہے میں کیا بات کروں۔ میں تم کو کیا سناؤں آدمی کبھی کبھی اس کیفیت سے بھی گزرتا ہے کہ جہاں دل میں صرف ایک بے نام سا درد ہی رہ جاتا ہے۔ نہ اُمید نہ مایوسی۔ نہ کسی چیز کی آس۔ نہ کسی شے کی لگن نہ محبت نہ نفرت۔ انتظار بھی نہیں۔ سفید آنکھیں۔ سرد اور بے جان جسم، بس لوتھ کی لوتھ ہی رہ جاتی ہے۔ یہ میں ہوں — یہ میں ہوں۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی تیز کپکپا دینے والی لہر دوڑ جاتی ہے۔ میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی ہوں۔ میری پیشانی پر پسینے کی نمی ہے۔ میں چاہتی ہوں معظمہ کو آواز دوں مگر آواز میرے گلے میں گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ میں چاہتی ہوں معظمہ کی آستین پکڑ لوں مگر میرا ہاتھ کانپ کے رہ جاتا ہے۔ میں اپنے بے جان جسم کو کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں پوری کھول دیتی ہوں۔ اور مصری حسینہ کی طرف دیکھنے لگتی ہوں۔ شاید اس کا حسین چہرہ مجھے شانتی دے سکے۔ مگر نہیں۔ مصری حسینہ کے ہلتے لبوں میں بھی شانتی نہیں۔ آفریدی کے جذبات سے بھرے چہرے اور سلمیٰ کی شرمیلی ہنسی میں بھی تو شانتی نہیں۔ کبھی تو میری توقع کے خلاف بھی کچھ کرو — کبھی کچھ لئے بغیر بھی کچھ دینا سیکھو۔ میں ازل سے انتظار میں ہوں۔ عبث انتظار —

معظمہ کے چہرے پُرسکون ہے اور وہ طمانیت سے چہرہ موڑے گا نا سُن رہی ہے۔ کیا یہ سکون یہ اطمینان میرے مقدر میں نہیں۔ مگر یہ معظمہ کا "پبلک فیس" ہے کیا تم نے کبھی گھر میں اس کے چہرے پر یہ سکون یہ شانتی دیکھی ہے؟ — بی بی میری جان

ہم سب تنہا ہیں۔ ازل سے تنہا۔ تنہائی ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ کوئی اس تنہائی کو توڑنے کی خاطر کسی کی دُوسراہت قبول کر لیتا ہے۔ (کیا سلمٰی آفریدی سے شادی کرے گی؟) مگر یہ دُوسراہت اس کے اندر کی تنہائی کو دُور نہیں کر سکتی۔ میں آگے جُھک کر میز پہ کہنیاں ٹِکا کر آفریدی کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوں، ہال کی دودھیا روشنی میں اس کا سُرخ و سفید چہرہ چمک رہا ہے گھنی مونچھوں کے تلے موٹے موٹے ہونٹ سامنے بیٹھی لڑکی کے دل میں یقین و اعتماد کے جذبے جگا رہے ہیں۔ کیا اس سامنے بیٹھی لڑکی کو یقین ہے کہ یہ شخص اور صرف یہی شخص اِسے خوشیاں دے سکتا ہے ___؟ خوشی! میرا جی چاہتا ہے زور سے قہقہہ لگاؤں خوشی۔ یہ لفظ کس نے ہمیں گمراہ کرنے کو پیدا کیا، کس نے؟ کوئی مجھے بتاؤ کہ میں اس سے اس لفظ کا مفہوم مانگوں سلمٰی بی بی کیا تم آفریدی، کی دوسراہت اپنا کر خوشی پالوگی ___ تم نے دیکھا ہم ہر نیا کام کرنے سے پیشتر کس درجہ پُر اعتماد ہوتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ہم ضرور خوشی پالیں گے۔ مگر خوشی کہیں نہیں۔ ساری عمر اس کی تلاش میں گزر جاتی ہے اور خوشی پھر بھی دوسرے کنارے پر کھڑی مُسکرا مُسکرا کر ہاتھ ہِلا رہی ہے۔ میں اب اس کے پیچھے ہرگز نہیں بھاگوں گی۔ میں اب تھک چکی ہوں۔

مصری حسینہ گانا ختم کر کے جا چکی ہے قاسم ابھی تک اسٹیج کی طرف رُخ کئے بیٹھا ہے۔ مجھے پروگرام سے ذرّہ بھر بھی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی۔ میں پھر آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔ اور بند آنکھوں میں اپنے وجود کو ہنستے گاتے ہال میں افسردگی سے بیٹھا دیکھتی ہوں۔ میں ہوں کہ پارس کو ہاتھ لگاؤں، کوئلہ بنے۔ خوشی کے قریب سے گزروں وہ دھاروں روئے۔ ہَوا مجھے دیکھ کر اپنا رُخ پھیر لے۔ بادل اپنا سایہ چھوڑ دے۔

تو کیا عجب اگر لگ تنہائی میں اکیلے پن میں کہیں " تم ہو —" مگر ہجوم میں میرے اثبات کو نفی میں بدل دیں۔ آج مجھے ہزارویں بار اس کا تجربہ ہوتا ہے اور میں سچ کہتی ہوں نہ اُداس ہوں نہ دل گرفتہ۔ صرف حلق سے لے کر معدے تک شدید بدمزگی کا احساس ہے ایک اینیٹھن —— کیا نام دوں اس کو؟؟؟ — اپنے اندر کے سناٹے اور باہر کی تنہائی کہ (تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے) کا ماتم کرتے برس بیت گئے۔ کوئی چارہ نہیں خلاؤں کو کوئی کب تک تکے۔ بس اپنے ہی بال و پر نوچتے ہیں۔

قاسم اچانک پائپ رکھنے یا لینے کے واسطے میز کی طرف مُڑتا ہے۔ اور اس کی نظر دانستہ یا نادانستہ میرے چہرے پر پڑتی ہے۔ میں اپنی نظریں ہٹا لینا چاہتی ہوں۔ مگر اس کی نظریں لمحہ بھر کے لئے میری نظروں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں ان نظروں میں حیرت بھی ہے اور پریشانی بھی —— وہ سوالیہ بھی ہیں اور کسی حد تک CONSOLING بھی۔ پھر وہ ہلکے سے مسکرا کر چہرہ اسٹیج کی طرف موڑ لیتا ہے۔ میں پھر آنکھیں بند کر کے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیتی ہوں۔ یہ محض تنہائی کا زہر نہیں ہے جو میری رگ رگ میں سرایت کر رہا ہے۔ یہ محض بے مقصدیت تو نہیں۔ عائشہ بی بی۔ یہ تو لاحاصل کا دُکھ ہے۔ یہ تو نارسائی کا کرب ہے۔ میں جب خود کو دیکھتی ہوں تو میرے اندر کا جی روتا ہے۔ میرے آنسو اندر گرتے ہیں گلے میں قطرہ قطرہ۔ دل پر متواتر گرتی بارش۔ اور وہ کہتا تھا اگر بولنے کو جی نہیں چاہتا تو مت بولو، اگر ہنسنے کو جی نہیں چاہتا تو مت ہنسو۔ مت ہونٹوں کو پھیلاؤ، خود کو بھی کبھی دھوکا نہ دو، جہاں جس وقت تمہارا جی جس بات کے لئے، کام کے لئے بھی کرتا ہے وہ کرو۔ اگر کچھ نہیں تو چپ چاپ بستر پر لیٹ جاؤ اور آنسوؤں کو خاموشی سے بہنے دو۔ اور سنو۔ اگر تمہیں کوئی میسر ہے تو اس سے

کہو۔ آؤ اپنا ہاتھ ہمارے سر پر رکھو، آؤ ہمیں پیار کرو۔۔۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے میں آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھتی ہوں۔ ہر کوئی مصری حسینہ کے گانے میں محو ہے۔ گانے میں بھی اس کے صرف ہونٹ ہی جنبش نہیں کرتے بلکہ اس کے ابرو یا اس کے ہاتھ حتیٰ کہ اس کے جسم کی لچک بھی بسا اوقات اس کے گانے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ ایک سناٹا ہے جو سارے ہال پر طاری ہے۔ سوائے مصری حسینہ کی آواز اور پس منظر ساز کے ۔۔۔ میں پھر آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے عائشہ بیگم کہ وہ نہیں سمجھتا، وہ سمجھنا نہیں چاہتا، تم شکست خوردہ۔ تب مر جاؤ مگر خود پر ترس مت کھاؤ۔ اور وہ جو یہ سب باتیں مجھے سکھاتا تھا مجھے سمجھ نہ سکا۔ مگر کیا یہ سچ ہے؟ کیا حقیقت یہ نہیں کہ وہ مجھے سمجھنا نہ چاہتا تھا ۔۔۔ سلمیٰ بی بی۔ میں اچانک آنکھیں کھول کر ہال کے وسط میں اُسے تلاش کرتی ہوں۔ تمہیں آفریدی کی بانہوں میں سمانے کے لئے اس کی پہلی بیوی کی قبر پر سے گزرنا ہو گا، کیا تم ایسا کر سکو گی؟ کیا ایک لمحے، ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں بھی تمہیں یہ خیال نہ آئے گا کہ وہ عورت جس کے سینے پر پاؤں رکھ کر تم اس کے خاوند اور اپنے محبوب کے پاس جاؤ گی وہ بھی تمہاری طرح گوشت پوست کی ہے۔ اس کی نسوں میں بھی تمہاری مانند گرم گرم سُرخ خون دوڑتا ہے۔ اس کے سینے میں بھی زندگی کی اَن گنت مسرتیں خیمہ زن ہیں ۔۔۔ نہیں تم ایسا نہیں سوچو گی۔ تم بہادر ہو، تم کو صرف اپنی خوشیوں کے حصول کی چاہ ہے۔ اپنا وجود تم کو عزیز تو ہے۔ اور میں ۔۔۔ میں چپکے سے ہنستی ہوں۔ بے آواز ہنسی ۔۔۔ بے بسی کی ہنسی ۔۔۔ معظمہ اگر جان لے کہ میں کیا سوچ رہی ہوں معظمہ اگر میرے پاس بھی تیرے جیسا ایک "پبلک فیس" ہوتا، میں اس کے شگفتہ چہرے کو دیکھ کر رنج سے

سوچتی ہوں اور دفعتاً چونک اُٹھتی ہوں۔ ناصر میری کرسی پر جھک کر کچھ کہہ رہے ہیں جی۔ میں گھبرا کر ان کی طرف دیکھتی ہوں "بی بی" تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ان کے لہجے میں اپنائیت ہے میں مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلا دیتی ہوں۔ میں مزے میں ہوں آپ فکر مت کیجئے"۔ میں اپنی آواز حتی الامکان خوشگوار بنا کر کہتی ہوں اور نظریں اسٹیج پر گاڑ دیتی ہوں۔

میں نے آنکھیں اسٹیج پر گاڑ رکھی ہیں مگر مجھے کچھ نظر نہیں آرہا سارا ماحول دھندلا رہا ہے میں گوش بر آواز ہوں مگر میرے کانوں میں کوئی آواز نہیں آرہی میرے اندر باہر سناٹے کی حکمرانی ہے۔ آفریدی اور سلمیٰ کے چہرے بھی اسی دھند میں گم ہو چکے ہیں۔ میں اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کی خاطر آنکھیں موند لیتی ہوں اور وہ کوچہ اپنی تمام تر روشنیوں سمیت میری آنکھوں میں اُتر آتا ہے۔ میں اس سے بھاگ کر کہاں پناہ پاؤں گی ؟؟ معظمہ بہنا تو مجھے یہاں لے کر آئی ہے کہ میں اس رنگ بھرے ماحول میں اپنی تلخ اور ناکام زندگی خوشگوار بنا سکوں۔ اپنے زخم بھلا سکوں۔ ناصر کہتے ہیں وقت ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ وقت۔ میں اپنے جسم میں تناؤ سا محسوس کرتی ہوں، مگر۔ بھائی میرے یہ وقت ہے کیا —— کیا ہے وقت ؟ ؟ ؟ وقت اندھے کی لاٹھی ہے جس سے وہ راستہ پاتا ہے۔ راستہ پاتا بھی ہے راستہ کھوتا بھی ہے۔ مگر وقت تمہارے اندر ہے یا تم وقت کے اندر ہو ؟ — وقت ایک جال ہے اور تم صید ہو — کہ تم جال ہو اور وقت صید ؟ وقت تمہارا غلام ہے یا تم وقت کے غلام ہو ؟ — مگر تم کون ہو اور وقت کیا ہے ؟ اور وقت کیا ہے اور تم کون ہو ؟ اور تم مر جاؤ گے اور وقت یونہی رواں دواں رہے گا — پھر تم میں کون فاتح ہے اور کون مفتوح ؟ اور کون

حاکم ہے اور کون محکوم؟ اور جو مر جائے گا وہ مفتوح ہوا اور جو زندہ رہا وہ فاتح — پس وقت فاتح ہے!!! میرا جی چاہتا ہے میں ناصر کا کندھا پکڑ کر ان سے کہوں میں نے وقت کو پا لیا۔ میں نے وقت کو پا لیا — خود اپنی بے آواز سوچ میرے کانوں میں گونج سی پیدا کرتی ہے، وہ خوبصورت کشادہ گھر، وہ بھاگتے کھیلتے بچے۔ وہ دن، وہ لوگ — کہاں گئے۔ ؟؟؟

(وہ پریشانی سے کمرہ کمرہ گھومتی ہے سارے میں ایک چپ ہے ایک سناٹا، ویرانی، یہ بھرا پرا آنگن اب کیسا سنسان ہو رہا ہے۔ کمرے کیسے خاموش، کوئی دروازہ نہیں کھلتا، کسی کمرے سے کوئی آواز نہیں ابھرتی۔ یہ گھر ہے؟ یہ گھر ہے یا قبرستان۔ وہ ماں کے کانوں کے پاس جا کر ڈھاڑتی ہے۔ بوڑھی عورت سفید پلو سے سر ڈھانپے تخت پر بیٹھی ہے، سپاٹ بے رنگ آنکھیں لئے "آؤ رانی میرے پاس بیٹھو" جذبات سے بھاری آواز، رانی۔ ہنہ۔ وہ طنز سے ہنستی ہے اور ہنسے چلی جاتی ہے۔ پھر نڈھال ہو کر تخت پر گر جاتی ہے۔ ایک دم وہی سکوت، وہی خاموشی، وہی سناٹا۔ آنکھیں بند کئے کیا سکون ملتا ہے، سکون۔ ہنہ سکون کیا ہے۔ آنکھیں کھول کر وہ بوڑھی عورت کو دیکھتی ہے۔ ماں۔ کیا ہے میرے سینے میں معدوم جہاں قہقہہ وقت سے بھی خامشیٔ قبر نہیں ٹوٹتی۔ اور آگے بڑھ کر ماں کی گود میں سر رکھ کر ہچکیوں میں رونے لگتی ہے۔)

معظمہ مجھے پھر کہہ رہی ہے میں نے آنکھیں کھول دی ہیں میری آنکھوں میں میرے کوچے کی گرد اڑ رہی ہے معظمہ اسے دیکھ لے گی۔ میں نے جلدی سے رومال نکال کر اپنی آنکھیں صاف کی ہیں "معظمہ باجی۔ آپ کے کلب کی روشنیاں میری

آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی ہیں۔" میں اپنی آواز میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے کہتی ہوں۔ وہ ہاتھ بڑھا کر میرا شانہ تھپتھپاتی ہے۔" ہولے ہولے تم ان روشنیوں کی عادی ہو جاؤ گی بانو۔ اس کے لہجے میں مامتا ہے میرا گلا رندھ جاتا ہے (کیا ہے میرے سینے میں معدوم ۔ کیا ہے) میں اقرار میں سر ہلا دیتی ہوں۔ معظمہ پھر اسٹیج کی طرف چہرہ موڑ لیتی ہے عربی حسینہ DAGGER DANCE پیش کر رہی ہے اس کے دونوں ہاتھوں میں چمکتے ہوئے خنجر ہیں اس کی حرکات میں بلا کی پھرتی ہے اور وہ اس تیزی سے اپنے ہاتھوں کو دائیں بائیں اُوپر نیچے گھماتی ہے کہ خنجر نظر تک نہیں آتا اور صرف بجلی سی کوندتی نظر آتی ہے۔ میری توجہ لمحاتی طور پر حسینہ کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ قاسم کنکھیوں سے میری جانب دیکھتا ہے۔ میرے چہرے پر دلچسپی پا کر خود بھی خوش ہو اُٹھتا ہے لیکن آفریدی کا سر ایک بار پھر میری توجہ اُچک لیتا ہے آفریدی اُسے یہاں لے کر کیوں آیا ہے؟ کل رات ڈنر پر خواجہ دبے دبے کہہ رہا تھا کہ آفریدی پہلی بیوی کو طلاق دے کر سلمیٰ سے شادی کرے گا اور دونوں مل کر ہسپتال کھولیں گے۔ میری خواہش ہے میں ان کے قریب بیٹھ رہی ہوں اور ان کی باتیں سنوں۔ آخر آفریدی سلمیٰ سے کیا کہہ سکتا ہے؟ سلمیٰ نے کیونکر اس کی باتوں کا یقین کر لیا ہو گا۔ سلمیٰ بی بی تو کس قدر بھولی ہے آنکھیں میچے اس شخص پر اعتبار کر رہی ہے جس نے تیری خاطر پانچ سالہ رفاقت کو ختم کر دیا۔ کیا وہ تیری رفاقت سے کسی بھی وقت ایسے ہی منہ نہیں موڑ سکتا ؟ میں چاہتی ہوں سلمیٰ کو یہ سب باتیں بتاؤں، اسے اس فعل سے باز رکھوں وہ ابھی معصوم ہے اس بھیڑیئے نے عیاری سے اسے اپنے جنگل میں پھانس لیا ہے۔ مگر ابھی وقت ہے وہ اس جال کو توڑ سکتی ہے۔ اگر میں اس کی مدد کروں۔

قاسم اچانک پائپ رکھنے کے بہانے میز پر جھک کر میری طرف دیکھتا ہے "اگر میں غلطی پر نہیں، یہ پروگرام آپ کی معمولی سی توجہ بھی نہیں کھینچ سکا۔" میں خفت مٹانے کو ہلکے سے مسکرا دیتی ہوں "یہ حقیقت ہے قاسم میاں، تم کچھ کچھ سمجھ دار قسم کے آدمی ہو مگر میں اسے اپنی رائے سے باخبر نہیں کرتی، بس ہلکے سے مسکرا کر بات ختم کر دیتی ہوں۔ اسٹیج پر پردہ پڑا ہے رقاصہ جا چکی ہے، درّانی بار کی طرف سے نکل کر پروگرام کے ختم ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ کرسیوں کا شور، باتوں قہقہوں کا غل، امریکی مرد اپنے پائپ سنبھالے بار میں گھس جاتے ہیں۔ عورتیں، پروگرام پر اپنی باریک آوازوں میں تبصرہ کرتی باہر نکل جاتی ہیں۔ آفریدی اور سلمیٰ بھی اسی بھیڑ میں گم ہو چکے ہیں۔ معظمہ مجھے گھر چلنے کو کہتی ہے۔ گھر۔ میرا گھر کونسا ہے ؟؟؟

(اور وہ بالکنی میں کھڑی، اکیلی، تنہا اور اُداس، اپنے غیر محفوظ ہونے کا احساس میرے سینے میں وہی ایک عدم، ایک خلا ــــ اے گرانبار سکوت۔ ٹوٹ جا۔ بالکنی سے نیچے جھانکتے ہوئے اس نے سوچا، نیچے کود جاؤں۔ تب کیا ہوگا۔ اگر میں یہاں سے کود کر نیچے جا گروں اور سُرخ سُرخ بجری پر لیٹ کر مر جاؤں تب کیا ہوگا؟ اس کے بعد میں کہاں جاؤں گی ؟ کیا پھر یہی تنہائی یہی اُداسی، یہی اکیلا پن ــ اور جو اس بالکنی سے نیچے کود جاؤں تو نیچے مجھے وہی خدا ملے گا جو میری ماں کا خدا ہے۔ نہیں نہیں مجھے تیری ضرورت نہیں۔ میں زندہ رہوں گی ــ میں زندہ رہوں گی)

معظمہ نے میرا ہاتھ تھام لیا ہے ناصر دوسری طرف ہاتھ پشت پر باندھے سر جھکائے چل رہے ہیں۔ میری سوچیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی ہیں میں پروگرام کے بارے میں سوچنا چاہتی ہوں کہ اس کی تعریف ناصر کے روبرو کروں اور شکریہ ادا کروں کہ آج

کی شام بڑی دلچسپ گزری مگر مجھے آفریدی کا جذبات سے سُرخ چہرہ اور سلمیٰ کی جھینپی جھینپی سی ہنسی یاد آجاتی ہے۔ اور جب میں آفریدی کے بارے میں کچھ کہنے کو لب کھولتی ہوں تو قاسم کے بوٹوں کی چاپ ہتھوڑے بن کر میرے ذہن میں گونجنے لگتی ہے۔ قاسم ہم سب سے چار قدم پیچھے اکیلا چلا آرہا ہے۔ اچانک میں انتہائی بھونڈے پن سے معظمہ سے کہتی ہوں "معظمہ باجی۔ قاسم کی بیوی کب آئے گی" ناصر کا جُھکا سر اور بھی جُھک جاتا ہے قاسم کے بوٹوں کی چاپ کہیں دُور گم ہونے لگتی ہے اور معظمہ سرگوشی کے لہجے میں کہتی ہے "ان کی تو SEPERATION ہو چکی ہے بانو" پھر قدرے اونچی آواز میں مجھے بتاتی ہے کہ وہ بے انتہا بدمزاج اور پھوہڑ قسم کی عورت تھی میرا جی چاہتا ہے قہقہہ لگاؤں۔ ایسا قہقہہ جو ساری کائنات کو اپنے گھیر میں لے لے۔ جسے ہر کوئی سر اُٹھا کر سُنے۔ یہ سارے دھوکے ہیں معظمہ کسی کو کسی کی ضرورت نہیں۔ کوئی دو سراہت ابدی نہیں۔ سارے رشتے ٹوٹ جانے والے ہیں۔ کسی کو ثبات نہیں ___ کسی کو ثبات نہیں ___

آپا نے بچوں کو سُلا دیا ہے۔ ہم چاروں خاموشی کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں، ناصر کبھی کبھار ایک آدھ بات چھیڑ دیتے ہیں۔ قاسم برابر میری طرف دیکھتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے یہیں سب کے درمیان اس سے پوچھوں۔ تم جو یوں نظروں نظروں میں مجھے اَن گنت پیغام دے رہے ہو۔ کیا تمہارا خیال ہے میں تمہاری بدمزاج جھگڑالو قسم کی بیوی سے بہتر ثابت ہوں گی۔ تم غلطی پر ہو قاسم۔ یہاں کوئی کسی سے بہتر نہیں۔ اور پھر میں تو رشتوں ناطوں پر ایمان بھی نہیں رکھتی۔ نہ مجھے کسی کی دو سراہت کی ضرورت ہے۔ تنہائی میرا مقسوم بن چکی ہے۔ مگر میں اس سے کچھ نہیں

کہتی ہیں اس کی نظروں کی زبان سمجھنے سے انکار کر دیتی ہوں اور سر جھکا کر کھانا کھاتی ہوں۔
مجھے کھانے سے بھی نفرت ہے مجھے ہر اس شے سے نفرت ہے جو مجھے زندہ رہنے پر
اکساتی ہے۔ لیکن میں مرنا بھی نہیں چاہتی۔ کیونکہ مرنے کے بعد مجھے وہی خدا ملے گا جس
نے زندگی بھر مجھے کچھ نہیں دیا۔ اور وہ مرنے کے بعد مجھے کیا دے گا ؟ ؟

میں پرانی پڑھی ہوئی ایک نظم کو دل میں دہرانے لگتی ہوں ؎

زلیست اور موت کا چکر! جینا

موت اور آگ کی خوراک میں ڈھلنا ـــــ مرنا

اور پھر زلیست کی تکلیف اٹھانا ـــــ خود کو

ان سوالات کی خوراک بنانا ـــــ کیا ہے؟

قاسم نے کافی کی پیالی میز پر رکھ کر مجھے ہلکی پھلکی سیر کے لئے کہا ــ "یقیناً تھوڑی
سی سیر سے آپ کو قطعاً نقصان نہیں پہنچے گا" مگر میں اس کے ساتھ باہر نہیں جانا چاہتی
میں اس کا پیغام نہیں سننا چاہتی۔ مجھے تمہاری قطعی ضرورت نہیں قاسم۔ وہ میرے انکار
پر دل برداشتہ ہو جاتا ہے اور کافی کی ایک اور پیالی، باوجود معظمہ کی مخالفت کے، پی کر جانے
کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ بیچلرز میس میں رہتا ہے اور رات کا کھانا اکثر معظمہ
کے ہاں کھاتا ہے۔ ناصر اور معظمہ مجھے میرے چھوٹے سے بیڈ روم میں چھوڑ کر اچھی سی
میٹھی نیند لینے کی ہدایت کر کے اپنی خوابگاہ میں چلے جاتے ہیں ـ سیاہی پھیلتی ہے
تو شام پڑتی ہے اور روشنی پھیلتی ہے تو دن۔ اور دن گزرتے ہیں تو سال گزرتے ہیں
تو ـــ مجھے موت کیوں نہیں آتی۔ مگر میں مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے زندہ رہنا ہے اور مجھے
زندگی سے نفرت ہے۔

(”ماں، رات کیوں ہوتی ہے؟“ بوڑھی عورت چہرہ لحاف سے نکال کر اسے دیکھتی ہے ”سو جاؤ بیٹی۔“ وہ آنکھیں چھت پر گاڑے لیٹی ہے ”ماں اگر ہم دن کو سو جائیں اور رات کو کام کریں تو پھر رات کو دن اور دن کو رات کہیں گے نا؟“ بوڑھی عورت عاجزی سے کروٹ بدل کر اسے دیکھتی ہے ”بیٹی، سورۃ رحمٰن پڑھ کر اپنے سینے پر پھونک مارو اور سو جاؤ۔“ تب وہ یکدم لحاف پرے پھینک کر اٹھ بیٹھتی ہے اور چلا کر کہتی ہے ”ماں اپنے خدا کا نام میرے سامنے مت لیا کرو۔ مت لیا کرو۔“ چلاتے چلاتے اسے کھانسی آجاتی ہے اور وہ بے دم سی ہو کر بستر پر گر جاتی ہے۔ خاموش، ویران گھر، سناٹا، بند کمرے، بند دروازے۔ کسی کمرے سے کوئی آواز نہیں ابھرتی، ساکت و جامد چیزیں۔ کوئی بولے، کوئی کروٹ بدلے، کوئی سسکی، کوئی آہ، کراہ!!! پھر کوئی ہو تو یہ ہو ——)

سب کچھ ٹھہر گیا ہے۔ سب کچھ سو گیا ہے۔ میں شاید مر رہی ہوں!

”سیپ“ کراچی

مشرّف احمد

رشتہ

گوالی لین کے ایک طرف آگے کو چل کر جہاں بائیں ہاتھ کو مڑتا ہُوا راستہ تکون سی بنایا کرتا تھا' وہاں انور بیٹھا ہوا لوگوں کی پھٹی پُرانی جُوتیوں میں تکلیاں' ایڑیاں اور اسفنج کے چپلوں کے ٹوٹے ہوئے تسموں کو لڑکیوں کی طرح کے نازک اور نرم گورے گورے ہاتھوں سے ٹانکے لگایا کرتا۔ یا دو دو آنے' چار چار آنے میں بجری اور گرد کے کھائے ہوئے جوتوں کے چمڑے کی جِلد کو ازسرِ نو لال یا کالا کرتا رہتا' گویا لوگوں کے پھٹے پرانے جوتوں میں ٹانکے نہ لگا رہا ہو' خستہ جُوتوں کی جِلد کو لال کالی پالش سے چمکا نہ رہا ہو بلکہ اپنی اُدھڑی ہوئی زندگی میں ٹانکے لگا رہا ہو اور اس کی کریہہ اور مسخ شدہ جلد کو بنا سنوار رہا ہو۔

دوپہر ہوتے ہوتے جب وہ جوتوں میں ٹانکے لگاتے لگاتے تھک جاتا اور سورج سامنے کی تین منزلہ بلڈنگ کو پھلانگ کر اس کے سامنے پڑے ہوئے پھٹے پرانے سوکھے ہوئے چمڑے کے جوتوں کے ڈھیر پر پھیل جاتا اور دو پتلے پتلے بانسوں

کے سہارے اٹکا کر کھڑی ہوئی کپڑے کی چادر سورج کی تپش میں مزاحم نہ رہتی تو وہ رونق دکھانے یا پانی کا ٹھنڈا گلاس پینے، ساری گلی کو عبور کر کے آخری کونے کے بھٹیار خانے میں چلا جاتا جہاں کا مالک چربی میں پکائے ہوئے سالن کو حلق میں جما دینے کی غرض سے برف کے پانی کے پہلوانی گلاس مفت لٹایا کرتا تھا۔ پلٹتے ہوئے وہ راستے میں پڑتی دکانوں سے کسی کا جوتا پالش کرنے، ایڑی لگانے یا ادھڑی ہوئی جگہ ٹانکے لگانے کے لئے لیتا آتا۔

گلی کے بیچوں بیچ محمد حنیف پنواڑی کی دکان پڑتی تھی۔ محمد حنیف پنواڑی نے زندگی میں کبھی پیر میں گہرے گہرے نشان ڈالنے والی نری کی لال لال جوتی کے علاوہ کوئی چیز نہ پہنی تھی۔ اور اس کا جوتا گھسنے کا نام نہ لیا کرتا۔ کیونکہ جوتا تو جب گھستا ہے جب آدمی کی ٹانگیں چلتے چلتے تھک جاتی ہیں اور اگر ٹانگیں نہ تھکیں تو جوتا بھی نہیں تھکتا۔ اور محمد حنیف تھا کہ صبح کو جو آ کر دکان کی گدی پر آلتی پالتی مارے بیٹھتا تھا تو رات گئے ہی اٹھتا۔ لہذا جوتی سدا کی بہار دکھائی دیتی گویا ابھی ابھی دکان سے اٹھا کر لائی گئی ہو۔ ہفتہ کے ہفتہ اس کی بیوی ہاجرہ بڑے چاؤ کے ساتھ، محمد حنیف کی دکان بند کر کے رات کو گھر آنے پر گھانی کے خالص سرسوں کے تیل سے، جو اس کا چھوٹا بھائی ہر آنے جانے والے کے ہاتھ گاؤں بھیجتا رہتا تھا۔ گوندھ گوندھ کر جوتی کو چمکاتی رہتی تھی۔ مگر ہوا یہ کہ محمد حنیف کا بڑا سالہ ایک دفعہ اپنی بہن سے ملنے آیا تو بہنوئی کے لئے چمک دمک دکھاتی ایک گرگابی لیتا آیا۔ جب گوجرہ کی بنی ہوئی تہبند کو ٹانگوں کے گرد لپیٹے اور پاؤں میں چرم چرم کرتی گرگابی کو پہن کر محمد حنیف دکان جانے کو نکلا تو زندگی میں پہلی بار اسے یوں محسوس ہوا گویا پیر کے نیچے کوئی دبیز قالین بچھا ہوا ہے اور

چاروں طرف سے اس کے پیروں کو نرم و نازک گرفت میں لے رہا ہے۔
گارے مٹی سے بچاتا اس گرگابی کو حنیف دکان کے پٹرے پر پیر رکھتے ہی اتار دیتا اور اسے بڑی احتیاط سے جیسے ڈھیر ساری تعداد میں چاندی کے ورق لگے پانوں کا پیکٹ تیار کر رہا ہو، اٹھا کر اپنے بیٹھنے کی گدی کے قریب ہی رکھ دیتا۔
جب گرگابی کی کالی جلد روز بروز کے استعمال سے اپنی چمک دمک کھونے لگی تو اسے پالش کی ایک ڈبیہ اور برش خریدنے کا خیال آیا۔ مگر وہ خود تو پالش کرنے سے رہا! پالش کون کرے گا؟ اسے ہاجرہ کا خیال آیا جو ابھی تک نری کی پرانی جوتی کو ہر سوز اگرچہ وہ پہنا تو نہیں کرتا تھا لیکن صاف ضرور کیا کرتی تھی، مگر ہاجرہ.... ہاجرہ انگریزی جوتے کے ساتھ برتاؤ کرنا کیا جانے۔ وہ تو گاؤں کی رہنے والی سیدھی سادھی، صبح اٹھ کر پانچ سیر گندم چکی میں پیسنے اور باجرے کی موٹی موٹی روٹیاں پکانے والی عورت، ایک دوسرے میں الٹے سیدھے کر کے اڑا کر رکھی ہوئی گرگابی کی طرف دیکھتے اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے سانچی پان پر کتھے کی تہہ جمانے ہوئے اس نے سوچا "اس سالی کو کیا تمیج (تمیز) باپ دادا سے نری کی جوتی پہنتے اور سرسوں کے تیل میں ڈبوتے آئے ہیں۔" دل میں ایسا سوچتے ہوئے اس نے نری کی جوتی پہننے کے الزام کو ہاجرہ کے باپ دادا پر لگاتے ہوئے خود کو صاف صاف بچا لیا۔ جیسے وہ ہمیشہ سے ہی گرگابی پہنتا چلا آرہا ہو۔
"استاد ولز کا ایک پیکٹ دینا۔ ساتھ موہنی تمباکو والا ڈبل کتھے چونے کا پان۔" ایک بھاری اور کرخت آواز نے اسے جوتوں کے چکر سے نکال دیا۔ اور پھر گاہکوں کے آنے جانے میں طرح طرح کے پان لگاتے، سگریٹوں کے پیکٹ دیتے،

وہ اپنے جوتے کو بھولے رہا۔

سہ پہر کا وقت تھا جب اونگھتے اونگھتے جوتا پھر آ کر اس کی نگاہوں کے سامنے لٹک گیا۔ وہ جلدی سے اپنی گدّی سے اُترا اور زیر آبادی گلّے کو تالا لگایا۔ جوتوں کو آہستہ آہستہ جیسے کانچ کے ہوں سڑک پر جا کر رکھا اور پہن کر موچی کی دکان پر چلا گیا۔

انور سر جھکائے، ہاتھ میں ربی پکڑے ایک بوٹ میں ایڑی لگا رہا تھا کہ محمد حنیف ایسی لنگڑاتی ہوئی چال سے کہ جب آدمی دیر تک آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کے بعد چلتا ہے، اس تک پہنچا۔

اسفنج کی ایک نیلی اور ایک لال چپل کو پاؤں میں ڈال کر اُس نے جب اپنی گرگابی کو داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے پکڑ کر اس کے پاس رکھا تو محمد حنیف کی نظریں انور کی ملیشیے کی پھٹی ہوئی شلوار کے اندر سے چمک دمک دکھاتی سنہرے ریشے سے پُر ران پر جا پڑیں۔ گاہک کی موجودگی سے باخبر ہو کر جب وہ اپنے خوب صورت چہرے پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ لایا تو اس کے پتلے پتلے اور لال لال ہونٹوں کے درمیان موتی کی طرح چمکتے ہوئے سفید دانت ایک لمحے کو یوں لگے جیسے گلابی پیسٹری پر مکھن کی سفید سفید تہہ جمی ہوئی ہو۔ اور پھر خدا جانے یہ ڈھلتی دوپہر انور کے چمکتے ہوئے جسم کی چاندنی تھی یا محمد حنیف کی اونگھتی آنکھوں کا قصور کہ اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس پانی کو جلدی جلدی شربت کے شیریں گھونٹ کی طرح حلق سے نیچے اتارتے ہوئے اس نے کہا۔ ”ارے جوتوں پر ایک لمبر پالس کر دے مجھے دے جائیو، سمجھے آن“

پھر ایک مسکراہٹ اس نے انور پر ڈالی۔ دوبارہ وہی مسکراہٹ جواب میں چمکی، اور اس نے ماتھے پر پڑی ہوئی بھورے بالوں کی لٹ کو جھٹکا دیتے ہوئے نمبر ون پالش

کا یقین دلایا۔ اس ڈھلتی دوپہر میں محمد حنیف جب واپس آکر اپنی گدّی پر بیٹھا تو اُسے یوں لگا جیسے وہ بہت تیز دھوپ میں چل کر آرہا ہو اور اسے زور کی پیاس لگ رہی ہو۔

اور ایک صبح جب اس گلی کا یہ چھوٹا سا بازار کھُلا تو عبدالرسول بساطیہ، بھٹیار خانے کا مالک آٹا گوندھنے والے فقیرے اور لمبے لمبے بازوؤں کو اکڑا اکر چلنے والے چھوٹن اور اسٹیشنری بیچنے والے کے سامنے، موچی انور کو محمد حنیف کی دکان میں، اس کی گدّی کے مقابل ایک نئی بنی ہوئی گدّی پر بیٹھا ہوا دیکھ کر جیسے بم کا گولہ پھٹ گیا اور گردن اکڑا اکر گھنگریالے بال بنا کر، لمبی قمیض کے کھلے ہوئے گریبان میں لگے کالر کو گردن کے پیچھے ڈھلکا کر چلنے والے چھوٹن کا نو بانھ کی سپاٹ سطح سے آگے کو جا کر، گول گول طاقتور کلائی کے بیچوں بیچ رسی کے لگے ہوئے مندمل زخم میں جیسے پھر سے کھُدبُد ہونے لگی۔ انور کی رسی سے لگے ہوئے زخم کے نشان والے ہاتھ کو کرتے کی جیب میں ڈال کر بگلے کی سگریٹ نکالتے ہوئے اس نے بھٹیار خانے کے آٹا گوندھنے والے فقیرے سے جس کے بدن کا میل پسینہ ہو ہو کر آٹے میں شامل ہوتا جا رہا تھا کہا۔

"اوئے فقیرے محمد حنیف سالہ کوئی بہت ہی جوان ہے جو یہ ......"

فقیرے نے چھوٹن کی بات کو درمیان ہی سے کاٹتے اور ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو اُلٹے ہاتھ کی دو انگلیوں سے پونچھ کر آٹے میں جھٹکتے ہوئے ہنس کر جواب دیا۔

"اُستاد اس میں کوئی بات ناہے۔ تیرے سے جیادہ (زیادہ) جوان تو میں نے اپنی جندگی (زندگی) میں نا دیکھا یہ ....." اور وہ پھر لفظوں کو یوں ٹھہرا ٹھہرا کر ادا کرتے ہوئے گویا وہ چھوٹن کے دل پر لگے زخم کی پٹی اُتار رہا ہو، بولا۔ "پسند اپنی اپنی۔" سگریٹ

کا کش کھینچ کر دھواں چھوڑتے ہوئے اپنے بدن کے کرٹیل پن پر نظر پھسلاتے ہوئے اس نے غرور سے گردن اکڑا کر کہا۔ "پر میں بھی اپنی ماں کا نا ہوں جو...." اور یہ کہہ کر گھیردار شلوار کے پھیر درست کرتا وہ حنیف پنواڑی کی دکان کی طرف ہو لیا۔ سامنے انور بوسکی کی کریم کلر قمیص اور سفید شلوار پہنے، ہونٹوں پر پان کا لاکھا جمائے اناڑی کی طرح چونے اور کتھے کی کلھیوں میں لکڑی کا گول گول چمچہ چلا رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ اس نے کچے لوگوں کی طرح شرما کر نظریں جھکا لیں۔ شاید ابھی تک اس کی نظروں میں وہ بے حیائی نہیں آپائی تھی۔ چھوٹن زور سے پنجابی کے بول۔

تیرا پیچھا نئیں اوہ چھڈنا اے
پاویں پے جان ہتھکڑیاں
(تیرا پیچھا نہیں چھوڑنا۔ چاہے ہتھکڑیاں پڑ جائیں)

اپنے الوری لہجے میں گاتا ہوا دکان کے سامنے سے گزر گیا۔ پنجابی وہ اکثر الوری لہجے میں بولا کرتا اور یوں اپنے ساتھ لائے ہوئے کلچر کو اس زمین کے کلچر سے ملانے کی کوشش کیا کرتا۔

ہتھکڑیوں کا چھناکا چھوٹن کی آواز بن کر محمد حنیف کے کانوں تک پہنچ گیا۔ کیپسٹن کے پیکٹ کو کھولتے ہوئے اس کی انگلیاں جہاں تھیں وہیں رہ گئیں۔ ایک قہر آلود نظر کے ساتھ اس نے چھوٹن کی طرف دیکھا جو آگے نکل چکا تھا۔ اور جس کی چوڑی چکلی پیٹھ نظر آ رہی تھی۔ پھر وہی قہر آلود نظر پیار میں بدلی اور وہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے انور کو دیکھنے لگا۔ انور نے جس کی گوری گوری انگلیاں چونے کتھے میں رنگ دار ہو گئی تھیں، نظریں جھکا لیں، گویا کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ پہلے یہ ہاتھ پالش کی

سیاہی میں کالے ہوا کرتے تھے اور اب کتھے چونے میں لال۔
گلی کی ساری دکانوں میں انور اور محمد حنیف کی نئی دوستی کے بارے میں طرح طرح کی خبریں فضا میں چھوڑے جانے والے گیس کے غباروں کی طرح چھوڑی جاتی رہیں۔
اب انور کے پاس دو گھوڑا بوسکی کی قمیص اور چلتے میں کھڑ کھڑ کرتے ہوئے سفید لٹھے کی شلوار کے علاوہ کلائی میں کبھی گھڑی بھی چمکنے لگی تھی۔ اور دائیں ہاتھ کی سب سے چھوٹی اُنگلی میں لال نگ لگی سونے کی انگوٹھی بھی اپنی بہار دکھلاتی رہتی۔
چھوٹن ایک دن ڈبل پتّی کا پان اور ولز کی ایک سگریٹ لینے آیا۔ پیسے دیتے وقت اس نے دس کے کرارے نوٹ کو انور کی تہہ کی ہوئی ران پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے پان سنبھالا تو محمد حنیف کی مونچھوں کے بال غصّے کے مارے تھر تھر کرنے لگے اور اس کی پان جمی ہوئی باچھوں میں غصّے کے مارے سفید سفید جھاگ نکل کر لال رنگ میں تبدیل ہونے لگی لرزتی آواز میں اُس نے کہا۔
"دیکھ بے چھوٹن اب کی تو تو نے بدتمیجی (بدتمیزی) کر لی پر آگے کو کان رکھیو۔ اپنی سگریٹ بیڑی کو لے جا اور کھبردار (خبردار) جو آئندہ اس دکان سے سودا کھریدنے (خریدنے) آیا، تیرے نہ آنے سے میری دکان چوپٹ نہ ہو جائے گی۔ سمجھا" اور چھوٹن نے پیسوں کو کُرتے کی جیب میں ڈالتے ہوئے بے حیائی سے کہا۔
"اُستاد نئے نئے سکاری (شکاری) ہو مِل بانٹ کر کھاؤ۔ سمجھے"
"چل بے تیرے مِل بانٹ کے کھانے والے کی......" محمد حنیف نے چھوٹن کو ایسی رنگ دار گالی دی کہ پاس سے گزرتا ہوا خیرات مانگنے والا بوڑھا بھکاری تیز تیز قدموں کے ساتھ بغیر سوال کئے ہی آگے کو نکل گیا۔ چھوٹن نے ڈھٹائی سے محمد حنیف

کو دیکھا اور پھر زیر لب بڑبڑاتا ہوا، کالر کو گردن کے پیچھے ڈھلکاتا، اکڑتا چلا گیا۔

نہ جانے اس میں جھوٹن کی بوالہوسی کو دخل تھا یا گلی کے کسی دوسرے دکان دار کی رقابت اور حسد کو کہ محمد حنیف کے اس نئے شوق کا پتہ ہاجرہ کو بھی چل گیا۔ پہلے تو ہاجرہ کے کانوں کو یقین نہ آیا مگر جب بتانے والے نے ہر اسرار پر سے پردہ سرکایا اور وہ خود چوری چھپے جا کر دکان پر بیٹھے ہوئے انور کو دیکھ آئی تو اس کا بدن سُن سے رہ گیا۔ وہ تو محمد حنیف کے راتوں کو باہر رہنے کو کسی کوٹھے سے وابستہ کئے بیٹھی آرہی تھی، اور اس بات کو صبر و شکر کر کے یوں تسلیم بھی کر چکی تھی گویا مرد کا اور کوٹھے کا رشتہ ازلی اور ابدی ہے جس کی راہ میں کوئی بیوی مزاحم نہیں ہو سکتی۔ مگر..... مگر اس بات کا تو کوئی جواز نہیں تھا۔ جب وہ یہ سارا شرمناک منظر دیکھ کر گھبرائی، لجائی، شرم میں ڈوبی ہوئی گرمی میں نہائی گھر واپس لوٹی اور برقعہ اتار کر پھینکا تو گرمی کے سبب بالوں کی لٹیں ادھیڑ عمر کے چہرے پر چپک رہی تھیں۔ سامنے کارنس پر دھرے آئینے میں اس نے اپنی صورت دیکھی اور دل ہی دل میں اپنا اور رقیب کا موازنہ کرنے لگی۔ اپنا ادھیڑ ہوتا اور جلدی تناؤ کھوتا ہوا جسم اُسے میاں کے سامنے بیٹھنے والے لڑکے کے مقابلے میں بالکل بے معنی سا لگا اور جب اس نے اپنے ڈھلے ہوئے سینے چھ سات بچے جننے کے بعد جن میں زندہ ایک ہی لڑکی بچی تھی، اپنے پیٹ کی ملائمیت کے ختم ہو جانے کے بعد اس پر پڑی ہوئی سفید سفید چکتیوں اور آڑی ترچھی لکیروں کی طرف دیکھا، اور اپنی رانوں کا جائزہ لیا جو کبھی درخت کے تنے کی طرح سیدھی اور سخت تھیں مگر اب..... ڈھلے ہوئے بغیر استری والے کپڑے کی طرح شکن دار ہو گئی تھیں تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ساری زندگی اکارت چلی گئی ہو، اور وہ

مقصد پورا نہ ہوا ہو جس کے لئے اسے اتنے سارے لوگوں کے درمیان محمد حنیف ڈھولک اور باجوں کی تیز تیز آوازوں کے درمیان گٹھڑی کی طرح اٹھا کر لایا تھا، مرد کی ہوس کی کوئی حد نہیں ہوتی شاید۔۔۔۔ اور پھر اُس نے زندگی کی بہت سی دوسری مکروہ اور ناگوار باتوں کی طرح اس بات کو بھی تسلیم کرلیا کہ اُس کا ایک اور رقیب بھی ہے جو اَب اس کے بہ نسبت، خاوند سے زیادہ قریب ہے۔

گلی یوں ہی رہی جھوٹن اب اس گلی کو چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا تھا اوز کی چھاتی اب چوڑی قد لمبا اور چہرے پر سبزہ اُگ آیا تھا۔ محمد حنیف نے اب اتنی لمبی داڑھی رکھ لی تھی گویا زندگی بھر اسے منڈوانے کا کفّارہ ادا کر رہا ہو۔ گلی کی اسی نکون والی جگہ پر جہاں کبھی وہ بیٹھ کر جوتیاں گانٹھا کرتا تھا۔ اس کا پان بیڑی کا نیا کیبن، لگ چکا تھا۔ کیبن کے اندر سگریٹوں کی ڈبیوں کے بیچوں بیچ لگے شیشے کے عین اوپر آیتہ الکرسی مترجّم شیشہ لگے فریم میں اُوپر کو ٹنگی ہوئی تھی۔ اور اس کے نیچے محمد حنیف اور اس کا ایک فوٹو، ایک دوسرے کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے آویزاں تھا۔

ایک رات ماجرہ کے پلنگ کے برابر والے پلنگ پر لیٹے ہوئے محمد حنیف نے کہا "میں نے اپنی سمیم (شمیم) کے واسطے چھوکرا ڈھونڈ لیا ہے ری۔ اپنے ہی پیسے (پیشے) کا ہے امیری دکان سے جرا (ذرا) ہٹ کر اس نے نئی نئی دکان کھولی ہے۔ لڑکا سریف (شریف) ہے اور فرمانبردار۔"

محمد حنیف کے منہ سے یہ بات سُن کر ماجرہ کے دل میں نہ جانے کون سی دبی ہوئی، دھیمے دھیمے سلگتی ہوئی چنگاری نے سر اُٹھایا مگر پھر صبر کا ہتھیار استعمال کرتے ہوئے اُس نے اُسے آگ میں تبدیل ہونے نہیں دیا۔ اور ہاں ناں میں کوئی جواب

دیئے بغیر اپنی گوشت چڑھی چوڑی چکلی کمر کو محمد حنیف کی طرف سے پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

اگلے دن صبح ہوتے ہی، محمد حنیف کے دکان پر جانے کے بعد وہ اس لڑکے کو دیکھنے اور اپنے شبے کی تردید کرنے گئی۔ لیکن وہاں جاکر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ انور بے تردید حقیقت بنا پھرتی سے انگلیاں چلا چلا کر گاہکوں کو گلوریاں دے رہا تھا۔ اس کے دل میں کئی جذبوں نے سر اُٹھایا مگر مدتوں پہلے کی طرح اس نے اس فیصلے کو بھی بے چون و چرا تسلیم کر لیا۔

ہاجرہ کونے میں بنی ہوئی کیاری کے قریب پلنگ ڈالے بے سُدھ پڑی سو رہی تھی۔ چاند نے اب اتنا سفر طے کر لیا تھا کہ وہ اس کے مکان سے آگے کے دو منزلہ مکان کے پیچھے جا کر پچھلے گھر کے صحن سے اپنی چاندنی سمیٹ کر لے جا چکا تھا۔ شمیم کے کمرے سے ایک لمبا تڑنگا سایہ دبے پاؤں نکلا۔ باہر آکر اس نے سانس روک کر ایک نظر بوڑھی ہاجرہ کی طرف دیکھا اور پھر دبے قدموں سے چلتا ہوا برابر کے کمرے میں چلا گیا۔

محمد حنیف اور ہاجرہ اب برابر برابر پلنگ بچھا کر نہیں سوتے تھے۔ کیونکہ گھر میں ایک تو داماد تھا، دوسرے اب وہ دونوں عمر کے اس مرحلے میں تھے جہاں کوئی کہیں پڑ رہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔

آنکھیں ملتے ہوئے محمد حنیف نے چونک کر پوچھا۔

"کون؟"

لمبے تڑنگے سائے نے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

تیز تیز سانسوں کے آنے جانے کے دوران، جیسے اندر سے کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا ہو، اس نے مُنہ کا تھوک نگلتے ہوئے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا "میں ہوں انور۔"

"انور جاکر سو جاؤ اب تم میرے داماد ہو۔" نیند کے خمار سے بھری ہوئی آواز نے کہا۔

"نیا دَور" کراچی

محمد احسن فاروقی

فنکار

میں نے اس کو بارہا کئی بس اسٹاپوں پر دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا۔ حد سے زیادہ میلی گدڑی میں لپٹے ہوئے گندی داڑھی والے ایک پیر گھٹنے سے غائب اور سڑتا ہوا۔ ایسے بھک منگوں پر ترس آنے کے بجائے مجھے گھن آیا کرتی تھی۔ مگر آج جیکب لائن کے بس اسٹاپ پر میں اس کے پاس سے گزرا تو اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا جو گندی داڑھی میں قریب قریب چھپا ہوا تھا اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ چہرہ ایک جوان کا تھا اور میرا لاشعور اس سے مانوس معلوم ہوتا تھا۔

"اِدھر آئیے۔" اس نے کہا اور بس اسٹاپ سے وہ اپنی بیساکھیوں پر اچکتا سڑک کے کنارے چلا۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے گھِنیا جاتا تھا مگر اس وقت وہ کچھ اس طرح سے دلچسپ ہو گیا تھا کہ میں اس کے پاس پہنچ ہی گیا۔

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔" اس نے ایسے لہجے میں کہا جو مجھے مانوس معلوم

ہوا۔ اور پھر اس نے آیئے کے بجائے آؤ کہا جس سے مجھے محسوس ہوا کہ یہ مجھ سے برابری جتانا چاہتا تھا

وہ آگے آگے اور میں اس سے کچھ دُور پیچھے پیچھے بڑھتے رہے۔ وہ پھر پھر کر مجھے دیکھتا رہا اور "چلے آؤ" کہتا رہا۔ اس کا دہانا داڑھی مونچھوں میں چھپا ہوا تھا مگر آنکھیں برابر مُسکرا رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون ہے اور کچھ کچھ یاد کر رہا تھا کہ اسے یا اس کے سے کسی کو کہاں دیکھا تھا۔

کوئی چالیس قدم جاکر وہ ایک گلی میں مُڑا اور پھر میری طرف مُڑ کر بولا "زیادہ دور نہیں جانا ہے چلے آؤ۔"

اس گلی کو پار کر کے وہ ایک اور گلی میں مُڑا جو بہت تنگ تھی ایسی تنگ جیسی کراچی میں مَیں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس گلی میں وہ ایک دروازے کے پاس پہنچا اور اپنی گُدڑی میں سے ہاتھ نکال کر دروازے میں لگے ہوئے قفل کو کھولا۔ اور پھر دروازہ کھولا۔ میں نے دیکھا کہ دروازے سے ایک زینہ اُوپر کو جا رہا تھا۔ اس پر وہ بیساکھیاں ٹکاتا ہوا چڑھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چڑھتا گیا۔ اس نے داہنے کو ایک دروازہ کھولا اور بولا "تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ آؤ یہاں کمرے میں بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔"

میں اس کمرے میں داخل ہوا جس کو اس نے کھولا تھا۔ یہ کمرہ نہایت عمدہ سجا ہوا ڈرائنگ روم تھا۔ وہ اس میں سے ہوتا ہوا برابر کے کمرے میں چلا گیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ دروازوں پر بہت اچھے پردے تھے۔ زمین پر نہایت عمدہ قالین تھا جس کنارے دو صوفے سٹ

لگے تھے۔ بیچ میں دو چھوٹی میزیں تھیں جن پر سگریٹ اور سگار کیس اور ایش ٹرے تھیں۔ میں ان چیزوں کو بے خیالی میں ہی دیکھ رہا تھا کہ برابر والے کمرے کے دروازے سے ایک جوان صاف ململ کا کرتہ اور ساٹن کا پاجامہ پہنے ہوئے ہنستا ہوا آیا۔

میرے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔ "اب تم نے مجھے پہچانا کہ نہیں"۔

میں نے غور سے دیکھ کر کہا۔ "تم وہی بھکاری ہو جو مجھے یہاں تک لائے"۔

"بس اتنا ہی پہچانا اور کچھ یاد نہیں آتا"۔ اور یہ کہہ کر وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ میں نے اسے پہچانتے ہوئے کہا۔ "ارے تو وجئی ہے، وجئی؟"

"ہاں"۔

"مگر تو نے یہ سب کیا لگا رکھا ہے۔ تو تو امپیریل سکریٹریٹ میں آ گیا تھا پھر تجھ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ یہاں کب آیا"۔

"میں نے پاکستان آپٹ کر لیا تھا۔ یہاں آ کر دو ہی برس میں سپرنٹنڈنٹ ہو گیا تھا مگر۔۔۔"

"ملازمت چھوٹ گئی"۔

"ہاں مجھے بھی اسکرین کر دیا گیا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک سال گزرا۔ کھو شادی نہیں کی تھی بچے نہیں تھے ورنہ فاقوں پر نوبت آ جاتی"۔

"مگر اب تم یہ کیا کر رہے ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ اس گندے ٹانگ کٹے بدنما کھیوں پر چلتے ہوئے بھکاری کے بھیس میں تم ہی تھے"۔

"بھکاری، کرپیل بگر!" کہہ کر وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا۔ "یہ میرا فن سمجھو میری بزنس۔ میری شاپ۔ ہم تم کوئی چودہ برس کے بعد ملے ہیں۔ میں نے بارہا تمہیں دیکھا

مگر تم نے میری طرف رُخ ہی نہیں کیا۔ آج جا کر متوجہ ہوئے۔ آئی ڈونٹ مائنڈ ٹاک ننسپل
اس کو چھوڑو۔ اب میں وہی ہوں جو تمہارا ہم جماعت تھا۔ کتنے برس ہو گئے۔
۱۹۴۶ء سے ۱۹۶۰ء چودہ برس ہو گئے۔"

"تم ۱۹۴۶ء ہی میں امپیریل سکرٹریٹ میں آ گئے تھے اور دلی چلے گئے تھے۔"

"اور ۱۹۴۷ء میں میں نے پاکستان آپٹ کیا اور ۱۹۴۸ء میں اسکرین ہو گیا۔"

"اور پھر یہ بھکاری بن گیا۔ کیا تو ہی بھکاری ہے یا کوئی اور؟ یقین نہیں آتا۔
اتنی گندگی لادتا ہے۔ تجھے گھن بھی نہیں آتی۔"

"میں کہتا ہوں دماغ پر گندگی لاد لینے سے جسم پہ گندگی لاد لینا بہتر ہے۔ کیا
بتاؤں تجھ سے، پہلے پہلے یہاں محسوس ہوا کہ بہت اچھا ہوں مگر پھر لیاقت علی خاں
کے قتل کے بعد ہر روز سر پر ایسے ایسے احمق سوار ہونے لگے۔ ایسی ایسی حماقت زدہ
باتیں کرتے کہ دماغ ہل ہل جاتا۔ اور اف۔ اف۔ سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ کوئی
احمق کے ماتحت آ جاتے۔ سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ گدھوں کے ہاتھ میں انتظام
چلا جائے۔ کیا بتاؤں میں کیسا کھول کھول کر رہا۔ مگر برداشت کرتا رہا۔ اور پھر گدھوں
نے مجھے اسکرین کرا کے ہی چھوڑا۔"

"ہاں یہ تو میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ احمق کی ماتحتی میں کام کرنا کیسا جہنم ہے۔
مگر میں نے احمقوں کو چلانا بھی سیکھ لیا ہے۔"

"میں بھی سیکھ جاتا شاید۔ مگر اسکرین ہی ہو گیا۔ اس فلیٹ پر میں نے پہلے
ہی قبضہ کر لیا تھا۔ بس یہ میرے پاس تھا اور میں سڑکوں پہ پھرنے لگا، کئی فرموں میں
نوکری کی مگر وہی احمق راج، تجارت کے لئے پیسہ پاس نہ تھا۔ ایک دن رات گئے

اس گلی میں آیا تو دو آدمی باتیں کرتے سنائی دیئے۔ ایک آواز آئی "میری تو پینتالیس کی رہی آج۔" دوسری آواز آئی "مجھے پورے باون ملے۔" میں ان کے قریب آیا تو دیکھا کہ دونوں بھکاری تھے۔ میں نے دل میں کہا "آئیں۔ ان بھکاریوں کو اوسطاً پچاس روز مل جاتے ہیں۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ مہینہ اور میں ہوں کہ پانچ چھ سو کی نوکریوں کی تلاش میں پھرتا ہوں۔ جوتے کھاتا ہوں، کھولتا ہوں۔"

"تو تو بھی بھکاری بن گیا۔"

"میرے دل میں بھی آئی کہ بھکاری بن جاؤں۔ تمہیں یاد ہے کہ ایک وہ محمود تھا نہیں اپنے ساتھ جو بی۔ اے کے بعد ساٹھ روپیہ کی نوکری پر گیا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر سو روپیہ ماہوار پر سڑکوں پر جھاڑو دینے کی نوکری مل جائے تو اسے کرلوں مگر سڑکوں پر جھاڑو دینے والے کو اس وقت کوئی دس بارہ روپیہ ہی ملتا تھا، اس لئے وہ ساٹھ روپیہ کا کلرک ہی رہا۔ ہمارے یہاں فقیروں کو بھی زیادہ سے زیادہ آٹھ دس آنے روز مل جایا کرتے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہاں بڑا شہر ہے دو چار روز مل جاتے ہوں گے حد سے حد پانچ۔ مگر یہ سن کر کہ ان دو بھکاریوں کو چالیس سے پچاس کے درمیان ملے تھے میں سوچنے لگا کہ مارا مارا پھرنے کے بجائے اگر یہی کرنے لگوں تو کیا ہو۔ مگر اس کام کے لئے مجھے اپنے کو اچھی طرح چھپانا ضروری تھا ورنہ پہچاننے والے بہت تھے۔ بڑی ذلت ہوتی۔"

"تو تو نے یہ سب کیا۔ وہ سامان اوڑھ لیا اور اس میں چھپ گیا۔"

"نہیں یار، یہ کام بھی اکدم سے نہیں ہو جاتا ہے اس کے لئے بھی تعلیم، مطالعہ، استاد، ٹیلنٹ سب ہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور کافی دیر میں یہ فن آتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شاعری کے فن کی طرح یہ بھی ایک فن ہے۔"

"مگر شاعر بھک منگا تو نہیں ہوتا۔"

"بڑے شاعر اپنی خودداری پر قائم رہے مگر اصل میں وہ بھی دست نگر ہی تھے۔ میر صاحب آصف الدولہ سے اکڑ گئے۔ کہو آصف الدولہ بڑے نیک بادشاہ تھے نہیں تو بھوکوں مر جاتے۔ مگر انشاء وغیرہ کو دیکھو۔ ذل چٹے بھک منگے نہیں تھے تو کیا۔ خیر اِن سب کو جانے دو جن کے نام تاریخ میں آ گئے ہیں۔ میں اپنی طرف ہر تعلقہ دار کے یہاں ایک شاعر بھی دیکھتا تھا جو کسی طرح بھک منگوں سے مختلف نہیں ہوا کرتا تھا۔ بہرحال میں نے پہلے غور کرنا شروع کیا کہ اس پیشے کی ذلت سے دِل کو جو جھجک محسوس ہوتی تھی اس پر قابو کر لوں۔ سوچتے سوچتے یہ سمجھ میں آیا کہ دنیا بھر میں اسی فی صد لوگ بھک منگوں کی ذہنیت رکھتے ہیں۔ ہر دفتر ہر ادارے۔ ہر کام میں بھیک دینے والے اور بھیک لینے والے ہی نظر آئے۔ ہر ایک اپنے اوپر والے سے یہاں بھیک ہی مانگتا ہے اور اپنے سے نیچے کو بھیک دیتا ہے۔ اگر میری ذہنیت بھک منگے کی ہوتی تو کبھی اسکرین نہ ہوتا۔"

"بات تو تُو سچ ہی کہہ رہا ہے۔ مگر اس میں مبالغہ بھی شامل ہے۔"

"مبالغہ بالکل نہیں یہاں قانون قاعدے اور انصاف کا خیال نہ ہو وہاں سب یا لوڈاکو ہو جاتے ہیں یا فقیر۔"

"تو تُو بجائے فقیر کے ڈاکو بنتا۔ اس میں لاکھوں کے وارے نیارے ہوتے۔"

"اس میں بڑی جلدی پکڑا جاتا۔ سب کمائی نکل جاتی۔ ڈکیتی جرم ہے۔ بھیک مانگنا جرم نہیں ہے۔ ڈکیت سے ہر شخص خفا ہوتا ہے۔ فقیر پر ہر شخص ترس

کھاتا ہے۔ غرض ایک ہفتہ کے اندر ہی میں نے اپنے دل کو بھک منگا بننے پر راضی کر لیا۔ اب سوال آیا عمل کا تو میں اب ہر بس اسٹاپ پر جا کر کھڑا ہوا اور وہاں سے گزرتے ہوئے ہر فقیر کو بغور دیکھا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ اسّی فی صدی بنے ہوئے ہیں۔ اپنے کو گندہ بنا رکھا ہے تاکہ کوئی غور سے نہ دیکھے۔ مجھے بھی ان کی گندگی پر پہلے پہلے بڑی گھن آئی۔ مگر بعد میں محسوس ہوا کہ خوشامدی اپنے دہن اور ذہن دونوں کو پست پراگندہ بنائے رہتے ہیں تاکہ ان کو دینے والا ان سے خوش رہے۔ ہر قسم کی ذہنی کثافت اوڑھتے ہیں تاکہ ان کے اندر چھپی ہوئی روح دکھائی نہ دے۔ پھر دوسری چیز یہ نظر آئی کہ جتنی ترس ناک صورت بنائی جائے گی اتنا ہی زیادہ بھیک ملنے کے امکان ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں بھی خوشامدی لوگوں کا فقیروں سے مقابلہ کیا۔ وہ بھی بوس کو خوش کر کے اپنا رونا رونے لگتے ہیں اور اپنے کو ترس کے قابل ثابت کر دیتے ہیں۔"

"یہ سب ٹھیک ہے مگر تجھے یہ ظاہری سامان کہاں سے ملا؟"

"خیر جب میں نے طے کر لیا کہ بھک منگا ہی بنوں گا تو پھر ایک اُستاد کی ضرورت ہوئی اور وہ بھی مل گیا۔"

"کسی بھک منگے سے تجھے یہ سب سیکھنا پڑا۔ خود نہیں کر سکتا تھا۔"

"کہہ رہا ہوں تجھ سے کہ یہ فن ہے، فائن آرٹ ہے۔ ایسے ویسے ہی آجاتا؟ خیر سن تو مجھے استاد بھی کیسا ملا۔ تجھے بڑا تعجب ہوگا۔"

"تعجب کی کیا بات؟"

"وہ اُستاد نہیں اُستانی تھی۔ مرد نہیں عورت تھی۔"

"عورت؟ عورت جب صاف ہو تو اس سے زیادہ صاف چیز ممکن نہیں۔ اور وہ

جب گندی ہو تو اس سے زیادہ گندی تو کوئی گندی گڑھیا بھی نہیں ہوتی۔ کوئی بوڑھی۔ گندی، بڑی ہی گندی عورت ہوگی، اس کا ذکر نہ کر مجھے سوچ کر ہی گھن آرہی ہے۔"

"سُن تو سہی۔ میری فن کاری تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ میری استانی کے فن کو نہ جانے۔ یہ کلیہ تو ہم نے ساتھ پڑھا تھا کہ فنکار کی روایت کا مطالعہ ضروری ہے۔"

"اچھا خیر بتاؤ۔ وہ کون تھی اور کیسی تھی۔"

"تجھے دکھا بھی دوں گا کہ کون ہے اور کیسی ہے۔"

"میں دیکھنے سے باز آیا۔ اپنا قصہ سُنا۔"

"جس دھج کا تو نے مجھے دیکھا بالکل اسی طرح کا ایک فقیر تھا اور اس کے ساتھ ایک عورت پھرتی تھی۔ سانولا رنگ، منہ پر قسم قسم کے میلے دھبے۔ ناک پر ایسا نشان، جیسے کسی نے ناک کاٹنے کی کوشش کی ہو۔ آنکھیں چندھرائی ہوئی اور پانی بہتا ہُوا، بال بکھرے ہوئے اور لٹیں پڑی ہوئی جو منہ پر لٹکتی تھیں۔ کپڑے حد سے زیادہ میلے۔ ناک بھی بہتی ہوئی تھی۔ اور بار بار اپنی حد سے زیادہ میلی چادر سے پونچھ لیتی تھی۔ فقیر بہت بڈھا تھا۔ اور بس اسٹینڈ پر آکر گر جایا کرتا تھا۔ فقیروں کا مطالعہ کرنے میں میں نے ان کو بار بار غور سے دیکھا۔ شاید اس لئے اور بھی ان کو ضرور دیکھا کہ ان سے زیادہ گندے ممکن ہی نہیں تھے۔ عورت کی حد سے زیادہ گندگی کے پیچھے مجھے کوئی پُراسرار بات نظر آئی۔ میں ان کو ہر پھر کر دیکھنے آتا اور ایک دن جب وہ جانے لگے تو ان کے پیچھے ہولیا۔ بڈھا بڑی مشکل سے چل پاتا تھا۔ عورت اسے سہارا دیتی تھی۔ آخر کو انہوں نے رکشہ کی۔ میں نے بھی ایک رکشہ کی

اور کہا کہ ان کے پیچھے پیچھے چلو۔ دونوں رکشے آگے پیچھے چلتے رہے اور ڈی سلوا ٹاؤن پہنچے۔ میری جیب میں کل پانچ روپیہ کا نوٹ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر رکشہ کا کرایہ زیادہ ہو گیا تو کہاں سے دوں گا اور پھر واپسی کیسے ہو گی۔ مگر میں نے دیکھا کہ آگے کا رکشہ ایک ادھ بنے بغیر پلاسٹر کے بنگلے پر جو سب سے الگ تھا رُکا۔ وہ دونوں اُتر ہی رہے تھے کہ میں نے اپنا رکشہ بھی رکوا دیا۔ کرایہ کوئی چار کے قریب ہوا تھا۔ وہ میں نے ادا کیا اور لپکتا ہوا ان دونوں کی طرف بڑھا۔ وہ بنگلے میں چلے گئے۔ میں سٹ پٹا کر رہ گیا۔ وہاں اس وقت تک بہت ہی کم آبادی تھی۔ اور بس لینے کے لئے کافی دور جانا پڑتا تھا۔ کچھ دیر میں سوچتا رہا کہ اگر ان لوگوں سے ملاقات نہ ہوئی تو پھر کوئی بات نہ ہوئی۔ مکان سے کچھ دور پر میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا پھر خیال آیا کہ بھیک مانگنے کا عمل شروع کرنے کے لئے اچھا موقع ہے۔ میں اُٹھ کر اس ادھ بنے بغیر پلاسٹر کے گھر کی طرف بڑھا اور جدھر سے وہ دونوں گئے تھے وہاں پہنچ کر آواز لگانے کی کوشش کی منہ سے آواز نہیں نکلی۔ کئی دفعہ کوشش کر کے میں نے کہا "اللہ کے نام پر۔۔۔" اور پھر آگے سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ خیر اتنی ہی آواز کارگر ہو گئی۔ سامنے کی طرف ایک کھڑکی تھی اس میں سے ایک جوان لڑکی سانولی رنگت کی جھانکی۔

"یہ وہی گھنونی عورت تھی؟"

"اس وقت بالکل یقین نہیں ہوا کہ وہی تھی۔ اس کی سانولی رنگت میں عجیب کیف تھا۔ چہرے پر کہیں کوئی دھبہ یا نشان نہ تھا۔ ناک پر کٹے کا نشان بھی غائب تھا۔ آنکھیں کٹورا ایسی کھلی تھیں اور وہ ایک ہی جھلک میں مجھے صفائی اور

نفاست کا مجسمہ نظر آئی۔ میں پھر آواز لگانا بھول ہی گیا۔ وہ کھڑکی سے غائب ہو گئی۔ پھر اس جگہ سے آواز آئی جو مکان کا خاص دروازہ ہونے والا تھا اور جس میں ابھی دروازہ نہیں لگا تھا۔" ادھر آجائیے" میں ادھر گیا وہ دیوار کی آڑ میں رہی اور کہتی رہی۔ " میں اس وقت بڑی مشکل میں ہوں۔ میرے والد کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ دوا کی سخت ضرورت ہے۔ آپ پر میں اعتبار کر کے روپے اور نسخہ دیتی ہوں۔ جلد سے جلد جا کر دوا لا دیجئے۔ مجھے آپ کی صورت دیکھتے ہی آپ پر اعتبار ہو گیا اور آپ یہ کام ضرور کر دیں گے جلدی۔" اور یہ کہہ کر اس نے نسخہ اور پچاس روپیہ کے نوٹ آڑ سے ہاتھ بڑھا کر مجھے دیئے۔"

" تو وہ روپیہ لے بیٹھ رہتا تو وہ کیا کر لیتی۔"

" کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ مگر یار کچھ باتیں بڑی پر اسرار ہوتی ہیں اور انسان کو بری طرح باندھ لیتی ہیں اس کے اعتبار نے میرے دل سے ہر خیال نکال دیا۔"

" اور یہ بھی تو کہہ کہ اس کے حسن نے باندھ لیا۔"

" ایک حد تک یہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر اس وقت میرے اندر وہ انسان جاگ گیا جو اعتبار کرنے والے کو دھوکہ دینے سے گریز کرتا ہے اور پھر میرے اندر ایک عزم بھی پیدا ہو گیا جس کے ماتحت میں لپکتا ہوا بس اسٹینڈ کی طرف چلا۔ اتفاق سے ایک رکشہ بھی جاتی دکھائی دی اور اس پر بیٹھ کر ناظم آباد تک پہنچا جہاں اُتر کر دوا فروشوں کی دکانوں پر میں نے نسخہ دکھایا چھتیس روپیہ کی دوا ملی اور میں اسے لے کر پھر رکشہ پر روانہ ہوا اور اس گھر پر پہنچ گیا۔ جب میری رکشہ اس گھر پر پہنچی تو وہ کھڑکی پر آئی۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی مگر مجھے دیکھتے ہی وہ کھل کر بولی۔" چلے آئیے۔"

میں دروازے پر پہنچا اور رُک گیا۔ پھر آواز آئی "اندر آجائیے نا" میں اندر گیا۔ ایک ادھ بنے کمرے سے ہو کر دوسرے کمرے میں پہنچا جو ہر طرح مکمل تھا۔ یہاں مسہری پر جس پر نہایت صاف بستر تھا ایک بڈھا پڑا بڑی لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ دوا میں نے اس لڑکی کو دے دی تھی۔ اس نے مجھے مسہری کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود دوا بنانے لگی۔

"آپ انھیں سنبھال کر اٹھا لیجئے" اس نے کہا

میں نے بڈھے کو بلیٹھ کے نیچے ہاتھ لگا کر اٹھایا اور اس نے اس کے منہ میں دوا ڈال دی۔ بڈھے نے کچھ منہ بنایا۔ اس کے سانس میں کچھ فرق آیا۔ میں نے اسے لٹا دیا اور وہ سونے سا لگ گیا۔ ہم دونوں بستر کے پاس کھڑے ہوئے کافی دیر تک اس کی حالت کو دیکھتے رہے پھر وہ غافل ہو گیا۔ اس نے پھر مجھے بیٹھ جانے کو اشارہ کیا اور خود بھی ایک اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ بڈھا خراٹے لینے لگا۔

"اب ٹھیک ہو گئے" وہ اطمینان کی سانس لیتے ہوئے بولی "میں نے برقعہ اٹھا کر دوا لینے کے لئے جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ آپ کی آواز آئی۔ آپ کیا چاہتے تھے۔ اب بتائیے"

"میں بھیک منگا بننا چاہتا ہوں اور اس کی پہلی کوشش میں نے آپ کے دروازے پر کی"

"مگر ناکام رہے یہ فن بڑی مشکل سے آتا ہے" وہ مسکرا کر بولی اور اپنے سفید دوپٹے کو جو اس کے رنگ پر کھیل رہا تھا سر پر سنبھالا۔ اور اور کہتی رہی "آپ کئی دن سے ہم لوگوں کے پاس آ آ کر جاتے رہے اور آج آپ نے ہمارا صاف بیچا کیا۔

میں نے ابا سے کہا کہ یہ مرد ہم لوگوں کے پیچھے لگا ہے۔ انھوں نے اپنے تجربے سے کہا شاید وہ بھی ہمارے پیشے میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ اچھا اگر اور قریب آیا تو اسے راہ سے لگائیں گے۔ یوں باتیں کرتے کرتے ان پر دورہ پڑا میں نے دوا کی شیشی دیکھی سب دوا ختم ہو چکی تھی۔ میں نے برقعہ اٹھایا ہی تھا کہ آپ کی آواز آئی۔"

"آپ کو یہ خیال نہیں ہوا کہ میں پچاس روپیہ لے کر بھاگ جاؤں گا؟"

"ہرگز نہیں۔ آٹھ برس سے چہرے دیکھتے دیکھتے مجھے آدمی کی پہچان ہو گئی ہے اور آپ کا پریشان چہرہ کھویا کھویا کسی تلاش میں۔ روز ہی دیکھا کرتی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آپ ہم لوگوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ کیوں ہے نہیں؟"

"میں نے کہا بات یہی ہے۔"

"اچھا تو پھر آپ میرے ان والد کی جگہ لے لیں۔ یہ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ میں آپ کو ان کی طرح سجا دوں گی، کل صبح تڑکے ہی آجائیے۔"

"میں نے سوچا کہ میری جیب میں قریب بارہ آنے ہی ہیں۔ اس وقت جاتا کل پھر آنا پیسوں کی ضرورت ہو گی۔ خیر گھر پر یعنی یہاں میرے پاس پیسے تھے اس لئے میں نے اس سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس نے خود کہا "پیسے نہ ہوں تو میں دے دوں۔" مگر میں نے کہا "ابھی اس حد کو نہیں پہنچا ہوں۔" اور اس کے بعد میں اس کے یہاں سے چلا آیا۔

"واہ میں تو سمجھا تھا کہ رات کو تو وہیں رہ گیا اور اس لڑکی سے اختلاط ہو گیا۔"

"اور کوئی لڑکی ہوتی تو یہ ممکن تھا۔ مگر وہ لڑکی عجیب چیز تھی اور اب بھی عجیب ہے میں تجھے دکھاؤں گا۔ وہ بالکل استانی ہے بالکل۔ آٹھ برس بھیک مانگنے نے

اسے بڑا پکا کر دیا تھا۔ اور تُو اس سے باتیں کر کے دیکھے گا کہ اس کا ذہن کس قدر پختہ ہے۔ خیر دوسرے دن میں آ گیا۔ بڈھا ٹھیک تھا۔ لڑکی گھناؤنی بن چکی تھی۔ اور مجھے دیکھ کر ہنسی، اس نے اپنے باپ کے فقیروں والے سب کپڑے مجھے پہنائے میری ٹانگ ٹیڑھی کر کے اس پر قیمہ اور جھلی باندھی۔ بیساکھیاں دیں۔ غرض میں نے قدِ آدم آئینے میں جو اس لڑکی کے کمرے میں رکھا تھا دیکھا تو میں بالکل فقیر معلوم ہوتا تھا اپنے کو پہچان نہیں سکتا تھا۔"

"مگر اس بڈھے کے چہرے پر جھرّیاں ہوں گی اور تیرا چہرہ تو صاف ہے۔"

"داڑھی مونچھوں، گندے دھبوں، ناک، گال، ماتھا سب ہی پر میل لگا لینے سے میرا خیال بھی اس طرف نہیں گیا کہ میرے چہرے پر جھرّیاں ہیں بھی کہ نہیں۔ اور بھیک دینے والوں میں چہرے کو کون غور سے دیکھتا ہے۔ ادھر میری دھج دیکھ کر لوگ مُنہ پھیر لیتے ہیں اور زیادہ تر منہ پھیر کر ہی پیسے پھینکتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ پہلے ہی دن مجھے چیسٹرٹن کا وہ قول یاد آیا جو میں نے اور تُو نے ایک ساتھ پڑھا تھا کہ لوگ ایک دوسرے کو غور سے دیکھتے ہی نہیں اور خاص پیشوں کے آدمیوں کی تو محض وردی ہی دیکھتے ہیں۔ یاد ہے نا تجھے وہ فادر براؤن والا قصہ اور اس شخص کا کیا نام ہے اس کا جو ڈاکئے کی وردی پہن کر صاف نکل جاتا ہے اور کوئی اس پر شبہ بھی نہیں کرتا کہ یہ مجرم ہے۔"

"ٹھیک ہے میں تجھ سے بارہا ملا مگر کبھی تجھے غور سے نہیں دیکھا۔"

"تو خیر کئی دن تک میں اور وہ لڑکی ساتھ ساتھ بھیک مانگتے رہے۔ میں اسے یہاں بھی لایا۔ مجھے اس سے محبت ہو گئی اور میں نے اس کے باپ کی اجازت سے اس سے نکاح کر لیا۔ اس کے بعد وہ میرے ساتھ نہیں آئی۔ میں خود رواں ہو گیا

ہوں ہر صبح آٹھ بجے سے کام پر آتا ہوں۔ ۔ ۹ بجے تک کم سے کم پچاس کما لیتا ہوں کبھی اس سے پہلے ہی پچاس ہو جاتے ہیں تو یہاں آکر وہ کپڑے اُتار دیتا ہوں اور گھر چلا جاتا ہوں۔ یہ فلیٹ میرا اسٹوڈیو سمجھو۔ گھر وہی ہے چل میں تجھے دکھاؤں۔"

وہ فلیٹ کے اندر والے کمرے میں گیا۔ اور وہاں سے پورا آپ ٹو ڈیٹ جنٹلمین بن کر آیا۔ ہم دونوں فلیٹ میں قفل ڈال کر باہر سڑک پر آئے۔ وہ ایک گراج پر پہنچا اور وہاں گراج والوں کو پیسے دے کر ایک نہایت نفیس فوکس واگن کار میں بیٹھا۔ اور مجھے ساتھ لے کر روانہ ہوگیا۔ وہ بولا "کار میں یہاں چھوڑ دیتا ہوں۔ ان سے حساب ہے کچھ پیسے اور دے دیتا ہوں فلیٹ پر پہنچ کر ڈریس بدلتا ہوں اور کام ختم کر کے پھر یہاں آجاتا ہوں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں کسی بڑے دفتر میں ملازم ہوں۔"

غرض ہم دونوں ڈی سلوا ٹاؤن پہنچے اور ایک مکمل بنگلے پر اُترے اُس نے گراج پر گاڑی کھڑی کی اور باہر آکر کہا "یہ وہی بنگلہ ہے جس سے میرا قصہ شروع ہوتا ہے۔ اب ہم نے اسے مکمل کر لیا ہے۔ چار برس میں۔"

وصی نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ میرے پاس آکر بیٹھا اور آواز لگائی "آجاؤ تا سمینہ شرم کا ہے کی۔"

سمینہ داخل ہوئی، اسے دیکھ کر مجھے اپنے دیہات کی وہ لڑکیاں یاد آئیں جن کا ناک نقشہ بس واجبی واجبی اچھا ہوتا تھا۔ مگر سانولی رنگت کا نمک خاص طور پر جاذب نظر ہوا کرتا تھا۔ مگر سمینہ ان سب سے ان معنوں میں بہتر تھی کہ اس کے چہرے پر ایک خاص ذہانت معلوم ہوتی تھی کہ زندگی کے تجربے نے اس میں ایک بردباری اور ایک توازن پیدا کر دیا تھا جو دیہاتی پن کا بالکل متضاد تھا۔ وہ کھانے کی میز پر

کھانے کا سامان ٹھیک کرنے لگی اور میں نے وصی سے کہا یہ تو بڑا خوش قسمت ہے ایسی بیوی کہیں ڈھونڈنے نہ ملتی اور تجھے آسمان سے ٹپک کر مل گئی۔"

"بیوی نہیں، ہر بات میں میری اُستانی ہے۔"

سمینہ کے ساتھ ہم میز پر بیٹھے وہ مسکرائی اور بولی"۔ جلد سے جلد میں ان سے یہ کام چھڑانے والی ہوں۔ ایک زمین اور لے لی ہے۔ اس پر مکان بن جائے بس اسکے کرایہ سے اس مکان میں رہا کریں گے۔ وہ فلیٹ بھی جو ان کا ہے کام ختم کرنے پر بک جائے گا اس کے روپیہ سے بھی کوئی آمدنی کرلیں گے۔ انہوں نے موٹر لے لی نئی، ورنہ اب تک سب ٹھیک ہو جاتا۔ خیر اچھا ہوا موٹر بھی ضروری چیز ہو گئی ہے۔ آج کل۔"

"مگر فن کار اپنا فن کبھی چھوڑتا ہے۔ اس پر چلنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

وصی نے کہا"۔ مگر یہ فن ایسا نہیں ہے۔ ان کے والد نے یہاں آکر اختیار کیا۔ بور ہو گئے تھے۔ میں ان کا نمائندہ بنا۔ وہ ایک دن چل بسے۔ سمینہ بھی بور ہو گئی تھی کیوں سمینہ؟"

"ہاں جن کاموں کی عادت ہو جاتی ہے انہیں کرتے اچھا لگتا ہے۔ مگر یہ کام ایسا ہے کہ عادت نہیں پڑتی اور طبیعت اس سے الگ ہو جانے کو چاہتی ہے۔ ابا مرحوم نے موقع ملتے ہی چھوڑ دیا۔ میں نے بھی موقع ملتے ہی چھوڑ دیا اور یہ بھی دل پر جبر کر کے ہی کر رہے ہیں۔ جتنا ہم لوگ خرچہ کرتے ہیں اتنی آمدنی کا جس دن مستقل سلسلہ ہوا۔ بس یہ کام چھوڑا۔ اور شریفوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگیں گے۔"

"تو یہ فن نہیں پیشہ ہے۔ ہر پیشے کے لوگ اپنا کام نبھاتے ہیں اور جب موقع ملتا ہے کام سے سُبکدوش ہو جاتے ہیں۔

"نہیں، میں تو اسے فن ہی کہوں گا اور پھر ہر پیشے کو ٹھیک طور سے کرنے کے لئے فن درکار ہے۔ گو فن کے معنی پیدائشی فن کے لے رہا ہے ان فنون میں یہ نہیں ہے مگر بغیر فن کے یہ چل نہیں سکتا۔ سمینہ کے والد نے اسے فن کی طرح برتا۔ اس نے بھی یہی کیا اور مجھے بھی فن کی طرح سکھایا اور میں فن ہی کی طرح برت رہا ہوں۔"

"سیپ" کراچی

نصیر انور

مواد

پمّی اس وقت مویشیوں کو چارہ ڈال رہی تھی۔

میں دبے پاؤں اُس کے قریب پہنچا اور اُسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ مویشیوں کی بُو میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک خوب صورت گائے عورت بن کر میرے سینے سے لگی ہے۔ میں نے پیاری سی گائے کے ہونٹ چوم لئے۔ شاید اس کے ہونٹ پہلی بار کسی کے ہونٹوں سے مَس ہوئے تھے اور وہ نہیں جانتی تھی کہ چومنا کیا ہوتا ہے کیونکہ جب میں اُسے چوم رہا تھا تو اُس کی آنکھیں کھُلی تھیں۔

میری آنکھوں کے سامنے پروین آگئی، جسے زندگی میں پہلی بار میں نے چُوما تو اُس نے بیزاری سے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ "توبہ! جنگلی۔ چومنا بھی نہیں آتا۔"

—— اور پھر دوسرے ہی دن اُس نے مجھے ایک کتاب دی "ہنڈرڈ ویز آف کسنگ"

—— مگر اُس وقت خوب صورت گائے کو سینے سے لگائے سو طریقوں کے ایک ہی سیدھے سادے طریقے نے ہونٹوں میں زندگی کی وہ میٹھی سی حرارت پیدا کر دی

جو سارے جسم میں پھیلتی گئی۔

یکایک جسم میں ایک تھرتھری سی ہوئی۔ آہٹ نے چونکا دیا۔ پلٹ کر دیکھا کوئی نہیں تھا مگر قدموں کی چاپ قریب تر آتی گئی۔ یہاں تک کہ ماسی دُرد آنہ سامنے آگئی۔ اُس کے آنے سے پہلے ہی میں سنبھل چکا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں میں اپنے آپ کو اپنے ہی آپ میں چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے بے ساختہ بے ہنگم لہجے میں کہا۔ "دیکھا ماسی، یہ پھپھّی مجھے کلاڑی بنا کر نہیں دیتی۔"

ماسی نے اپنی بہن پر اتراتے ہوئے کہا۔ "تمہاری ماں ٹھیک ہی کہتی تھی کہ تم نہیں بدلے —— لو میں اپنے بیٹے کو ابھی کلاڑی کھلاتی ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی۔ لسی کی مٹکی اٹھائی۔ ہمیں ساتھ چلنے کو کہا۔ آنگن میں پہنچے تو میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور پھپھّی سمٹی سمٹائی مویشیوں کو چارہ کھلانے کے بہانے وہاں سے کھسک گئی اور اس کے ساتھ ہی میرا دل بھی۔ تو دہی کھسکنا چاہتا تھا مگر ماسی آنکھوں کے سامنے تھی۔ اُس نے لسی دیگچی میں انڈیلی اور دیگچی چولہے پر چڑھا دی۔ یہ چولہا ہمیشہ گرم ہی رہتا۔ چولہے میں آگ نہ ہو تو خیال کیا جاتا کہ گھر میں نحوست ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ماسی نے لسی میں دودھ ملایا۔ دودھ کے پھٹ جانے پر پانی الگ ہوا تو اُسے ایک پوٹلی میں چھان لیا۔ پوٹلی میں جو بچ رہا اس کی روٹی سی بنا دی یہی کلاڑی تھی، پنیر سے ملتی جلتی۔

"لو بیٹے کھالو۔" ماسی نے تام چینی کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ پلیٹ سامنے رکھ لی اور کلاڑی کھاتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ کلاڑی کھانے سے ماسی یہ سمجھتی ہے کہ میں نہیں بدلا۔ اُسے کیا معلوم کہ میں اور ڈیڈی کتنے بدل چکے ہیں۔ بالکل اسی طرح

جیسے دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ بدل چکا ہے ـــــ ہاں، ایک امی ذرا ابھی تک دیسی ہیں تو کیا ہوا! ہم تو بدل چکے ہیں۔ ڈیڈی ممی کہنے والے یہاں سے گئے تو میں اپنے بابا اور امی کو امریکی لہجے میں ڈیڈی اور ممّی کہنے لگا۔ یہی لہجہ اختیار کرنے پر ڈیڈی کی شان بڑھی۔ شان پیسے سے بڑھتی ہے اور اس کے ساتھ ہی آن بھی۔ اسی آن بان سے اپنے ڈیڈی لیڈر بھی ہو گئے۔ آزادیٔ کشمیر کی تحریک کے سرگرم رکن۔ شہدائے کشمیر کا یوم آئے یا آزاد کشمیر کا، ڈیڈی بھرے جلسے میں دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں۔ غاصبوں کے خلاف زہر اُگلتے ہیں اور آخر میں ہمیشہ یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ دن قریب آ رہا ہے جب فرزندانِ توحید قصرِ گپکار کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے......"

ڈیڈی کی یہ تقریریں سنتے سنتے میں جوان ہو گیا۔ اس دوران میں نے یہی دیکھا کہ ایک ایک اینٹ جمع کر کے میرے ڈیڈی نے پہلے آزاد کشمیر میں، پھر راولپنڈی اور اب لاہور میں کئی کوٹھیاں کھڑی کر لی ہیں۔

میرے خالو کا کا کبیر جو اکثر کہا کرتے ہیں کہ تمہاری ہر کوٹھی قصرِ گپکار ہے۔ تم کبھی نہیں چاہتے کہ کشمیر کو آزادی نصیب ہو۔ تمہیں خطرہ ہے کہ کہیں تمہارے نصیب ہی نہ بدل جائیں۔ یہ کا کا کبیر جو نہیں بدلے۔ ڈیڈی ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ وہ نرے جذباتی آدمی ہیں۔ کشمیر کی سرحد پر رہ کر کشمیر لینا چاہتے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کا تصفیہ تک نہیں۔ مسئلۂ کشمیر وہیں طے ہو گا مگر وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ الٹا ہمیں طعنہ دیتے ہیں کہ مسئلۂ کشمیر کی بدولت ہی تمہاری شان و شوکت ہے۔

ڈیڈی ٹھیک ہی کہتے ہیں مگر جانے کیوں مجھی کو دیکھ کر یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ کا کا کبیر جو سچے اور مخلص ضرور ہیں۔ اسی لئے انھوں نے آزاد کشمیر کے

کچے کوٹھے ہی میں اپنے کردار کو پختہ بنائے رکھا۔ آزادیِ کشمیر کے لئے جنگ ہوئی تو وہ
اپنے جوان بیٹے نورالدین کے ساتھ محاذ پر لڑتے رہے۔ محاذ پر نورالدین شہید ہوا۔
وہ آج بھی بڑے فخر سے اُس کی شہادت کا واقعہ بیان کرتے ہیں تو دل ہی دل میں
شرمندہ ہوتا ہوں کہ میرے ڈیڈی نے جنگ کے دوران مجھے ایبٹ آباد بھجوا دیا تھا
اور خود فائربندی کے بعد بڑے شہروں میں تقریریں کرتے ہوئے سرحد پار سے آئے
ہوئے مہاجرین کے لئے کپڑا لتّا اور چندہ جمع کرتے رہے۔ اُس وقت ایک امی تھیں
جو ابھی تک کچھ ویسی ہی ہیں۔ مجھ سے کہا کرتیں "کاش تو بھی نُندا ہوتا!"

نورالدین کو پیار سے نُندا کہتے تھے۔

میں بھلا نُندا کیسے ہو سکتا تھا۔ کانونٹ میں تعلیم پائی یسوع مسیح کا پیروکار نہ بنا
تو مسلمان بھی نہ رہا۔ سکول سے کالج تک ایسے ماحول میں رہا کہ اپنے ہی گھر میں اجنبی
ہو گیا۔ نورالدین میری طرح نہیں بدلا تھا۔ اُسے کاکا کیر جُو ہمیشہ یہ کہتے کہ "دیکھو بیٹے،
زندگی یہی ہے کہ اپنی سرزمین کو آزاد کرائیں"۔ —— اور میرے ڈیڈی مجھے قائل
کرلیتے کہ "دیکھو بیٹے، جذباتی ہونے سے زندگی کسی کام کی نہیں رہتی۔ دیکھو تمہیں
میری طرح اپنا اثر و رسوخ بڑھانا ہے۔ قوم کی راہنمائی کرنی ہے۔ بڑے لیڈروں کی
تقریریں پڑھو" —— اور پھر ملکی اور غیر ملکی لیڈروں کی تقریروں پر مبنی کتابوں کا پہاڑ
میرے سامنے کھڑا ہو جاتا اسی پہاڑ کی اوٹ سے میں وادیٔ کشمیر کے پہاڑوں پر
نظر رکھتا لیکن نُندے کے سامنے کتابوں کا ایسا کوئی پہاڑ نہ تھا۔ سرحد اُس کی
نگاہوں کے سامنے تھی۔ وادیٔ کشمیر اور اس کے پہاڑ اُس کی آنکھوں میں سمائے
ہوئے تھے۔ وہ غاصبوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھتا اور دل کی انتہائی گہرائیوں میں

اپنے بابا کی یہ آواز سنتا رہتا "بیٹے زندگی یہی ہے کہ اپنی سرزمین کو آزاد کرائیں!"
میں بھلا نندا کیسے بن سکتا تھا۔ اُس کا باپ سپاہی بن کر یہاں آباد ہوا۔ اُس نے تقریریں نہیں کیں۔ الاٹمنٹیں نہیں کرائیں۔ تجارت نہیں کی۔ وزارت نہیں کی، صدارت نہیں کی۔ دولت جمع نہیں کی۔ کوٹھیاں تعمیر نہیں کیں۔ ایک ہی کچے کوٹھے میں رہ کر وہ اپنی بات کا پکّا نکلا۔

ماسی دُردانہ نے بات پکی کرنے کے لئے کاکا کبیر جُو سے کہا "بہن پیغام لے کر آئی تھی تو کیوں نہ پھر.....؟"
کاکا نے بات کاٹتے ہوئے کہا "پھپّی کی شادی کی جائے؟"
"ہاں تو اور کیا —— آخر یہ بھی ایک فرض ہے!"
کاکا نے ٹھنڈی سانس بھری "ہمارا فرض تو بس یہی ہے کہ ہم آزادی کے لئے قربان ہو جائیں!"
ماسی دُردانہ نے بے اختیار رونا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ ایسی باتیں کر دیں کہ کاکا کبیر جُو نے اس فرض کو بھی محسوس کر لیا اور شاید اسی احساس پر وہ کہنے لگے "جانے کیوں، مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ اپنے ہو کر بھی اپنے نہیں رہے۔ وہ تو اپنے ہی سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ — مگر تم کہتی ہو —— !"
کاکا کبیر جُو رُک گئے اور اس کے ساتھ ہی دروازے کی اوٹ میں کھڑے کھڑے مجھے یوں محسوس ہوا کہ اپنے دل کی دھڑکن بھی تھم گئی ہے مگر پھر آواز آئی "تم کہتی ہو کہ پھپّی خوش رہے گی —— اچھا تو یوں ہی سہی —— پر سوچ لو تمہارے بہنوئی

بڑے لیڈروں میں شمار ہوتے ہیں۔ بڑے نام والے ہیں۔ دولت، عزت سبھی کچھ سمیٹ کر بیٹھ گئے ـــــ اور ہمارے پاس کیا ہے!"

کاکا کبیر جو گہری خاموشی میں کھو گئے۔ اسی خاموشی میں جیسے کسی نے مجھ سے یوں کہا کہ اصول پرستوں کے پاس پیسہ نہ ہو تو وہ ایمان کی بدولت سمیٹ کر دکھ سہتے ہیں۔

دُکھ سہتے سہتے ہی چھمی جوان ہو گئی تھی کسی چٹان میں سے تراشی ہوئی بُت لگتا تھا کہ بنانے والے سنگِ مرمر کو گلابی پھولوں میں گوندھ کر اُس کا توانا جسم تیار کیا۔ صحت مند، سُرخ و سپید اور دھکتا ہوا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ بادلوں میں تحلیل ہو کر شہر شہر برس پڑے اور زماں کی نوجوان پروین اس بارش میں نہا کر صحت مند، حسین، جفاکش اور سادہ ہو جائیں۔

چھمی اور میں کوئی بارہ ہزار فٹ کی بلندی سے تیتڑھ گلی کی چوٹی پر سرحد پار وادیٔ کشمیر کو دیکھ رہے تھے کہ آن کی آن میں کالے بادل اُمڈ کر آ گئے اور چھما چھم برسنے لگے۔ چھمی نے میرا ہاتھ پکڑا اور بارش سے بچانے کے لئے قریب ہی ایک غار میں لے گئی۔ پہلی بار ہم دونوں کو مکمل تنہائی نصیب ہوئی تھی۔ دونوں ایک پتھر پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں جذب کرنے لگے۔ یکایک بجلی کڑکی تو میں بے اختیار اُس سے لپٹ گیا۔ وہ مسکرائی تو میں آپ ہی آپ شرما گیا۔

پروین کے سامنے بھی شرمندہ ہوا تھا اپنے جنگلی پن کے احساس پر اور میں وہ شام کبھی نہیں بھول سکتا جب سینما دیکھ کر کافی ٹیبل گئے۔ کچھ پیا، کچھ کھایا۔ گھر لوٹے ڈیڈی اور ممی آزاد کشمیر میں تھے۔ گھر میں فقط میرا راج تھا۔ پروین نے گھر میں قدم رکھا تو ایک خاص ادا سے انگڑائی لیتے ہوئے کہا "ہائے سچی میں تھک گئی ہوں۔ یہ تمہارا بیڈروم کہاں ہے؟"

—— اور ہم دونوں آخر اُس منزل پر آگئے جس تک پہنچنے کے لئے میں نے کئی موڑ کاٹے تھے۔ کسی نہ کسی موڑ پر تنہائی میں موقع پاتے ہی بوس و کنار سے دونوں کے جسم غائبانہ طور پر ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے تھے مگر یہ مکمل تعارف تو نہیں تھا۔ بیڈروم میں داخل ہوتے ہی پروین نے خود ہی وہ کوٹ اُتار پھینکا جو اُس نے فرمائش پر مال روڈ کے اُس درزی سے سلوایا تھا جس نے کوٹ پہناتے ہوئے اُس کے کان میں آہستہ سے پھونکا تھا "ماشاء اللہ کوٹ کیسا فٹ آیا ہے۔ کتنی اسمارٹ لگتی ہیں آپ!"

یہ کہتے ہوئے وہ کوٹ پر یوں برش پھیرنے لگا کہ اُس کا اپنا سارا جسم برش کے ہر بال میں سمٹ آیا اور اس طرح وہ برش بن کر کوٹ کو صاف کرتے وقت تسکین حاصل کرنے لگا۔

کوٹ ایک طرف پھینکتے ہوئے پروین نے اپنے آپ کو بیڈ پر گرایا اور پھر اُچھل کر بیٹھ گئی۔ اُس کی چُست قمیص نے اُسے کھینچ رکھا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر اُس نے انگڑائی لی اور شادی اور ہنی مون کی باتیں کرنے لگی۔ ہوائی ہونولولو، نیاگرا فال اور ڈزنی لینڈ میں گھوم کر وہ میرے بازوؤں میں یوں پھیل گئی جیسے وہ عورت کی بجائے مرد ہو!

"میں سر سے پاؤں تک سُن ہو گیا۔ مجھے بت کی طرح بے حس پا کر وہ بولی" تو ناجنگی!"

"تم بارش میں بھیگ گئے ہو۔ تمہارے ہاتھ ٹھنڈے ہیں!" ممی نے مجھے چونکا دیا۔
وہ بہت پیاری لگ رہی تھی میں نے اس کے سر سے کسا بے کی ٹوپی اُتاری تو
اُس کی مینڈھیاں اُس کے شانوں پر بکھر گئیں میں نے اس سے کہا" یہ سانپ تُو نے
ٹوپی میں چُھپا رکھے تھے"۔
اُس نے سادگی سے کہا" یہ تو مینڈھیاں ہیں۔ سانپ تیرے دل میں ہے!"
یہ کہتے ہوئے وہ مُسکرادی تو میں نے اُس کے چمکیلے سفید دانت دیکھ کر پوچھا۔
"کون سی پیسٹ استعمال کرتی ہو؟"
اُس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تو کہنے لگی" کیا کہا؟"
"یہی کہ تمہارے دانت سچے موتی ہیں!"
یہ سُنتے ہی اُس کے گلابی رخسار سُرخ ہو گئے۔ اُس کے گلابی رخسار اور یاقوتی
ہونٹ دیکھ کر اگر میں یہ پوچھ لیتا کہ تم کون سی روج اور کون سی لپ سٹک استعمال کرتی
ہو تو وہ شاید گونگی اور بہری لڑکی کی طرح میرا منہ تکتی رہ جاتی۔

یہی گونگی اور بہری لڑکی میری بیوی ہے۔
اور میں ــــ ؟
ــــ میں اپنی دوسری بیوی پروین کے ساتھ سوسائٹی میں موو کرتا ہوں۔
ڈیڈی نے مجھے قائل کر لیا تھا کہ ممی سے تمہاری شادی تمہاری ماں کی مرضی اور قومی

خدمت کے جذبے سے ہوئی مگر تم سوسائٹی کے ایک معزز فرد ہو۔ اپنا اثر و رسوخ بڑھانے اور سوسائٹی میں موو کرنے کے لئے تمہیں سوفی صد بولتی پروین کی ضرورت ہے اور جب میں دولہا بن کر پروین کو لینے آگیا تو براتیوں کی محفل میں ایک بھانڈ نے دوسرے بھانڈ کے ننگے شانے پر چپڑاس مارتے ہوئے پوچھا" تو کیا فیصلہ ہوا؟"

"بس ہوگیا!"

"او مریں ـــــ آخر ہوا کیا؟"

"بس ہوگیا کشمیر کا فیصلہ!"

"کس نے کیا؟ ـــــ ہندوستان نے؟"

"نہیں ـــــ ہندوستان کہتا ہے کہ کشمیر بھارت کا نہیں، بھارت کشمیر کا انگ ہے!"

"تو پھر یہ فیصلہ پاکستان نے کیا؟"

"نہیں ـــــ پاکستان کہتا ہے کہ کشمیر کا فیصلہ کشمیری عوام کریں گے!"

"تو یہ فیصلہ کشمیری عوام نے کیا؟"

"انھیں موقع نہیں دیا گیا!"

"او مریں ـــــ تو پھر یہ فیصلہ کس نے کیا؟"

"امریکہ اور روس ـــــ دونوں نے مل کر کیا ہے!"

"کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"فیصلہ یہ کیا ہے کہ کشمیر ہندوستان کو اور کشمیری پاکستان کو ملیں گے!"

ـــــ محفل کا ہر فرد مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہوگیا۔

میرے ڈیڈی کے چہرے پر بھی مُسکراہٹ کھیلنے لگی۔

قصرِ کبریا کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے اُن کو نئی تقریر کا مواد مل گیا تھا۔

"فنون" لاہور

مسعود مفتی

واپسی

جیل کی فضا بالکل خاموش تھی۔

یہ سکوت اندر بھی گہرا ہو گیا۔ جب اُس نے سُنا کہ اُس کی اپیل نامنظور ہو گئی ہے اور پھانسی کی سزا کی توثیق ہو گئی ہے۔ مگر یہ سکوت اس کے دل کے اندر تھا۔ باہر زندگی حسبِ معمول تھی سامنے والے درخت کے پتّے اب بھی ہوا سے ہلکا شور کر رہے تھے۔ دُور سے ٹِکل کی آواز آج بھی سُنائی دے رہی تھی۔ سلاخوں والے دروازے پر چڑیا آج بھی کسی وقت بیٹھ کر چوں چوں کر دیتی تھی۔ مگر یہ سب آوازیں آج عجیب رنگ لئے ہوئے تھیں۔ ان کا شل ہوتا ہُوا دماغ اِن آوازوں میں عجیب سی اجنبیت محسوس کر رہا تھا، جیسے نئے بدلتے موسم کی سہ پہر ہو، دھوپ کا انداز بھی بدلا ہوا اور سائے بھی اپنی جگہ سے کھسکے ہوئے۔

دس مربع فٹ کی اس کوٹھڑی میں وہ اس روز آیا تھا۔ جب سیشن جج نے پھانسی کی سزا سُنائی تھی۔ اب وہ پچھلے تین ماہ سے اپیل کے فیصلے کے انتظار میں یہاں

گھڑیاں گن رہا تھا۔

موت کی سزا پانے والوں کی کوٹھڑیاں جیل میں علیحدہ تھیں۔ جہاں کڑی نگرانی اور زیادہ ویرانہ تھا۔ دوسرا فرق یہ تھا کہ یہاں قیدیوں کو ایک قرآن مجید دیا جاتا۔ جو وہ سارا دن پڑھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ کئی دفعہ پڑھتے پڑھتے اس نے سوچا کہ اسی کمرے میں اس سے پہلے کئی لوگ بھی قرآن پاک پڑھ چکے ہیں، جواب اس دُنیا میں نہیں تھے۔ کئی صفحوں پر اُسے آنسوؤں کے نشان نظر آئے۔ کون جانتا ہے کہ یہ آخری وقت کے آنسو تھے یا چند روز پہلے کے۔ کیا پتہ یہ جُرم پر پچھتاوے کے آنسو تھے یا کسی بے قصور کی بے کسی کے۔

قرآن کریم اس کے سامنے ہوتا اور وہ ایسے خیالات میں کھو جاتا۔ کبھی یہ سوچتا کہ یہ مقدس کتاب تو دنیا میں زندگی گزارنے کے ڈھنگ بتاتی ہے تو اب ایسے وقت اسے کیوں دی جا رہی ہے جب دُنیا کے دروازے اس پر بند ہو رہے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے اس کے دل میں کوئی خیال سر اُٹھاتا، تو وہ سوچنے لگتا کہ کیا ان لوگوں کے احساسات بھی ایسے ہی تھے، جو اس سے پہلے اس کوٹھڑی میں رہے اور چند روز بعد پھانسی پا گئے۔

خود اسے اپنے جرم پر کبھی افسوس نہیں ہوا تھا۔

اُس نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا۔ دن دہاڑے اور مجمع عام میں۔ اور وہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ بہت سلجھا ہُوا اور نیک جس کی زندگی میں کبھی کوئی جذباتی طوفان نہیں آیا تھا۔ اس لئے کہ اس نے اخلاق اور اقدار کی قیود توڑنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی۔ بلکہ بچپن میں "اچھا بچہ" بننے کے جو اصول اُسے سکھائے گئے

تھے وہ زندگی بھر ان پر قائم رہا۔ اور بائیس سالہ جوانی میں "اچھا بچہ" بنا رہا۔

گاؤں سے دسویں پاس کر کے وہ شہر میں ملازمت کرتا تھا کئی دفعہ شہر کی رنگینیوں نے اُسے اُکسایا تھا لیکن اُس کی تربیت اُسے روک لیتی۔ اور یہی خیال ستاتا کہ ماں کو پتہ چل گیا تو وہ کیا کہے گی۔ ماں جو اُسے دنیا میں ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی۔ اور جس کا دل دُکھانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

وہ تین ماہ سے موت کے ویٹنگ روم میں پڑا ہوا زندگی کے متعلق سوچتا رہا گزری ہوئی زندگی کے متعلق اس کوٹھڑی کے ویران درو دیوار اُداس تھے جو دماغ کو سکون دینے کی بجائے گھٹن دیتے تھے اس کی فضا میں دھیرے دھیرے آنے والی موت کی سرسراہٹ تھی اور اس کے سلاخ دار دروازے سے نظر آنے والے بھنگی، جیل اسٹاف، گلہری، چڑیا اور چیونٹے گزری ہوئی زندگی کی یادوں کے پٹ کھولتے جاتے۔ اس وقت اس کی سابقہ محرومیاں کُلبلا کر ڈسنے لگتیں تسکین پائی ہوئی خواہشیں قند مکرر بن جاتیں، دفن شدہ دَولہرانے لگتے۔ مزید زندگی کی خواہش تڑپنے لگتی اور قسمت کے خلاف گلے شکوے قطار اندر قطار اُٹھنے لگتے۔

اس کوٹھڑی میں قرآن کے صفحوں پر خالی خولی نظر بن جانے اس دن میں کئی کئی دفعہ وہ سارے واقعات ذہن میں دہرائے تھے جو قتل سے متعلق تھے۔

سب سے پہلے اُسے ماں کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ اب اس کا باپ جھگڑتا رہتا ہے۔ خط میں نہ کوئی خاص وجہ لکھی تھی اور نہ جھگڑے کی نوعیت بتائی تھی۔ اس نے یہی سوچا کہ ماں کے پاس خط لکھنے کو اور کچھ نہ تھا۔ اس لئے اس نے اس غیر ضروری چیز کا ذکر کر دیا ہے ورنہ ماں باپ میں جھگڑے کہاں نہیں ہوتے۔

اگلے ایک دو خطوں میں خاموشی تھی۔ اس لئے جب باپ اسے ملنے آیا، تو اس نے یہ موضوع نہ چھیڑا۔

چند روز بعد وہ گھر گیا تو ماں باپ کے چڑچڑے پن کا سرسری سا ذکر کیا اور بس۔ اس کے اپنے مشاہدے میں کوئی پریشان کن چیز نہ آئی۔

پھر ایک دن اُسے ماں کا مفصّل خط ملا جس میں اُس نے لکھا تھا، کہ اس کا والد پچھلے کئی دنوں سے اُسے زدوکوب کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ نئے قانون کے تحت میں اسے دوسری شادی کی اجازت دے دوں۔ اور دوسری شادی میں مدد بھی کروں پھر ماں نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ دوسری شادی سکینہ سے کرنا چاہتا ہے۔ جو ماں کی خالہ زاد بہن تھی اور اپنے باپ کے مرنے کے بعد بہت سی زمین کی اکلوتی وارث تھی۔ ماں نے لکھا تھا "تمہارا باپ جائیداد کی حرص میں اتنا دیوانہ ہو گیا ہے کہ اپنے سے آدھی عمر کی لڑکی سے شادی رچانے پر تُلا ہوا ہے۔ وہ مجھ سے تحریری اجازت بھی چاہتا ہے اور یہ بھی کہ میں ان لوگوں پر زور ڈالوں کہ وہ یہ رشتہ دے دیں۔

وہ یہ خط پڑھ کر بھونچکا رہ گیا۔ میرا باپ اور شادی۔؟ اس کا سر چکرا گیا۔ باپ کی عمر پچاس کے قریب تھی اور ماں کوئی چالیس کی تھی ایسے میں بیس اکیس سالہ لڑکی سے شادی ؟۔ اسے ایسے لگا جیسے وہ خواب یا نشے کی حالت میں ہو اور حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو لیکن جب بار بار خط دیکھتا تھا تو اس کا دل ڈوبتا ہی جاتا۔

اسے اپنی ماں سے بے پناہ محبت تھی اور ماں کا دُکھ پگھلی ہوئی آگ بن کر اس

کے رگ و پے میں گھلنے لگا اس نے حالات کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہ کی اور ماں نے ساری بات کو جس انداز سے لکھا تھا اس نے من وعن قبول کرلیا۔ ماں کی ذات اس کی نظر میں اتنی بلند تھی کہ اس کا سارا غصہ باپ کی طرف منتقل ہو گیا۔

یہ کیسا باپ ہے ؟ جو گھر تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے ہمارے اپنے گھر میں کس چیز کی کمی تھی جو وہ مال و دولت کی حرص میں اندھا ہو رہا تھا۔ اکلوتے بیٹے کے لئے کیا یہ ساری زمینیں کافی نہ تھیں، جو وہ گھر کا ٹھہرا ہوا پُرسکون ماحول بم سے اُڑانا چاہتا تھا۔ اور وہ باپ ہی کیا جو یہ نہ دیکھ سکے کہ نیلے پیلے آنچل تو اس کے بائیس سالہ جوان بیٹے کے خیالوں میں لہرا رہے ہیں اس کا فرض تو بیٹے کے خیالوں میں جھانکنا تھا لیکن وہ خود ہی ان آنچلوں کے پیچھے بھاگنے لگ گیا۔ اُٹھتے بیٹھتے وہ جتنا ہی سوچتا اس کے دل میں باپ کے خلاف نفرت بڑھتی جاتی۔ اس باپ کے خلاف جسے اس نے ساری عمر پیار کیا تھا اور غالباً اسی وجہ سے اسے باپ کے طرزِ عمل سے صدمہ پہنچا تھا۔ چنانچہ وہ ساری محبت اب مکمل طور پر مظلوم ماں کی طرف منتقل ہو گئی اور باپ کے لئے سوائے نفرت کے اور کوئی جذبہ باقی نہ رہا۔

جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوا تو غم اور غصے سے نیم پاگل ہو رہا تھا۔ وہ خوب اندازہ کر سکتا تھا کہ معاملہ یونین کونسل تک جانے سے ان کی کتنی جگ ہنسائی ہو رہی ہوگی خصوصاً جب کہ یونین کونسل کا چیئرمین ان کی مخالف پارٹی کا تھا اس سے انصاف کی توقع تو بالکل نہ تھی۔ البتہ یہ یقین تھا کہ وہ اس معاملے کو بلا وجہ اُچھالے گا تمسخر کا ذریعہ بنائے گا اور ان کو دُکھ پہنچا کر مزہ لے گا۔

جیسے جیسے گاؤں قریب آتا گیا وہ سوچنے لگا کہ میں گاؤں میں کیسے داخل

ہوں گا؟ میں لوگوں کا سامنا کیسے کر سکوں گا۔ پہلے تو چونگی پر ہی دو چار خیر صلا پوچھنے والے ہوں گے۔ آگے اڈے پر بھی دکاندار اور خوانچے والے جانتے ہیں۔ اس سے آگے مسجد کے مولوی صاحب بچے پڑھانے کے ساتھ ساتھ باہر جھانکتے رہتے ہیں جن سے بات کئے بغیر آگے جا نکلنا ممکن نہیں اور پھر اس کے بعد تو بازار ہے جہاں سَو ملنے والے ہوں گے۔ وہ ان سب کی طنزیہ نظروں کا مقابلہ کیسے کر سکے گا۔ اور نہ معلوم گھر کا کیا حال ہو گا۔ ماں کس حال میں ہو گی اور باپ کا موڈ کیسا ہو گا۔؟

باپ کا خیال آتے ہی اس کے خون میں نفرت کے اُبال اُٹھنے لگے۔ آخر ابا کو کیا پڑی تھی بیٹھے بٹھائے بھُس میں تیلی پھینکنے کی۔

اور پھر گاؤں آ گیا۔ مجرموں کی طرح نیچے دیکھتے ہوئے وہ چلتا رہا۔ کسی سے نظریں بچائے، کسی سے جسم چرائے۔ بازار سے گزرنے کی بجائے اس نے پچھلے قبرستان سے لمبا راستہ اختیار کیا۔

گھر کا دروازہ نظر آیا تو نہ خوشی سے اس کا دل مچلا، نہ یہ خواہش ہوئی کہ گھر والے باہر ہی مل جائیں۔ بلکہ اس کا دل بھاری بوجھ سے بیٹھنے لگا۔ نہ معلوم گھر میں کیا نظر آئے گا۔

دہلیز پر وہ لمحہ بھر کو ٹھٹکا...... اور پھر اندر داخل ہو گیا۔

صحن خالی تھا۔ ماں ہمیشہ کی طرح شہتوت کے نیچے بیٹھ کر سبزی نہیں کاٹ رہی تھی۔

وہ بڑے کمرے میں گیا۔ وہ بھی خالی تھا۔ صندوقوں کو تالے لگے تھے۔ جو ان کے باہر جانے کی نشانی تھی۔

وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اندر سے میراثن نکلی۔ اُسے دیکھا اور ٹھٹھک گئی۔ پھر گڑبڑا کر سلام داغ دیا۔

گھر خالی دیکھ کر اس کا ذہنی تناؤ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ سلام کا جواب دینا اور حال احوال پوچھنا بالکل بھول گیا۔ قریب قریب چیخ کر بولا۔

"ماں کدھر ہے؟"

میراثن نے اسے غور سے دیکھا۔ اور بولی "یونین کونسل کے دفتر میں۔ وہاں طلاق کے مقدمے کی تاریخ ہے۔"

اس نے جست لگائی۔ زن سے باہر نکلا اور تقریباً بھاگتا ہوا دفتر کو چلا۔ راستے میں کسی نے آواز بھی دی مگر وہ رُکا نہیں اور لپکتا چلا گیا۔

دفتر کے باہر میدان میں مقدمہ پیش تھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ جب وہ ان کے قریب آرہا تھا تو اسے بالکل ایسا لگا جیسے مداری کا تماشہ ہو رہا ہے اور ارد گرد لوگ جمع ہوں۔ شرم اور خفت نے ایک دفعہ پھر پاؤں پکڑ لئے اور وہ مجمع کو چیر کر آگے بڑھنے کی بجائے دم سادھ کر پیچھے سے جھانکنے لگا۔

چیئرمین اور مصالحتی کمیٹی کے دو ممبران کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ سامنے اس کی ماں چارپائی پر بیٹھی تھی اور چہرے پر پلو رکھے زار و قطار رو رہی تھی۔ ماں کو برسرِ عام مجرموں کی طرح روتا دیکھ کر وہ غصے سے نیم پاگل ہو گیا۔ اس کا باپ بلند آواز سے بول رہا تھا۔

"میں اسے اتنے عرصہ سے سمجھا رہا ہوں مگر یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتی زبانی بھی سمجھایا، جھگڑا بھی کیا۔ مارا بھی۔ مگر اس کی حرکتیں بڑھتی ہی گئیں۔ میں ہر چیز برداشت کرسکتا ہوں۔ مگر بدچلنی برداشت نہیں کرسکتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے فضل ماشکی

کے ساتھ بدفعلی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر یہ بھاگ نہ جاتے تو میں وہیں قیمہ۔۔۔۔

"بابا!!" وہ لوگوں کو چیر کر آگے بڑھا اور اس کی چیخ صورِ اسرافیل کی طرح سب کے کانوں میں گھستی گئی۔

اسے دیکھ کر مجمع میں کھنبھناہٹ سی ہوئی۔ ایک آدھ طنزیہ آواز آئی "لو بیٹا بھی آگیا"۔ اور پھر ہر شخص ساکت ہوگیا۔ اس کی ماں نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا اور پھر چیخ مار کر اس کی طرف جھپٹی۔ اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اور بلک بلک کر رونے لگی۔ ماں کو بانہوں میں تھاما تو اس کے دماغ سے سب خیالات محو ہو گئے۔ سوائے اس کے کہ وہ ہر قیمت پر اپنی ماں کی حفاظت کرے۔

ماں ہچکیوں کے ریلے میں بولی "یہ سب بہتان ہے۔۔۔ جھوٹ ہے۔۔۔ اپنے مقصد کے لئے یہ مجھے ذلیل کر رہا ہے۔

اس نے غصے سے باپ کی طرف دیکھا تو وہ جیسے سن کر ہو کر بیٹے کو دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملتے ہی اس نے بیٹے کی طرف ہاتھ پھیلائے "یہ سچ ہے بیٹا!"

باپ کے چہرے سے اپنی پھٹی پھٹی نظریں ہٹا کر اس نے مجمع پر نگاہ دوڑائی۔۔۔۔ حیرانی۔۔۔۔ دلچسپی۔۔۔۔ تمسخر۔۔۔ طنز۔۔۔۔ احساس برتری طعن۔۔۔ یہ سب اس کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔۔۔۔ مخالفت بھرے چہروں کے چہرے پر شیطانی وارفتگی تھی۔ جیسے بلی ادھ موئے چوہے کو اُچھال اُچھال کر مزہ لیتی ہے۔

اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب اس نے ماں کو چھوڑا اور کب لپک کر مجمع میں سے ایک آدمی کے کندھے سے کلہاڑی جھپٹی اسے تو تب ہوش آیا جب کلہاڑی کے پے در پے وار کھانے کے بعد اس کا باپ اپنے خون میں لت پت اس کے قدموں میں

گر پڑا۔ ماں کی چیخیں سُن کر اس نے کلہاڑی پھینک دی۔ اور کئی بازوؤں نے اُسے جکڑ لیا
اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بالکل کوشش نہ کی۔ جب ذرا شور تھما تو اُس
نے چیئرمین کی طرف دیکھ کر تھوکا اور حقارت سے بولا۔

"جج صاحب!!! میرا فیصلہ تمہارے فیصلے سے زیادہ باعزت ہے۔"

اس لمحے سے لے کر آج تک اسے اپنے جرم پر ذرہ بھر بھی ندامت نہ ہوئی تھی،
مقدمہ چلا پھانسی کی سزا ہوئی، اپیل کی گئی وہ نامنظور بھی ہو گئی اس میں کافی وقت
لگا لیکن اس دوران وہ لمحہ بھر بھی نہیں پچھتایا۔ آج اسے بتا دیا گیا تھا کہ دو دن کے
بعد اسے پھانسی دی جائے گی اور پچھلے دو گھنٹوں سے وہ ان سارے واقعات کو
یاد کر رہا تھا۔ جن سے گزر کر وہ یہاں پہنچا تھا۔ مگر اس ساری یاد میں باپ کے لئے
کوئی ہمدردی نہ تھی جس نے اس کی ماں پر محض اس لئے بہتان لگایا کہ وہ اپنے
مقاصد کو چھپا سکے۔ وہ اس کی نظر میں بدترین ریاکار تھا۔ اس کے منہ سے دو ایک
گالیاں اُبھریں پھر وہ سنبھلا اور ہل ہل کر قرآن مجید پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ سویا نہیں تھا۔ ویسے ہی آنکھیں بند کر کے رات کے اندھیرے میں گم تھا اور
سوچ رہا تھا کہ پھانسی میں کس قسم کی اذیت ہو گی جب اسے کوٹھڑی سے نکال کر لے
جائیں گے تو اس کا ردعمل کیا ہو گا۔ کیا وہ ڈرے گا؟ لرزے گا؟ پھر اس کے چہرے
پر توبرہ چڑھا دیا جائے گا اور گلے میں پھندا ڈالا جائے گا۔ سب چہرے چھپ جائیں
گے۔ اندھیرا چھا جائے گا۔ کیا دل نہیں گھبرائے گا۔ تب تو ایک ہی انتظار رہ جاتا ہے
گا کہ کب تختے زور سے آ کر گردن پر ٹکراتے ہیں۔ زندگی اور موت کے درمیان

ٹکنے والے وہ آخری لمحے کیسے گزریں گے؟ اور جب وہ مر جائے گا۔

"مگر کیا واقعی میں مر جاؤں گا؟؟؟" اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ مگر نظر اندھیرے سے ٹکرا کر کند ہو گئی۔ کوٹھڑی کا دبیز اندھیرا بھی اسے موت کا پردہ محسوس ہوا۔ گھبراہٹ سے ایک دم جی متلانے لگا۔ کہیں سے روشنی کی ایک ہی کرن مل جائے۔ اس نے تڑپ کر پہلو بدلا۔ سلاخوں والے دروازے کے پار چاند کی روشنی میں دیواروں اور درختوں کے نقوش دیکھ کر اس کی ہمت بندھی۔ اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا مگر وہ خود منجمد تھا اور جس طرح پیاسا جب ندیا پر ٹوٹ پڑتا ہے اسی طرح وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاندنی کو تکتا رہا جیسے یہی اس کی زندگی کا واحد ثبوت تھا اور جوں ہی وہ آنکھ بند کرے گا تو پھانسی کے تختے زیں سے گر دن میں آ پڑیں گے۔

ماتھے پر سے سرسراہٹ چلتی ہوئی رخسار تک آئی۔ وہاں سے ذرا نیچے گردن سے ہوتی ہوئی کندھے میں گھس گئی اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ اٹھایا۔ انگلی سے کندھے کو چھوا تو وہ گیلی ہو گئی۔

"پسینہ" وہ زیر لب بڑبڑایا اور دھیرے اعتماد سے چہرے پر ہاتھ ملا

"او خدا" وہ ٹھنڈے پسینے میں شرابور تھا۔ بغیر محسوس کئے۔ اس کی قمیص گیلی ہو کر کمر کے ساتھ چپک گئی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور جسم سے چپکے ہوئے کپڑے درست کرنے لگا تو ایک دم اس کا ہاتھ گرم نمی میں لگا۔ خوف زدہ ہو کر اس نے ٹٹولا۔ تو ٹھنڈی آہ بے اختیار اس کے لبوں سے نکل گئی۔

اس کا پاجامہ پیشاب سے تر تھا۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دروازے کے قریب ہُوا تاکہ ہَوا میں کپڑے سوکھ جائیں۔ تب اس نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ وہ سوکھے پتے کی طرح کھڑ کھڑ کانپ رہا ہے۔

اس نے چند لمحے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر بے سود جسم کا ہر حصہ علیحدہ انداز میں دھڑک رہا تھا اور وہ بے بس ہو کر دوبارہ لیٹ گیا۔ چاندنی کو دیکھنے کی خواہش کے باوجود اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگیں۔ نیند سے نہیں بلکہ نقاہت سے۔

ایک دم اُسے کسی نے جھنجوڑ ڈالا۔ گڑبڑا کر وہ اُٹھنے لگا تو جیسے کسی نے پٹخنی دی تھی اور وہ چکرا کر سلاخوں والے دروازے سے جا لگا۔ تنکے کا سہارا لینے کے انداز میں اس نے سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور جیسے جیسے وہ اُٹھنے لگا۔ لیکن ابھی بمشکل کھڑا ہی ہُوا تھا کہ ایک دم زور کا جھٹکا آیا اور دروازہ اپنی چوکھٹ سے نکل کر باہر کی طرف گرا۔ وہ بھی سلاخوں سے چپکا ہوا منہ کے بل گرا اور سنبھلنے سے پہلے ٹانگوں پر دو چار اینٹیں آن پڑیں۔ وہ زور سے کراہا۔ اور سر کو سلاخ پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے نتھنوں اور حلق میں گرد کے بادل گھُسنے لگے۔

"بھونچال" وہ بڑبڑایا۔
اور بے ہوش ہو گیا۔

جب اُسے دوبارہ ہوش آیا تو چاندنی میں سائے پہلے جیسے ہی تھے۔ فضا میں گرد اور دھول بھی بدستور تھی اور جیل کے دوسرے حصّے سے شور کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ اس نے اندازہ کیا کہ وہ زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا۔

اس نے گردن ہلائی۔

پھر باری باری بازوؤں کو حرکت دی۔

ڈرتے ڈرتے ٹانگیں ہلائیں۔

کہیں کوئی درد نہ اُٹھا۔ سر موڑ کر دیکھا تو اینٹیں جسم سے لگ کر برے گر پڑی تھیں۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمر میں ذرا سا درد محسوس ہوا مگر جب جسم کو اِدھر اُدھر ہلایا تو وہ معمولی چوٹ تھی۔

اب اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔

موت کی سزا پانے والوں کی قریباً سبھی کی کوٹھریاں گری پڑی تھیں۔ ساتھ والے کمرے کا قیدی مرا پڑا تھا۔ ملبے میں اس کا بھیجا پچک گیا تھا باقی چیزیں واضح اور صاف نہ تھیں کیونکہ گرد کا بادل پھیکی چاندنی کو چاٹ گیا تھا۔ جیل کے دوسرے حصوں سے چیخ پکار کی آوازیں آرہی تھیں۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا۔ اس کی زندگی کے دو دن باقی ہیں۔ اگر وہ اس موقع سے فائدہ اُٹھالے تو شاید اسے دوسری زندگی مل جائے۔ دوسری سوچ کے بغیر وہ وہاں سے چل دیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ پکڑا جاؤں گا تو کیا فرق پڑے گا۔ دو ہی تو دن ہیں زندگی کے۔ اور وہ بھی قیدِ تنہائی میں۔ پکڑ کے قید کریں یا گولی ماریں۔ پھانسی سے بڑی سزا تو کوئی نہیں۔ وہ یہی سوچتا چلا گیا۔

جیل میں افراتفری تھی۔ ایک دو بارکیں گر گئی تھیں۔ اور سبھی لوگ زخمیوں کو نکال رہے تھے۔ کچھ لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے کسی کی مدد کے لئے۔ کسی کو بلانے کے

لئے کوئی چیز اُٹھانے کے لئے۔ ان میں سے اکثر گارڈ کو پکار رہے تھے۔ وہ بھی ان میں خلط ملط ہو گیا اور کہیں رُکتا، کہیں بھاگتا، کہیں دوسروں کو پکارتا آنکھ مچولی سی کھیلتا رہا۔ اور ایک دفع موقع پاکر جیل کی بڑی دیوار تک جا پہنچا۔ جہاں تھوڑی سی تلاش کے بعد گرا ہوا حصہ نظر آیا۔ اس نے رُک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ تیز تیز چلتا ہوا وہ باہر نکلا اور بگٹٹ بھاگنے لگا۔

شہر کا حلیہ بالکل بدل گیا تھا۔ گری ہوئی عمارتیں۔ ٹیڑھے میڑھے بجلی کے کھمبے ٹوٹی ہوئی تاریں، کہیں درخت سرنگوں، کہیں سڑک میں دراڑیں، فضا میں گرد ہی گرد گلیاں اور راستے پہچانے ہی نہ جاتے تھے۔ لوگ بدحواسی میں ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ کہیں زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں تھیں، کہیں امدادیوں کو بلانے کا شور تھا۔ بالکل حشر کا سماں تھا اور نفانفسی کا عالم تھا۔ چاند کی پھیکی گرد آلود روشنی میں اور بھی پراسرار لگ رہا تھا۔

وہ اب ادھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ اس قتل کے علاوہ اس نے کبھی کوئی اور جرم نہ کیا تھا مگر اب مجرموں کی صحبت میں رہتے رہتے اس نے کافی سیکھ لیا تھا اور اب قسمت سے موقع بھی مہیا کیا تھا۔ کیونکہ اس نے جیل میں سُنا تھا کہ ہر زلزلے کی تواریخ بتاتی ہے کہ اس کے فوراً بعد جرائم میں ایک دم اضافہ ہو جاتا ہے اور زلزلہ زدہ لوگ اپنے نقصان کو بھول کر اپنے ہی جیسے مصیبت زدہ لوگوں کو لوٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ بھی اس موقع سے فائدہ اُٹھانے پر تل گیا۔

ایک آدمی کی ٹانگ ملبے میں دب گئی تھی اس کا اُوپر والا دھڑ گلی میں تھا۔ اور وہ بے ہوش تھا۔ یہ بظاہر اس پر سے ملبہ ہٹاتا رہا لیکن دراصل اس کی قمیض اتار رہا تھا

تھوڑی ہی دیر بعد وہ کامیاب ہوگیا۔ اپنی قیدیوں والی قمیض اُتار کر تار تار کر دی اور دوسری پہن لی۔ اپنے لئے دوسری زندگی لینے کی عجلت میں وہ زخمی کی زندگی خطرے میں ہی چھوڑ کر چل دیا۔ ایک اور جگہ سے اس نے صندوق اُٹھایا جس میں کچھ کپڑے اور نقدی تھی۔ اس کی اسکیم مکمل ہو چکی تھی اور وہ شہر سے باہر والی سڑک پر ہو لیا۔

نئی زندگی واقعی مختلف تھی۔ اس نے اپنا نام تبدیل کر لیا۔ داڑھی بڑھالی چہرے پر خود ہی اُسترے سے زخم لگا کر بڑا سا نشان بنا لیا۔ سر کے بال بڑھا کر پٹے بنا لئے۔ لوگوں سے الگ تھلگ رہتا۔ نہ کوئی دوست تھا نہ ہمراز۔ وہ کہیں ایک جگہ جم کر کام نہ کرتا۔ چند روز ایک جگہ مزدوری کر لی۔ پھر کہیں اور خوانچہ لگانے لگا یا کسی بھیکیا کے پاس اٹک جاتا۔

یہ بہت ہی بور اور اُکتا دینے والی زندگی تھی۔ تنہائی اور خوف اس کے اعصاب کو ہر وقت بھاری بوجھ کی طرح دبائے رہتے۔ زندگی کے میلے اپنی پوری آن بان سے رونق کے غبارے اُڑاتے مگر وہ شرکت سے قاصر تھا کیا معلوم کس جگہ قسمت کیا گل کھلا دے اور وہ پہچانا جائے وہ کھل کر قہقہہ لگانے کو ترستا تھا۔ اس کا دل کسی ہمراز سے بے تکلفانہ بے حجابانہ باتیں کرنا چاہتا۔ مگر مجبور تھا۔ دوسروں کو ہنستے دیکھ کر وہ آہیں بھرتا اور شاداں و فرحاں لوگوں کی آنکھوں میں تارے دیکھ کر اس کی اپنی آنکھیں بجھنے لگتیں۔

تین چار ماہ میں وہ تنگ آگیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خاموشی سے جا کر اپنی ماں کو نکال لائے اور دونوں کسی دور کے علاقے میں جا کر کھل کر زندگی گزاریں۔

سہ پہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے جب وہ گاؤں کے قبرستان پہنچا اس کا ارادہ

تھا کہ اندھیرا ہونے تک وہیں چھُپا رہے اور رات کو جاکر ماں سے ملے۔ ماں کے ملنے کے خیال سے ہی اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے فخر سے سوچا کہ میں نے مشکل وقت میں اپنی جان پر کھیل کر ماں کی حفاظت کی ہے۔

جہاں چھُپا ہوا تھا اس سے کچھ دُور باپ کی قبر تھی۔ لیکن وہ ادھر نہیں گیا۔ اس نے فاتحہ بھی نہیں پڑھی۔ وہ ابھی تک اسے معاف نہیں کر سکا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے ان کا پورا گھرانہ تباہ ہوا۔ اسے پھانسی کی سزا ملی اور اگر خدا یہ مدد غیب سے نہ بھیجتا تو وہ اب تک مر چکا ہوتا۔ اس کی نیک دل اور فرشتہ سیرت ماں کو گاؤں میں شرمناک تہمت کی ذلت اُٹھانا پڑی اور ان کے ازلی دشمن چیرمین کو ان پر ہنسنے کا موقع مل گیا۔ وہ سوچنے لگا سال بھر پہلے بھی وہ گاؤں آیا تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد کس ذلت سے گیا تھا۔ ہاتھوں میں ہتھکڑی جسم پر خون کے چھینٹے پیچھے لوگوں کا ہجوم۔ ساتھ ساتھ اس کی ماں روتی چلّاتی بین کرتی۔ بچے اس کی ہتھکڑیوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر گرتے ہوئے۔ اور وہ ناہموار قدموں سے چلتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ باپ کی ہوس نے اسے کہاں پہنچا دیا ہے۔ آج وہ پھر اپنے گاؤں میں آیا ہے لیکن چوروں کی طرح چھپ کر وہ بچپن کے ساتھیوں سے گلے نہ مل سکتا تھا۔ وہ ہر گھر کے سامنے رُک کر گھر والی بوڑھی سے دعائیں نہ لے سکتا تھا۔ وہ کسی ہمسائے کے بچے کے سر پر پیار کے ساتھ ہاتھ نہ پھیر سکتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ہی گھر کھلے بندوں نہ جا سکتا تھا۔

حسرتوں کا گولہ اس کے حلق میں پھنسنے لگا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور گیلی آنکھوں میں نفرت بھر کے اس نے اپنے باپ کی قبر پر بڑی ہی کڑوی نگاہ ڈالی

اور پھر اس کے خیالوں میں ماں آگئی۔ نہ معلوم وہ کس حال میں ہوگی۔ روتے روتے اس کا حلیہ بگڑ گیا ہوگا۔ لوگوں کے طعنوں کے تیروں نے اس کا سینہ چھلنی کر دیا ہوگا۔ وہ پیسے کی وجہ سے بھی تنگ ہو سکتی ہے۔ معلوم نہیں خوشیا مزارع اسے حصہ دیتا ہے یا نہیں۔ نہ معلوم گاؤں والوں کا سلوک اس کے ساتھ کیسا ہے۔ اس کے ذہن میں ماں کی جو تصویر اُبھری تھی وہ انتہائی سوگوار اور لاغر تھی۔

شام ہونے لگی۔ اِدھر اُدھر سے فاختہ کی آواز آئی۔ بابا حاکم کے کنویں کی رہٹ کی ریں ریں سنائی دی۔ جہاں وہ اکثر شام کو نہایا کرتا تھا۔ طوطوں کے غول کے غول ٹیں ٹیں کرتے اس کے اُوپر سے گزرنے لگے۔ بیزاری دُور کرنے کو وہ اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ ایک جگہ وہ دیوار ذرا ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس نے جھانکا تو گاؤں سے آنے والا اُجاڑ راستہ صاف نظر آتا تھا۔ اپنے آپ کو اوٹ میں رکھنے کا مناسب انتظام کرنے کے بعد وہ وہیں بیٹھ کر رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

یہ راستہ ہمیشہ کی طرح آج بھی سنسان تھا کیونکہ یہ صرف گاؤں سے قبرستان آتا تھا اور بڑی سڑک دوسری طرف تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اس نے دیکھا کہ کماد کی فصلیں تیار ہونے کو تھیں جہاں کسانوں کو گندم کی کاشت کرنا تھی وہ کھیت خالی تھے کہیں کہیں کپاس کاشت تھی مگر باقی سب گنا ہی تھا۔ ابھی فصل میں کچھ دیر تھی اس لیے لوگوں نے رس نکالنے والے بیلنے نہیں لگائے تھے ورنہ تو شام کو اس راستے پر خوب رونق ہوتی تھی۔

وہ کافی دیر خالی سڑک کو دیکھتا رہا۔ کئی دفعہ کماد کے بے جان کھیتوں پر نظر ڈالی اور بالآخر اُکتا گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پیچھے ہٹ کر آرام کرے کہ دُور سے اسے ایک شخص آتا دکھائی دیا۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک اور شخص نمودار ہو گیا۔ تماشے سے زیادہ

خوف زدہ ہو کر وہ انھیں دیکھنے لگا۔ کیونکہ ادھر آنے والا یقیناً قبرستان آئے گا۔ اور اس کی موجودگی مخفی نہ رہ سکے گی۔ جلدی سے اِدھر اُدھر چکر لگا کر اس نے چھپنے کی جگہ تلاش کی اور پھر گردن نکال کر دیکھنے لگا۔

چند ہی ثانیوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ ان میں سے ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ عورت نے دیہاتی لوگوں کی مخصوص دھوتی پہنی ہوئی تھی جو نیل بیں بار بار رنگنے سے کالی ہو جاتی ہے۔ مگر اس کا کنارا سُرخ تھا اور ویسا ہی کرتہ تھا اور سر پر کُھلتے ہوئے سُرخ رنگ کی چادر تھی۔

وہ کون ہو سکتے ہیں؟ اس نے کتنے ہی اندازے لگائے۔

وہ سوچتا کہ یہ فلاں لوگ ہونگے لیکن ان کی کوئی حرکت یا چال دیکھ کر وہ خیال بدل لیتا۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے مگر تھوڑی دیر میں نزدیک آگئے اور آتے گئے۔

وہ ایک دم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ جیسے اُسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ حفاظتی حدود سے اندر ہی اندر وہ جتنا آگے جھک سکتا تھا جھک کر باہر آ گیا اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ چال پر غور کیا۔ جسم کے حجم کو دیکھا۔ کپڑوں کا اسٹائل پرکھا۔ اس نے کچی دیوار کو اتنے زور سے پکڑا کہ انگلیاں مٹی میں دھنسنے لگیں اور اس کے منہ سے دبی گھٹی چیخ نکل گئی۔

"ماں!!"

اس کی آنکھیں گویا باہر آ رہی تھیں۔

چلتے چلتے دونوں بالکل قریب آ گئے۔ ہوا کے جھونکے ان کی گفتگو کے اُدھڑے الفاظ اٹھا کر اس تک لاتے مگر دوری کی وجہ سے وہ سمجھ نہ سکتا تھا۔ ایک جھونکا ماں کی ہنسی اٹھا لایا۔ مانوس، تازہ، اپنائیت کا انداز لئے۔ وہ تھوڑا متعجب ہوا۔ کیونکہ اس میں سوگواری کی جھلک تک نہ تھی بلکہ کھلتی ہوئی بھرپور ہنسی تھی۔

مگر اس کے ساتھ کون تھا؟

اس نے غور سے دیکھا اور اس کے جسم سے جان نکلنے لگی۔ وہ فضل ماشکی تھا۔ حیرت اور غصے سے اس کے پیٹ میں مروڑ اُٹھنے لگا۔

"فضل ماشکی" وہ بڑبڑایا "فضل ماشکی؟؟"

اس کے دماغ میں بدترین وسوسوں نے سر اٹھایا۔ مگر وہ ابھی تک قبول کرنے کو تیار نہ تھا اور بالکل پتھر کا بت بنا انھیں دیکھ رہا تھا جو قدم بہ قدم بڑھے آ رہے تھے۔ وہ بھول چکا تھا کہ اسے اپنے آپ کو چھپانا ہے اسے کوئی ہوش نہ تھا کہ دبوا کا سہارا لیا ہے یا نہیں۔ اس کی ساری حسیات آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں اور وہ منہ کھولے دیکھے جا رہا تھا۔

اب وہ دونوں اس سے چار کھیت دور تھے پہلا کماد کا تھا۔ دوسرا خالی تھا اور ساتھ ہی ایک راستہ اندر کو مڑتا تھا۔ اگلے دو کھیت کماد کے تھے۔

وہ آگے چلتے آئے۔ پہلا کھیت ختم ہو گیا۔ دوسرے کے ساتھ چلتے چلتے ان کے قدم رکنے لگے انھوں نے دبے انداز میں مشورہ کیا اور پھر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ مگر وہ کیا کرتا۔

فضل ماشکی نے عورت کا ہاتھ پکڑا۔ دونوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کھیت میں

کے اندر جانے والے کچّے راستے پر مڑ گئے۔

اب وہ کماد کی اوٹ میں تھے اور وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔

سب کچھ بھول کر اس نے ایک جست لگائی۔ دیوار پھلانگ کر سڑک پر آ گیا۔ سرپٹ دوڑتا ہوا وہ کھیت کی ٹکر تک گیا اور رک کر جھانکا۔ دونوں کماد والے کھیت میں گھس رہے تھے۔

بغیر سوچے سمجھے اس نے دبے پاؤں چکر کاٹا اور دوسری طرف سے اسی کھیت میں داخل ہو گیا۔ پھر بلّی کی سی ہوشیاری سے آگے بڑھا۔ قدم قدم، چپہ چپہ، ایک ایک اِنچ۔

ایک دم ماں کی ہنسی کی آواز آئی اور وہ وہیں دبک گیا۔ کماد ہلنے سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ ان سے دو ہی تین گز دُور ہوں گے۔

وہ دونوں سرگوشی میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ اور کان کھڑے کر کے سننے کی کوشش کرنے لگا۔

....

فضل کی آواز میں تندی اور بے صبری تھی۔ "فکر نہیں۔ اور لے دوں گا۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔ اور وہ دم سادھے پڑا تھا۔

اچانک فضل بولا۔

"تو ابھی ادھر ہی رہ۔ میں چلا جاؤں تو تُو دوسری طرف سے نکل جانا۔"

اور کماد ہلنے لگا۔

وہ دم سادھے پڑا رہا۔ تیز دھاروں والے پتوں سے اس کے چہرے اور

بازوؤں پر کئی خراشیں آئیں مگر اندر سے دل جیسے کسی نے تیز چھُری سے چھید دیا تھا۔ اس کے ذہن میں حشر برپا تھا۔ یہ سب کچھ کیا تھا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ لیکن اس اندرونی طوفان کے باوجود اس کے بازو شل تھے اور قوتِ عمل غائب تھی۔ اس نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ ابھی اُٹھ کر ان دونوں کو دبوچ لے، مگر اس کا جسم دماغ کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اعصاب قابو میں نہیں ہیں۔

گنوں کی اس کمین گاہ میں تھوڑی دور اس کی ماں بیٹھی تھی اور اس تمام سانحے سے بے خبر تھی جو اس کے جوان لڑکے پر گزر چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلی۔ ہولے ہولے بتّے پر گئی اور جھک کر نہر کی چھوٹی نالی میں منہ ہاتھ دھونے لگی۔

"ماں!"

وہ تڑپ کر مُڑی۔ اور اس اجنبی کو حیرت سے دیکھنے لگی جو ابھی دہاڑا تھا اسے ماں کہہ کر پکارا تھا اور اب اپنی شعلہ بار آنکھیں کسی جلّاد کی طرح اس پر جمائے تھا۔

داڑھی۔ چہرے پر زخم کا داغ۔ پگڑی

یہ کون تھا۔ ؟؟؟

مگر آنکھوں کی بناوٹ۔

اور ناک کا خم۔

ماں کی آواز۔

وہ پہچان گئی۔

پھر وہ دونوں ان بھاری لمحوں کی گرفت میں آ گئے جہاں وقت رُک جاتا ہے۔

وہ سر سے پاؤں تک لرز رہا تھا۔ جیسے آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کو باہر نکلنے کا راستہ نہ ملے۔

وہ سکتے میں تھی — مرا ہوا بیٹا زندہ۔ اور یہاں فضل ماشکی۔ بیٹا؟؟
لاوا پھٹ پڑا "ماں!!! میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔" دونوں مٹھیاں بھینچ کر اس نے ہوا میں لہرائیں اور زور زور سے رانوں پر دوہتڑ مارتے ہوئے چکرا کر بیٹھ گیا۔ پھر دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک دیئے اور زار و قطار رونے لگا۔

عورت کے چہرے کے رنگ بدلتے رہے۔ نہ معلوم کن کن خیالات کے زیر اثر جہاں جنسی خیالات کا معاملہ ہو وہاں عورت کے دل کا راز پانا قطعی ناممکن ہے۔ ایسے وقت اس کا چہرہ آئینہ نہیں۔ بلکہ پردہ بن جاتا ہے۔ مگر بیٹے کو ماں کی طرف دیکھنے کا کوئی ہوش نہ تھا وہ کلیتہً اپنے جذبات سے مغلوب تھا۔

"بیٹا، دل نہ خراب کرو" چند لمحے بعد وہ بولی "میں تمھیں سب بات سمجھا دوں گی۔"
بیٹے نے زور سے انکار میں سر ہلایا۔ وہ آنسو روکنے کی شدید کوشش کر رہا تھا۔ جو اسے بولنے نہیں دیتے تھے۔ مگر وہ کچھ کہنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

عورت اسے گومگو کی حالت میں دیکھتی رہی۔

"بابا... ٹھیک...." وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا اور سخت مایوسی کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھک لیا۔

ماں اسے دیکھتی رہی۔ اسے سمجھ نہ آتی تھی کہ کیا کہے۔

ایک دم اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لئے اور ماں کی طرف ہاتھ پھیلا کر بولا۔
"ماں تم نے بابا کو مجھ سے مروا ڈالا۔ تم نے جھوٹ کیوں بولا تھا؟"

عورت اب سنبھل چکی تھی۔ "میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔"

"تو یہ فضل ماشکی۔۔۔۔" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"یہ تمہارے باپ کا تحفہ ہے بیٹے" عورت سنبھل چکی تھی "جس عورت پر سرِ بازار تہمت لگائی جائے اور وہ بھی خاوند کی طرف سے اور پھر اس کا کوئی سہارا نہ رہے نہ لوگ۔ نہ خاوند۔ نہ بیٹا۔ تو وہ پھر اس تہمت کا ہی سہارا لے سکتی ہے اور کون اسے منہ لگائے گا۔ میں نے تو فضل کا کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ مگر وہ مر گیا۔ تم لاپتہ ہو گئے۔ جیل والوں نے کہا کہ زلزلے میں مر گئے ہو۔ لوگوں نے ہر وقت فضل کا نام میرے منہ پر مارا تو میں اسی کی پناہ نہ لیتی تو کہاں جاتی؟"

اس نے اپنے ہاتھ بیٹے کی طرف پھیلا دیئے۔

بیٹے نے چند لمحے ماں کو غور سے دیکھا۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھا، اپنی ماں کو زور سے دھکا دیا، اور خود بھاگتا ہوا کھیت کا موڑ مڑ گیا۔

اس نے پیچھے سے ماں کی پکار سنی مگر وہ سرپٹ بھاگتا گیا۔

بھاگتے بھاگتے اس کے ذہن میں باپ کا وہ چہرہ ابھرا جو بیٹے کی کلہاڑی کا پہلا وار روکنے کے لئے دو ننگے بازوؤں میں پناہ لے رہا تھا۔ اس چہرے پر حیرت تھی۔ استعجاب تھا۔ خوف تھا۔ اور معصومیت تھی۔ وہاں ریاکاری نہ تھی۔

قبرستان کے پاس پہنچ کر دیوار پھلانگی۔ تیر کی طرح باپ کی قبر پر گیا۔ اس پر اوندھے منہ گر پڑا اور اس کا اندرونی کرب ایک چیخ بن کر نکلا۔

"بابا!!! مجھے بتاؤ۔ کون سچا ہے؟"

پھر نرم مٹی میں ناخن کھبوتا ہوا وہ بلک بلک کر رو دیا کہ ارد گرد کے درختوں

سے پنچھی اُڑ گئے۔

تین دن اور تین راتیں وہ پاگلوں کی طرح گھومتا رہا۔ اور اس سوال کا جواب سنسان سڑکوں، اندھیری گندی نالیوں، نیلے آسمان، چاند سورج اور پرندوں سے پوچھتا رہا۔ مگر کسی انسان سے نہ پوچھا۔ جو قابلِ اعتبار مخلوق نہ تھی۔

چوتھے روز صبح وہ پولیس اسٹیشن میں تھانے دار کے سامنے کھڑا تھا اور بڑے ہی غیر جذباتی سپاٹ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"میں جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہوں مجھے پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔"

"اوراق" لاہور

رحمان مُذنب

گشتی

پردہ ہٹا، وہ چھم سے اندر آگئی۔ نیک سائیں باہر تکیئے میں بیٹھا دیکھتا ہی رہ گیا، ایکا ایکی شعلہ لپکا اور آنکھوں میں دھول جھونک کر سامنے سے گزر گیا۔ بیتی پری شعلہ ہی تو تھی لیکن اس وقت اُس کے دہکتے ہوئے چہرے پر گرد کی مہین سی تہہ چڑھی تھی۔ نیم پریشان سنہری بالوں میں راستے کی مچلتی ہوئی دھول نکھر رہی تھی اور اب حُسن میں ابہام کی کیفیت آگئی تھی۔ حُسن ذرا پردے میں ہوا تو اس کا جادو اور بڑھا۔

جس گھر کو ٹھکرا کر گئی اس نے پھر خیر مقدم کیا۔ میز پر ریڈیو کے قریب اس کی تصویر پر ہار پڑا تھا۔ غالیچے کے رنگ اسی طرح چمک رہے تھے۔ اور اس میں نام کا سلوٹ نہ تھا۔ الماری میں کراکری قرینے سے دھری تھی۔ کمرے میں کہیں جالا تھا نہ مٹی تھی۔ کاٹھ کے چوکھٹے پر چڑھا ہوا آئینہ بالکل صاف تھا اور جب برقع اتار کر مقابل کھڑی ہوئی تو وہ اس کے بھرپور بدن کے جادو سے جگمگا اٹھا۔ بڑی

بڑی پھیلواں آنکھوں سے افق تا افق اُجالے بکھیل رہے تھے۔ پھر جب اس نے تھکن دُور کرنے کو ننگی باہیں سر سے اُوپر اُٹھائیں اور انگیوں میں انگلیاں الجھائیں تو آئینے کی حدیں پھلانگ گئی۔ اسے اپنے بدن کی دہکتی بھٹی سنا ر دیکھنے کے لئے کچھ پیچھے ہٹنا پڑا۔ انگ انگ میں چمکتا ہوا لہو آئینے کی رنگوں میں نکھرا۔ اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ جان گئی کہ نیک سائیں اس کے لہو کی مار سہہ نہ سکے گا لیکن فارم میں آتے آتے تھوڑا بہت وقت ضرور لگے گا۔ وہ چپکے سے بستر پر دراز ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں میچ لیں، کان کھلے رکھے۔

نیک سائیں مُسکرایا۔ وہ تکیے کا بادشاہ تھا۔ اس کی رعیت میں چند قمار باز، چند نوسر باز، چند گرہ کٹ، چند کوچبان، گاڑیبان، چند گویئے، ایک سنار، ایک لوہار ایک کھیلیرا، ایک بڑھئی اور چند شاگرد پیشہ لڑکے شامل تھے۔ ان میں کچھ سلوک کی منزلیں طے کر کے ملنگ بن گئے، کچھ ملنگ کا مقام پانے کی آرزو لئے رہے اور کچھ کے نزدیک تکیے کو کلب سے زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی۔

بادشاہ مُسکرایا۔ اپنی نیم جان رعایا کو تکیے کے کشادہ آنگن میں چاروں طرف دیکھ کر شوکتِ شاہانہ دوبالا ہوئی اور حبیت کے احساس نے اُسے زمین سے بالشت بھر اُونچا کر دیا۔ حالانکہ نیلتی بیرنی کی آمد سے پہلے وہ بھنگ کی ترنگ میں زمین سے بالشت بھر نیچے چلا گیا تھا۔ ویسے وہ راج سنگھاسن پر براجمان تھا۔ بھنگ کی مستی نے ملکورا لیا تو وہ اور موتی شاہ دونوں ہنسنے لگے اور جوں جوں ہنسے مستی سوا ہوتی اور کچھ دیر کے بعد بے طور ہو گئے۔ وہ بھول ہی گیا کہ نیلتی بیرنی آنگن بھیر کر اس کے سامنے سے کمرے میں گئی ہے شکست کی ندامت نے اُسے دبوچ

لیا ہے۔ یہی ندامت چُپ کی مہر بن کر اس کی زبان پر لگ گئی۔ ہوا چلی تو اس کی شانِ سکندری میں کچھ اور تیکھا پن آیا۔ بکھرے ہوئے حواس جمع کئے۔ اس نے کھانس کھنکار کر گلے کا ساز ٹھیک کیا اور بدن کو جھنجوڑا تاکہ چُست ہو جائے۔ اور فاتحانہ انداز میں مکالمہ ادا کر سکے۔ اب اس نے اپنا راج سنگھاسن محسوس کر لیا وہ اُونچے چبوترے پر اپنے وزیر باتدبیر ___ موتی شاہ کے ہمراہ بیٹھا تھا نیچے رعایا اوندھے مونہہ پڑی تھی۔ جو ہوش میں تھے اُن کی آنکھوں میں خوابوں کے حسین جزیرے بسے تھے، جو بے ہوش تھے۔ تکیے کا کُتا بُولی اُن کے نشیلے سانس کی بُو سونگھتا پھرتا تھا۔ سہ دری میں اس کا سکھایا سدھایا ہوا قادر قینچی مار جُوا کھیل رہا تھا۔ دو تین لڑکے جو غنڈوں کا کیریئر اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، تربیت کی پہلی منزل طے کر رہے یعنی "انٹرپیل" رہے تھے۔ بادشاہ تکیے کی ایک سمت سے گردن گھماتا گھماتا دوسری سمت لے گیا۔ یوں اعتماد اور توانائی بٹورتا گیا۔ اس نے قہقہہ لگایا اور پھر اپنے وزیر باتدبیر سے کہا "جتّھوں دی کھوتی اوتھے آن کھلوتی۔"

کانوں کے پردوں پر ضرب پڑی اور زینتی بیرنی تلملائی۔ گالوں پر خشمناک سُرخی پھیل گئی لیکن سُنی اَن سُنی کر گئی۔ اندر سے جواب نہ آیا تو بادشاہ کا حوصلہ بڑھا۔ اُس نے پھر وزیر باتدبیر سے کہا، "موتی شاہ! دیکھا وہ پھر آگئی۔ اُسے سُکھ کی روٹی اچھی نہیں لگتی۔ یہاں آبرو سے رہنا پسند نہیں۔ کوئی پوچھے، میری بادشاہت میں کس شئے کی کمی ہے۔ میری قدر نہیں اُسے۔ بارڈر قدموں میں ہے۔ وہاں جا کے پوچھے کس پائے کا اسمگلر ہوں۔"

جب نیک سائیں کی بلیغ گوئی کا سلسلہ طولانی ہوتا نظر آیا تو نیتی کے چہرے کی غضبناک سُرخی شعلہ بنی، شعلہ اُچک کر زبان پر آیا۔ جلال میں آئی۔ کچھ دیر کے لئے د" عورت بن گئی تھی اور اب جو صورتِ حال پیدا ہوئی تھی۔ اس سے عورت نمٹ نہ سکتی تھی۔ وہ آپے میں آئی۔ عورت چمک کر رنڈی بن گئی اور چلک کر بولی "بکواس بند کرے گا کہ یونہی شروع رہے گا۔ شریفوں کی طرح گھر آگئی ہوں تو کمینے کا دماغ ہی چل گیا جانے کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔"

عورت کو دیکھ کر وہ سچ مچ بادشاہ اور فاتح بن گیا اور اس کا دماغ چل گیا تھا۔ لیکن جب رنڈی سامنے آئی تو جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ بُلبلا تھا، ہوا نکل گئی اور ختم ہوا۔ یہ جمیلہ نہیں تھی جسے ڈانٹ لیتا، مار پیٹ لیتا اور وہ رو دھو کر ہی احتجاج کی رسم پوری کر لیتی۔ جمیلہ عورت تھی اور عورت کے پاس آنسو سے آگے کوئی ہتھیار نہیں ہوتا۔ نیک سائیں منھ چھوٹ تھا لیکن جمیلہ کے بجائے جب چمکتی دمکتی رنڈی سے مقابلہ ہوا تو بادشاہ کے سارے کس بل نکل گئے۔ نیتی جی اُٹھا کر بکھرے ہوئے بالوں کے سنہری جلال اور پُرشکوہ چال سے باہر آئی تو وزیر باتدبیر دُم دَبا کر ایک طرف چلا گیا۔ نیک سائیں نے سنبھلنے کے لئے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور پھر جب رنڈی نے دور ہی سے چِلّا کر کہا "اُٹھ وہاں سے، اندر چل" تو بادشاہ سلامت کو دھوتی کے ڈھیلے پلّو باندھنا مشکل ہو گئے۔ بادشاہ تو بلکہ ڈھیر ہی ہو گیا۔

"ابھی لے سو بہنیے تو تو یونہی خفا ہوتی ہے۔"

بادشاہ کمرے میں چلا گیا۔ اب وہ ایک پری کے حضور میں تھا جیسے شیشے

میں اُتارنے کے لئے قدِآدم شیشہ سامنے ہی دھرا تھا اور لنڈی کوتل سے کمرہ سج سنور رہا تھا۔

"یہ باہر بیٹھ کر بکنے کی تجھے کیا عادت ہے؟ تیری زر خرید لونڈی تو نہیں، تیری بیاہتا تو نہیں۔ نخرے دکھا جا کے جمیلہ کو! رہ رہی ہے تیری جان کو، میں تیری بیاہتا نہیں۔" پری نے بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے کہا۔

"ارے اپنے نصیب میں بیاہنا کہاں؟ تکیے کی زندگی ہے اور سَو سو دلداریاں ہیں۔ کیسے کوئی بیاہ کرے ہم سے؟"

"بیاہ تو تیری ماں نے بھی نہیں کیا، تو کیا کرے گا؟ جمیلہ نے بیاہ کا مزا چکھ لیا۔"

"چل چھوڑ غصّے کی باتیں بھاگ بھریے!"

سامنے کی الماری کے پٹ چوپٹ تھے اور وائٹ ہاؤس کی بوتل کے پیندے میں شراب چمک رہی تھی نیلتی نیٹ پی گئی مستی نیلتی پیرنی کی آنکھوں میں آئی اور دل نیک سائیں کا ڈولنے ڈوبنے لگا۔

وہ چق اُٹھا کر باہر نکلی۔ وزیر باتدبیر پھر چبوترے پر آ بیٹھا اور جماہیاں لینے لگا۔ وزیر باتدبیر سے رجوع کرتے ہوئے بولی "کُتّی دے پُترا! بازار سے تیرا باپ سودا لا کر دے گا۔"

"ہی ہی، ہی سرکار! باپ تو میری ماں کو ہی سودا لا کر دے سکتا ہے۔ تیرا سودا تو میں لا کر دوں گا۔"

اور پھر وہ لڑکھڑاتا لڑکھڑاتا بیس گز کے فاصلے پر تیس بار گرتا پڑتا آیا۔

وہ بولی "کنجر بھنگ بھی پیتا ہے تو تانبے کی پیٹھ ڈالی۔ پھر سنبھلا بھی نہیں جاتا۔" کنجر ہی ہی کرتا رہا۔ اس نے لات ماری تو وہ اوندھے مونہہ گرا اور پھر گھٹنے سہلاتا سہلاتا اُٹھا۔ دس کا نوٹ لایا اور بازار چلا گیا۔

غسل کے بعد وہ صیقل کی ہوئی تلوار تھی۔ انگ انگ سے تھکن نکل گئی۔ اب وہ گھر کی ملکہ تھی بلکہ یہ گھر اسی کے لئے بنا یا سجایا گیا تھا۔ نیک سائیں کو اسی کی معرفت اس گھر سے دلچسپی تھی اور نیتی پیرنی کو اسی گھر کی معرفت نیک سائیں سے دلچسپی تھی جمیلہ کو ترک کرنے میں اس گھر کا بھی ہاتھ تھا۔ دراصل لنڈی کوتل، تکیہ اور اس گھر نے مل کر جمیلہ کا گھر اجاڑا۔

نیک سائیں نے میز پر بوتل دھری اور دونوں نے مل کر سگریٹ سلگایا۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ گئے۔

"کیا حال ہے ٹبّی کا؟" نیک سائیں نے بوتل گلاس میں انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"لڑکیاں اور رنڈیاں ایک ہو گئی ہیں۔ سب ٹیڈی بن گئی ہیں۔"

"اب تو بلیبہ بھی ٹیڈی ہو گیا ہے۔ جبھی تو قدر نہیں رہی کسی چیز کی۔"

"خاک قدر ہے کسی چیز کی یہ چودھویں صدی ہے۔ چودھویں صدی۔

"ٹبّی اُجڑ رہی ہے لیکن ہوٹل کھل رہے ہیں۔ گھر گرہستنیں ناچ گانا سیکھ رہی ہیں۔"

"مطلب یہ کہ شریف اور بدمعاش ایک گھاٹ پانی پینے لگے ہیں۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو گیا ہے زمانے کو، کھاتے پیتے گھروں کی یہ لڑکیاں! یہ رنڈیوں کی اولاد تھوڑی ہیں لیکن ان کے اندر کیسی بانکی رنڈیاں

جاگ اٹھی ہیں۔"

نیک سائیں حقیقتِ حال سے آگاہ تھا اور ٹیڈی ازم کا حامی۔ جب سے عورت ٹیڈی ہوئی اسمگلنگ کا دھندا بڑھا اور پھر ہر عورت رنڈی تھی، ہر رنڈی عورت۔ کوئی عورت کم ہوتی ہے رنڈی زیادہ، کوئی رنڈی کم ہوتی ہے عورت زیادہ۔ موقعے موقعے کی بات ہے لیکن عورت سے زیادہ ٹیڈی "رنڈی کے قریب ہے اور قربِ قیامت کی یہ بھی ایک علامت ہے۔

نیتی بیرنی نے ایک پیگ چڑھایا اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"سر پر نائکہ نہیں، اُستاد نہیں۔ اب ان ٹیڈیوں کو کون نکیل دے۔"

"شیشیے! زمانہ تو دیکھو کون سا آن لگا ہے۔ اب تو عورتیں مَردوں کو نکیل دیئے پھرتی ہیں۔"

عورت گھر سے باہر نکل آئی ہے۔ ہر طرف تماشا ہونے لگا ہے۔ اب مرد کیا خالی گھر میں رہے؟"

"جہاں عورت وہاں مرد۔"

"گھر خالی ہو رہے ہیں، ہوٹل آباد ہو رہے ہیں۔ جتنے زیادہ ہوٹل بڑھتے ہیں اتنے ہی گھر خالی ہوتے ہیں۔ ہوٹلوں میں دل بہلاوے کے کھلونے مل جاتے ہیں مردوں کو۔"

"ٹبّی کا تو خواہ مخواہ نام بدنام ہے۔ اسے سرکار توڑ ہی دے تو اچھا ہے۔"

"ٹبّی ٹوٹ رہی ہے۔"

"ٹبّی ٹوٹنے کی خبر پر نیک سائیں کو دلی طور پر خوشی ہوئی۔ اس کی تو

آرزو ہی یہ تھی کہ ٹبی کی اینٹ ٹوٹ کر اس کے چوبارے میں لگ جائے اور پھر نیتی پیرنی یہیں کی ہو رہے۔ اس نے تو منت مانی تھی کہ جس دن ٹبی ٹوٹی وہ دیگیں چڑھائے گا۔

ایک مدت تک تکیے کا خوشنما کمرہ سنسان پڑا رہا لیکن نیتی پیرنی کے قدم دھرتے ہی مسکرانے، جگمگانے لگا۔

رات انتہائی دلفریبی سے آئی۔

رات آئی، رات جب کچھ لوگوں کے دل بیدار ہوتے ہیں۔ جو سو جاتے ہیں اُن کی روحیں ویرانوں میں بھٹکتی پھرتیں یا پھر ارمانوں کے جزیروں میں۔ نیتی پیرنی کا بدن بیدار تھا اور اس کے لہو کی حرارت شراب کے شعلوں کی لپک سے ہم آہنگ تھی۔ سلگتی ہوئی بو، اس کے پنڈے کی چراند کمرے میں جذب ہونے لگی اور پھر نیک سائیں کے جذبات نے بھی لو پکڑ لی۔ دونوں شراب کے نشے میں جلنے لگے۔ رات بھر چِتا جلتی رہی۔ چراند اُڑتی رہی۔ صبح ہوئی تو چِتا بجھ گئی اور دو یخ بستہ بدن قالین پر اَدھ موئے پائے گئے۔ قریب ہی شراب کے برتن پڑے تھے۔

باہر تکیے میں نصرو حسب معمول ڈنڑ پیلنے کے بعد ہاتھوں سے اپنی چمکیلی رانیں آہستہ آہستہ مگر زور زور سے مسل رہا تھا۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے آویزاں تھے۔ بدن پر جوانی چمک رہی تھی۔ وہ ہر روز بڑے خضوع و خشوع سے پیڑ تلے آکر پہلے بدن کی مالش کرتا، پھر کسرت کرتا اور آخر میں رانیں مسلتا یہ اس کی عبادت تھی۔ اسے یہ نکتہ اچھی طرح معلوم تھا کہ صفِ اوّل کا غنڈہ

بننے کیلئے بدن کمانا پڑتا ہے۔ البتہ یہ ابھی اسے معلوم نہ تھا کہ بدن کا بانکپن لڑکیوں کو چیت کرتا ہے۔

اس کی ساری سوچ ایک ہی نقطے پر سمٹ آئی اور وہ گردوپیش کی دنیا سے بے خبر اپنے بدن کی شادابی اور لہو کی تابانی کے نظارے سے آپ ہی چیت ہونے لگا۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ نیتی پیرنی اسے تک رہی ہے۔ پل بھر کو اس کی نگاہیں اس کے بدن سے نہ ہٹیں۔

نیتی پیرنی خوش ذوق تھی۔ وہ بھی حسن و جوانی کی نگہداشت کے راز سے آگاہ تھی۔ قدرت نے اُسے اچھا بدن دیا تھا، اچھی شکل و صورت عطا کی تھی۔ اس کے نزدیک اسے نکھار سنوار کر رکھنا کارِ ثواب تھا اور کارساز کی منشاء کے مطابق انہیں بگاڑنا گناہ تھا۔

نصرو کو ورزش کرتے دیکھ کر نیک سائیں بھی مسرور ہوا۔ کبھی نصرو مریل سا لڑکا تھا۔ اس کی ہڈیوں پر گوشت کے بغیر ہی چمڑہ مڑھا تھا۔ نیک سائیں کے زیرِ ہدایت نصرو نے گوشت پوست کو ترقی دی۔ یوں نئے نصرو نے جنم لیا۔ نیا نصرو درحقیقت نیک سائیں کی تخلیق تھا۔

نیک سائیں کے بدن پر صرف لنگوٹ تھا۔ ہاتھ میں تبریز سوپ کی ٹکیہ تھی جو چاندی کے سوپ کیس میں دھری تھی۔ نیک سائیں کا لنگوٹ دیسی وضع کا تھا لیکن مزاج بالکل ولایتی تھا اور یہ ولایتی مزاج اسے لنڈی کوتل سے ملا تھا۔ لنڈی کوتل اس کے قدموں میں تھا۔

موتی شاہ نے بھی حسرت بھری نظروں سے نصرو کا بدن دیکھا۔ اس کے

دل میں اُمنگوں کا طوفان مچل گیا اور اس طوفان کے گرد ماضی کے دھندلکے لپیٹ گئے۔ نصرو کے بدن میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں اور ان سے پھوٹتی ہوئی جوت اس کا مستقبل جگمگا رہی تھی۔ موتی شاہ بھی کبھی یوں ہی جوان تھا اور اس کے بدن نے بھی کبھی جوانی کے سیلِ بے پناہ کو پناہ دی تھی لیکن پھر جوجی مر گیا اور اسے تکیہ کھا گیا۔ رنڈی کو چوبارہ کھا جاتا ہے۔ غنڈے کو تکیہ۔ رنڈی چوبارہ نہیں چھوڑتی۔ غنڈہ تکیہ نہیں چھوڑتا۔ انھیں بیٹھنے کو تو ضرور جگہ چاہیے تھی۔

جُوجی حسین اور نازک مزاج تھا۔ لانبا قد، پتلا جسم، بڑی بڑی آنکھیں، دانت چنبے کی کلیاں۔ ہر وقت مسکراتا رہتا۔ موتی شاہ اسی ادا پر فریفتہ تھا۔ جُوجی کو اختیار تھا کہ بازار کی جس دکان سے چاہے سودا لے۔ جو چیز چاہے اٹھا لے۔ جسے گالی دے وہ چُپ چاپ سُن لے۔ جسے پیٹنا چاہے وہ شرافت سے پٹ جائے۔ اس کی پٹائی میں موتی شاہ کی صرف وجاہت ہی شامل نہ تھی۔ اس کے کمانی دار چاقو کا دبدبہ اور خوف بھی شامل تھا۔ جوجی کبھی جلال میں آتا تو اس کا گلابی چہرہ تمتما کر لال گلاب بن جاتا اور پھر دیکھنے والا اسے گلے لگانا چاہتا تھا اور یہ جلال تو بس گھڑی دو گھڑی ہی کا ہوتا، پھر وہی لال شعلہ گلابی نا ؤ پر آجاتا۔ جُوجی کیا مَرا، بازار مَر گیا۔ موتی شاہ مر گیا۔ اس کا جنازہ اس دھوم سے نکلا جیسے کسی ہیرو کا جنازہ ہو۔ موتی شاہ دل شکستہ ہو گیا، ہاتھوں میں سکت نہ رہی۔ اس نے کمانی دار چاقو پھینک دیا۔ تکیے کی مٹی میں مل کر مٹی ہوا۔ آج جو اُس نے نصرو کا سجرہ بدن دیکھا تو وہ تلوار تھا۔ اس کے بدن میں نصرو کا بدن ہلکورے لینے لگا۔ اس کے بدن میں ہلچل سی مچی۔ اس نے ہوا میں بازو لہرائے

کھڑے کھڑے دوڑ لگائی۔ نصرو اس حرکت پر ہنسا اور پھر اس کی ہنسی قہقہوں میں بدل گئی۔ ان قہقہوں کی چوٹ موتی شاہ کے دل پر لگی جو اس نے نوٹ کر لی۔

نیتی پیرنی کے بال کھلے تھے۔ سر جھٹکتی تو لٹیں تلملا اٹھتیں۔ سامنے سے گریباں کھلا تھا اور ویسے تو سارا بدن ہی کھلا تھا۔ وائل کی قمیض سے کیا ڈھکتا چھپتا۔ کپڑے تو جیسے اسے چبھتے تھے۔ یوں تو کھلے گریبان پر ہر کسی کی نگاہیں جا سکتی تھیں لیکن اس تک پہنچنے والا تکیے کی حدود میں کہیں نہ تھا۔ یہ تو نیک سائیں ہی کو شرف حاصل تھا۔ اس کے شاداب ریشمیں پنڈے کو چھو سکے۔

نیتی پیرنی موت تھی۔ قریب آنے والے کے لئے! نہ جانے ہر کسی کو ڈس لیتی نصرو کو قہقہہ لگاتے دیکھا تو اس نے گریبان کچھ اور کھول دیا اور پورے تکیے کو فیر کی زد میں لے لیا، موتی شاہ پر قہر آلود نظریں ڈالتی ہوئی نصرو کے پاس چلی گئی اس کے حضور میں ایسا بھرپور بدن تھا جس کا انگ انگ جوانی سے لبریز تھا۔ ایک خفیف سی خراش، زخم کا معمولی سا نشان بھی نہ تھا کہیں۔ پنڈا ڈھلا ہوا چاند۔

"یونہی ہنستا رہا کر، قہقہے مارتا رہا کر، بڑا اچھا لگتا ہے تو" نیتی پیرنی نے پاؤں تلے سگریٹ مسلتے ہوئے کہا۔

"پر بی بی موتی شاہ کیوں جلتا ہے مجھ سے؟ اسے میری ہنسی اچھی لگتی ہے، نہ قہقہے اچھے لگتے ہیں"

"اس کا جوجی جو مر گیا۔ وہ تو پاگل ہے، پاگل۔ جوجی کی یاد میں گھل گھل کر کھوکا ہو گیا ہے۔ اس کے اندر کچھ نہیں رہا۔ ہڈیوں میں سے گودا بھی نکل چکا ہے۔ جوانی اور جوجی کو یاد کرتا رہتا ہے"

"جوانی کے لئے بڑی جان مارنی پڑتی ہے بی بی! جان بنانا کھیل نہیں۔"

"ٹھیک کہتا ہے تو نصرو!"

ادھر مکالمہ ہو رہا تھا، ادھر کنوئیں پر مولا ملنگ بوکے نکال نکال کر نیک سائیں پر پھینک رہا تھا۔ نیک سائیں نہاتا کم اور نیتی پیرنی کو دیکھتا زیادہ تھا۔ نصرو بھی اس کی نگاہ میں تھا اور کیسے نہ ہوتا؟ نیک سائیں اس کا خالق تھا اور اب اسے اپنے منصوبوں کا معمار سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں ابھی نصرو کے چالو ہونے اور اس کے کام کی رسمِ افتتاح کا وقت نہ آیا تھا۔

نیتی پیرنی نے ایک بار پھر نصرو کا بھرپور جائزہ لیا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلی گئی

نیک سائیں نہا کر وزیر باتدبیر کے پاس چلا گیا۔ نصرو کنوئیں پر چلا گیا۔

نیتی پیرنی نے اندر سے مولے ملنگ کے ہاتھ حلوے پوری کا طباق بھیجا۔

چائے کی چینک خان کی دکان سے آ گئی۔

نیک سائیں پر ابھی تک فاتحانہ کیفیت سوار تھی۔ اس نے موتی شاہ کی ران پر ہاتھ مار کر کہا، "مولا جانے! عورت کو جوتی تلے دبا کر رکھتا ہوں ——— کیا مجال ہے، جائے اور لوٹ نہ آئے۔"

"اوے آہو بادشاہ! نیتی پیرنی کی کیا ہستی ہے جو تجھ سے مقابلہ کرے؟"

"مقابلہ! توبہ توبہ کر کے کہتا ہوں۔ غرور کی بات نہیں جس عورت کا ایک دفعہ کلاوہ بھرا ہے۔ وہ دوبارہ کسی دوسرے کے پاس نہیں جاتی۔

"کیا کہنے تیرے بادشاہ؟"

"قسم ہے مولا کی! رستم کی بھی عورت ہو تو اسے لونڈی بنا لوں۔ اللہ معافی دے! ماں کا یار ہوں، ماں کا یار!"

"مجھے خبر ہے تیری بادشاہ! گلی کی عورتیں تجھ سے پناہ مانگتی تھیں۔"

"گلی کو تو جھنگل کر دیا تھا۔ میں نے قسم پروردگار کی! ابھی منڈے کے پاس ہوتا تھا تو گلی کو میری خبر ہو جاتی تھی اور پھر ادھر رنڈیوں نے میری شکل دیکھی۔ ادھر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔"

"تجھ سے ڈرتی تھیں بادشاہ!"

"موتی شاہ! کبھی مفت بری نہیں لڑائی۔ پہلے ناک پر دھاگا رکھتا تھا پھر رنڈی کی دہلیز پر پاؤں دھرتا تھا۔

بڑی بڑی رنڈیاں پاؤں پکڑتی تھیں۔"

"نیلی پیری گھٹ تھی کسی سے۔"

"جواب نہیں اس کا۔ خدا کی قسم ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ بڑی منہ زور تھی۔ دس روپے روز دیتی تھی کرایہ چوبارے کا۔ بڑی سج سنور کر بیٹھتی تھی۔ ابے مفت برکو چاقو مار دیا تھا اس نے اتنی تو مجھ چھوٹ تھی مغرور اتنی تھی کہ آنکھ بھر کر نہیں دیکھتی تھی تماش بین کو۔ لیکن دیکھ لے، رام کر لیا ہے اسے!"

"اوئے نہیں جواب تیرا بادشاہ!"

"مولا جانے باندھ دیا ہے پیری کو۔ ہل نہیں سکتی۔ دو دفعہ بھاگی ہے لیکن آپ ہی واپس بھی آگئی ہے۔ میرے یار اس کی کیا ہستی ہے کہ یہاں سے جائے؟ عورت تو میری مٹھی میں ہوتی ہے۔"

پوری حلو ختم ہوا تو باتیں بھی ختم ہو گئیں۔ مولا ملنگ طباق لے کر اندر گیا۔ تو نیک سائیں کی باتیں بھی اندر لے گیا۔ طباق رکھتے ہی اس نے ساری باتیں اُگل دیں۔ ایک ایک بات زہر میں بجھا ہوا تیر تھی۔ ہر بات دل میں چبھی بیتی بیرنی نے اسے بالوں سے گھسیٹا اور دکھّی میں دو چار لاتیں جڑ دیں۔

"بدتخم، نمک حرام! تیرے سے میری حمایت میں کوئی بات نہ نکلی۔ تو نے وہیں دلّے کا موتھ نہیں توڑا جب وہ میرے خلاف زہر اُگل رہا تھا؟"

مولے ملنگ نے روتے روتے کہا۔ "بی بی دلّا بڑا جبر دست ہے۔"

"جانتی ہوں اسے۔ بنا پھرتا ہے زبردست تجھ ایسے کے لئے۔"

"بی بی وہ کسی سے دلا نہیں جاتا۔"

"رنڈی کے! بیتی بیرنی اسے دل دکھائے گی۔ دیکھنا کیسے نشہ رگ دیا تی ہوں۔ ٹوٹے چھتّر کی طرح بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔"

مولا ملنگ ایک جانب ڈر سہم کر بیٹھ گیا اور دیکھنے لگا کہ شعلوں بھری یہ آندھی کب تھمے گی۔

وہ سچ مچ آندھی ہی تھی لیکن اس کی رفتار زیادہ نہ تھی کیونکہ جس قالین پر آندھی چل رہی تھی وہ بہت ملائم تھا، بالوں کی گپھاؤں سے ریشمیں دلدل بن گئی تھی۔ اس میں آندھی کے پاؤں دھنس دھنس جاتے۔ یہی ریشمیں دلدل نیک سائیں کی حمایت میں خاموش آواز بن کر اس کے دل و دماغ میں اُتر گئی۔ وہ غصّے کے مارے قالین کو کھوندتی رہی۔ اپنی دانست میں نیک سائیں کو قدموں تلے روندتی رہی جس نے کمرے میں اس کے حضور سارا لنڈی کو تل رکھ دیا

تھا۔ کوچ پر دھم سے گری تو اسے ہلکے ہلکے، نرم نرم جھٹکے لگے جیسے نیک سائیں نے
اسے جھولا جھلایا ہو۔ اس کی آنکھوں میں گلی کا وہ چوبارہ گھوم گیا جو بڑا ہجاگوان
تھا اور جہاں شام کو روشنی کے پھول کھلتے ہی تماش بین کی آرزوئیں اس کے
گرد ہالہ بنا لیتیں۔ وہ اُجالے کے قلعے میں رانی بنی رہتی اور لوگ جھروکہ درشن
کے لئے بار بار چکر کاٹتے رہتے۔ دہلیز پر نہی پاؤں دھرتا جو راجہ ہوتا۔ وہ سرے
تو بس دُور ہی سے آنکھ مار کر جی خوش کر لیتے اور اس کی دہلیز پر پاؤں دھرنے
کی تمنا کرکے چلے جاتے لیکن اب ٹبّی اُجڑ رہی تھی قلعہ برباد ہونے کو تھا۔ ہر صبح
تباہی کی خبر لاتی اور اُسے نیک سائیں سے قریب تر کر دیتی۔

سگریٹ پیا، پیالہ پیا۔ کچھ جی ہلکا ہوا۔ پھر صندوق میں سے دس دس کے
نوٹ نکال کر مولے ملنگ کے ہاتھ جمیلہ کو بھجوائے۔ مولے ملنگ نے جاتے جاتے
کہا: "بڑی نیکی کماتی ہے تو بی بی! جمیلاں بچاری کا اس دُنیا میں کون ہے؟ ابھی
تو اس کے بچّے بھی جوان نہیں ہوئے ہے۔"

چاند بھرپور رعنائی کے ساتھ طلوع ہوا۔ ملنگ سرور میں آئے۔ چاند نہیں
محبوب تھا، ہجر و فراق کا ساتھی تھا، خوب صورتی کی علامت اور بس اس کی کرن
کلیوں سے زمین و آسمان جگمگا رہے تھے۔ یہ کرن کلیاں تو ملنگوں کی محفل سجا
رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر قوالوں نے بارہا انتہائی جوش و خروش سے نعرے لگائے
اور ملنگ بھنگ کا پیالہ پی خیال کی سیڑھی لگا، آسمان پر چڑھے اور ستاروں پر کمند
ڈال آئے۔ بھنگ کا پیالہ پی کر وہ ڈھے جاتے اور ان کے خیال سپوتنک
بن جاتے۔

رات کو ملنگ سرور میں آئے اور قوالی کی محفل جمی۔ دو ملنگ لڑکھڑا لڑکھڑا کر رقص کرنے لگے۔ ویسے ہر ملنگ جھوم رہا تھا۔ ہر بول اور گھڑے کی ہر ضرب جیسے روح میں جھوم رہی تھی اور پھر پوری کائنات گھوم رہی تھی۔ موتی شاہ کے گلے میں نور تھا۔ اس کی آواز نے جادو جگا دیا اور سُریلی آواز نے سب کو سر مست کر دیا۔ مستی سرمستی میں بدل گئی۔ نیک سائیں کی آواز بھی کم دلکش نہ تھی۔ سرمستی نے رقص کرنے والے ملنگوں کا انگ انگ توڑ دیا۔ وہ گر گئے اور فرش ہو گئے وہ ملنگ ہی تو تھے۔ افریقہ کے جادو پرست تو نہ تھے جو چاندنی میں دیوتا کو زیر کرنے اور کھیتیاں لہلہانے کے لئے رات رات بھر ناچتے اور تھکنے کا نام نہ لیتے۔ یہ تو بھنگ پی کر خود ہی زیر ہو جاتے دیوتا کو کیا زیر کرتے۔

نغمہ عروج پر تھا تو نصرو بھی آ گیا۔ وہ گھوڑا بوسکی کی بے داغ بے سلوٹ چمکیلی قمیص پہنے ہوئے تھا۔ ہرے پلّو والا ریشمی لاچا باندھ رکھا تھا چاندنی رات میں بھی اس کے چہرے پر تمازت تھی۔ ہوا سے دھوتی سرکتی تو اس کی پنڈلیوں کا لشکارا دُور دُور پڑتا اب تو نیتی بیرنی بھی باہر آ کر چبوترے پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں رہ رہ کر نصرو کی تنی ہوئی گردن اور چوڑی چکلی چھاتی پر جاتیں۔ یہ سجرا سجیلا بھرپور بدن جس پر کوئی داغ دھبّہ نہ پڑا تھا۔ اس کے دل میں پیوست ہو گیا۔ کھنکتی ہوئی جوانی کے اس چھلکتے ہوئے ساز کو ابھی کسی نے بیدار نہیں کیا تھا۔ نصرو ایک تیز خواہش بن کر نیتی بیرنی کے بدن میں تیر گیا۔ اس نے نصرو کو ٹپکے کا آم سمجھ لیا جو ٹوٹا تو اس کی جھولی میں گرے گا۔

نصرو مستوں اور سرمستوں کے حلقے میں بیٹھ گیا موتی شاہ اور نیک سائیں

کی آواز کا جادُو اس پر بھی چل گیا۔ وہ بھی سرمستی میں جھومنے لگا۔ موتی شاہ نے ذرا دَم دبا کر سگریٹ میں چرس بھر لی۔ سُلگا کر چار کش لئے اور لفرو کے کان میں کچھ کہہ کر سگریٹ اسے تھما دیا۔ لفرو نے کش لیا ہی تھا کہ وہ لپک کر آئی جھپٹ کر اس نے سگریٹ چھین لیا اور جوتی سے مَسل دیا۔ اس وقت نیتی بیرنی کا چہرہ چنگاری تھا اور دل کی دھڑکن تیز تھی کولھے پر ہاتھ رکھ کر دو چار گھڑی کھڑی رہی اور پھر اس کا سارا غصّہ اس کی دائیں ہتھیلی میں کھنچ آیا۔ آگ سے لبریز طمانچے موتی شاہ پر بے تحاشہ برسنے لگے۔ نیک سائیں ہاتھ نہ پکڑتا تو جانے کب تک مشق جاری رہتی۔ نیک سائیں بڑی مشکل سے اسے حلقے میں سے لے گیا۔ کمرے میں جا کر اسے کوچ پر بٹھا دیا۔ غصے کے مارے اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ بھرپور عورت تھی، رنڈی تھی۔ رنڈی کا غصّہ عورت کے غصّے سے زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ اندر سمٹنے کی بجائے باہر چھلک آتا ہے۔

نیک سائیں نے غصّہ اُگلوانے اور اسے ٹھکانے پر لانے کے لئے بات چھیڑی " دلبر جانی! لفرو کو بھی چار چانٹے لگا دیئے ہوتے "

" اس کے تو میں بال نوچ لیتی وہ تو وہاں سے کھسک ہی گیا! "

" موتی شاہ چنگا مندا دیکھتا ہی نہیں۔ ہر کسی کو چرس پر لگا دیتا ہے "

" کمینہ سونے سی جوانی کو داغ لگانا چاہتا ہے۔ وہ معصوم لڑکا اُٹھتی جوانی۔ اسے کیا خبر یہ زہر ہے "

" لفرو تو میری آس ہے رانی! جوان ہے! جیدار ہے۔ ایک دن اپنا سارا دھندا اس پر چھوڑ دوں گا "

"اور تو چین کی بنسری بجائے گا۔ تکیے میں جھنگیوں، چرسیوں کے ساتھ پڑا رہے گا؟"

"نہ کیوں جب کبھی ڈھیر سارا مال لانا ہو گا۔ میں آپ جاؤں گا۔"

"ہوں۔"

نصرو کے بارے میں نیتی بیرنی کو نیک سائیں کی نیت کا پتہ چل گیا۔

اگلے روز اجنبیوں کی ایک ٹولی آئی اور نیک سائیں کو اپنے ساتھ لے گئی۔ کام خطرناک اور پیچیدہ سودے کا تھا۔ اس میں فقط دلیری کام نہ آتی۔ عقل، رسوخ، تجربے اور حاضر دماغی کی ضرورت تھی۔ یہ علم دوسرا تھا جس کی تربیت نیک سائیں نے زندگی کے خار زار میں پائی تھی۔

تکیہ خالی خالی تھا۔ موتی شاہ بھی مہم پر گیا تھا اور نصرو حسبِ معمول کسرت کر رہا تھا۔

نیتی بیرنی اس کے پاس چلی آئی۔ سر دست اس نے اس کے بال نوچے۔ نہ سگریٹ والی بات چھیڑی۔ اس وقت وہ کیسے غصے میں آئی۔ نصرو تو اس کے دل میں مچل رہا تھا۔ بولی "اڑیا! ذرا میرے ساتھ تو چلنا، کام ہے مجھے۔"

نصرو کی آنکھیں جھک گئیں اور اس پر شرم کا بوجھ پڑ گیا۔ وہ تو اس کے سائے تلے دب ہی گیا۔ شرم تو چیز ہی ایسی ہے کہ جوانی کی صبحِ اوّلیں بن جاتی ہے اور پھر عورت کے سانسوں کی گرمی سے ایک دن چٹک جاتی ہے۔ تب شرم بُو، بن کے اُڑتی ہے۔ وہ شرم کے مارے ادھ موا ہو کر رہ گیا۔ اس کی زبان سے صرف "اچھا" نکلا اور وہ بھی بڑی دھیمی آواز میں۔

نیتی بیری بھول تھی، بھول مسکرایا۔ اس نے اپنی دو انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی اُونچی کی اور اس کی جھکی ہوئی آنکھوں کو اپنی آنکھوں کے متوازن لے آئی۔ ٹھوڑی تھامے رہی۔ مبادا پھر آنکھیں جھک جائیں۔ اس کے بدن میں جھرجھری سی آئی اور چہرے پر سُرخی سمٹ آئی۔ وہ مسکرایا اور اس نے نیتی بیری کی نظروں سے نظریں ملائیں۔ جلوے سرور سے لبریز ہو گئے۔

"کیوں رے نصرو اس ماں کے یار سے سگریٹ کیوں لیا تھا؟"

"اس ماں کے یار نے کہا تھا، چرس کا سگریٹ پینے ہی سورگ میں پہنچ جائیگا۔"

"ہونہہ، کمینے کم ذات نے بات بھی کی تو کیسی۔ حرامی سورگ میں پہنچ جائیگا۔ سورگ میں پہنچاؤں گی تُجّے۔"

"سچ ؟"

"سچ !"

"کب ؟"

"آج۔ لیکن قسم کھا میری جان کی کہ کبھی سگریٹ نہیں پیئے گا، چرس والا نہ خالی۔"

"تیری جان کی قسم! سگریٹ نہیں پیوں گا۔ نہ چرس والا نہ خالی۔"

"بس اب سورگ تیرا ہو گیا۔ جھٹ سے نہا لے۔ بازار ہو آئیں۔"

نصرو بدن کی حرارت کم کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔

نیتی بیری کمرے میں چلی گئی تاکہ اپنے رانجھے پر جادو کرنے کے لئے پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت بن جائے۔ اس نے غسل کیا اور نئی شادابی سے طلوع ہوئی۔ اپنے آپ کو خوشبوؤں میں بسایا۔

اس کے اندر بدن بول رہا تھا۔ چاروں طرف خوشبو کے بھنور ناچ رہے تھے۔ کپڑے پہن کر وہ بیس سال کی تتلی بن گئی۔ نصرو نے اس میں جوانی کا احساس جگا دیا۔ ہاتھوں کی رگیں چھپ تو نہ سکیں لیکن اس کے ہونٹوں پر کھلے ہوئے پھولوں اور دانتوں کی چمپا کلی نے اسے سجا کر دیا۔

دونوں بازار چلے گئے۔ اس کے بدن کی مہک سے وہ بخش تھی۔ نصرو سچ مچ سورگ میں پہنچ گیا۔ سورگ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے پاؤں تو جیسے زمین پر ٹکتے ہی نہ تھے۔ اس کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ بیتی بیرنی ایسی ذی شان عورت اسے شرف رفاقت بخشے گی۔ وہ کب جانتا تھا کہ جوانی ایک غرور لاتی ہے، ایک کا غرور توڑتی ہے۔ وہ بار بار گردن تان کر نگاہیں اونچی کرتا لیکن گردن اپنے آپ جھک جاتی، نگاہیں نیچی ہو جاتیں۔ بیتی بیرنی کی بڑی بڑی آنکھوں سے چمکتی ہوئی کرنیں اکہرے مہین نقاب میں سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھیں اور دیکھنے والا ان کے تعاقب میں تھا۔ بتے حلوائی کے تھڑے پر خیرا جھرنی والا اور اس کے دو ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے نصرو کو عورت کے ساتھ جاتے دیکھا تو حیران ہوئے۔ انھیں امید نہ تھی کہ نصرو اتنی جلدی پر پرزے نکال لے گا۔ خیرے جھرنی والے نے کھانس کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا "معشوق لمبر ون ہے۔"

نصرو نے سُنا تو اس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔

پھر اس نے کہا "اس معشوق کے لئے جان بھی دینی پڑے تو پروا نہیں۔"

نصرو کا چہرہ اور بھی تمتمایا لیکن وہ چپ رہا۔ دراصل وہ اتنی جلدی پر پرزے

نکالنے پر جھینپ سا گیا تھا۔ نیلی بیرنی پر دو چوٹیں ہوئیں اور وہ چپ رہا۔ اس نے نقاب اُلٹا اور نصرو سے کہا۔

"کھینچ کمینے بد ذات کی کھال، دیکھتا کیا ہے؟"

یہ جملہ بجلی کا بھالا تھا جو اسے جا چبھا۔ وہ بجلی کا بھالا بن گیا اور بجلی کا بھالا اس نے خیرے جھرنی والے کو چبھو دیا۔ وہی چاقو جو انتڑیاں کاٹ پھینکتا خیرے جھرنی والے کے پینترا بدلنے پر اس کی ران چیر گیا۔ اس کی دھوتی خون سے لت پت ہو گئی۔ چاقو تو خیرے جھرنی والے کے پاس بھی تھا لیکن ڈب ہی میں رہا۔ نصرو کی کلائی کا زور دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ نصرو کا بازو اس تیزی سے حرکت میں آیا کہ سب دنگ رہ گئے۔ اس کی کلائی میں نیا کس بل تھا اور اسکی انگلیوں کی گرفت اتنی زبردست تھی جیسے وہ آدمی کو نہیں سانڈ کو مارنے چلا تھا۔ ٹیڈی باٹی ٹیک نے آنکھ ماری، پھر گالی دی۔ پھر دھکا دیا اور خیرا جھرنی والا بھاگ گیا۔

نصرو نے چاقو ہوا میں لہرا کر کہا "او بھگل!"

بھگل نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ گلی میں مڑ کر غائب ہو گیا۔ نصرو نے سینہ تان کر کہا "عورتوں کی کمائی کھانے والے یہ کیا لڑیں گے مجھ سے!"

ٹیڈی باٹی ٹیک نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اس نے ہوا کا بدلتا ہوا رُخ دیکھ لیا تھا۔

نیلی بیرنی نے نصرو سے چاقو لیا اور اسے لے کر چلی گئی۔

خیرے جھرنی والے کے بڑے ٹور تھے۔ بستہ ب کا بدمعاش بستہ الف میں ترقی پانے کے لئے بے تاب تھا۔ لیکن نصرو نے کرکری کر کے اس کی ترقی کے

راستے بند کر دیئے اور اس کا مستقبل تاریک کر دیا۔ علاقے کے وہ لڑکے جو اس کے شاندار مستقبل، بڑھتے ہوئے رسوخ اور پھیلتے ہوئے کاروبار سے متاثر ہو کر دھڑا دھڑ اس کے حلقۂ احباب میں داخل ہوئے اور اس کے حکم سے وارداتیں کرنے لگے تھے بدظن اور بددل ہو گئے۔ اس کا تو سارا طلسم ہی ٹوٹ گیا۔ ادھر نیتی بیری کے دل پر نصرو کی دھاک کچھ اور بیٹھ گئی۔ اب وہ اکثر نصرو کو لے کر بازار میں سے گزرتی۔ کسی کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے اور آوازہ کسنے کی جرأت نہ ہوتی۔ نیتی بیری نے ایک اور نگہبان پالیا۔ وہ اسے ہر وقت خوش رکھتی۔

سورگ میں رہتے رہتے اس میں اکتاہٹ آ گئی۔ آدمی سورگ سے بھی اُکتا جاتا ہے۔ اس میں اسیری کا احساس بھی شامل تھا۔ آخر ایک دن اُس نے کہا۔

"میں فسٹ کلاس پشوری تانگہ لوں گا۔"

"مال ہے" نیتی بیری نے پوچھا۔

"بجا چے سے لے لوں گا۔ گھوڑی اس کے پاس ہے۔ بمبری تانگہ وہ لے دے گا۔ تجھے تانگے میں بٹھا کر نکلوں گا تو مزا آجائے گا۔"

"تانگے گھوڑے کے اب دن لد گئے۔ سکوٹر لے لے۔"

"سکوٹر کے لئے بیا پیا دھیلا نہیں دے گا۔"

"دام نیک سائیں سے لے دوں گی۔ پہلے کہیں سے سکوٹر چلانا سیکھ اور پھر میں تجھے آپ چل کے سکوٹر خرید دوں گی۔"

"سچ ؟"

"سچ !"

نصرو کے لئے سکوٹر تو بہت بڑی نعمت تھا۔ آدمی کو کار اور کوٹھی پاکر مستی اور خرمستی کی کیفیت حاصل ہوتی ہے لڑکے کو سکوٹر پاکر حاصل ہوتی ہے۔ وہ فیروز فزآٹیے کے ڈرائیونگ سکول میں سکوٹر چلانے کی تربیت پانے لگا۔ سکوٹر اس کا خواب تھا، دلفریب خواب اور وہ سوچنے لگا۔ جب وہ نیتی بیری کو پیچھے بٹھائے گا، نیتی بیری اپنی باہیں اس کی کمر میں ڈال دے گی اور وہ سکوٹر اڑاتا جائے گا تو گستی اونچی ہواؤں میں اڑنے لگے گا۔ بالکل سورگ میں ہوگا۔ وہ سکوٹر پر پری اڑائے گا اور فٹ پاتھ پر چلنے والی دنیا اسے رشک کی نگاہ سے دیکھے گی۔

نیک سائیں کو گئے کئی دن ہو گئے تھے۔ لیکن اس میں تشویش کی کوئی بات نہ تھی۔ وہ لنڈی کوتل سے سیدھا کراچی چلا گیا ہوگا، وہاں سے اور کہیں نکل گیا ہوگا۔ بڑا کائنا تھا۔ اس کے پاس مہم جوئی کے لئے عقل، تجربے اور حاضر دماغی ایسے تینوں حربے تھے۔ یوں ہی تو روپے کی ریل پیل نہ تھی۔ نیتی اس کے گنوں سے خوب آگاہ تھی، وہ اس کی قدر کرتی تھی۔ وہ اس کی تھی اور نصرو؟ نصرو اسکے بے پایاں غرور اور تمکنت کو سنبھالا دینے والا، اس کی آرزوؤں میں کھنکنے والا جوان تھا۔ اس نے ایک خانے میں عقل، تجربے اور حاضر دماغی کو جگہ دی، دوسرے میں ہم جوبدن کو۔ وہ اپنے وقت کی دروپدی تھی۔ اگر دروپدی تو پانچوں کو اپنے دل، دماغ اور بدن میں رکھ سکتی تھی تو وہ دو کو بھی سنبھالنے کی مجاز نہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی تکمیل اور شب و روز کی سرگرمیوں کے لئے دو کو ضروری سمجھا اور اب تیسرا بھی آدھمکا، بالکل معصوم صورت کا پیارا پیارا بھولا بھالا لڑکا۔ یہ جمیلہ کا لڑکا بوبی تھا۔

بالکل باپ پر گیا تھا۔ ہلکی ہلکی مسکراہٹ لئے چپ چاپ کمرے میں داخل ہوا۔ نیتی بیرنی سنگھار میز پر بیٹھی بال سنوار رہی تھی۔ اس نے اسے آئینے میں سے دیکھا تو قریب آنے کو کہا۔ بولی! "ذرا پیچھے سے چولی کا بند تو کھول دے۔"
بولی جھینپا۔ آگے تو بڑھا لیکن قدم بھر پیچھے ہی رہا۔ وہ ترش رو ہو کر بولی:
"رنڈی کے! دم گھٹ رہا ہے جلدی کھول!"
رنڈی کو آگے بڑھا اور اس نے بند کھول دیا۔
"کیسے آیا ہے رے بولی؟"
"امی، امی کی مشین ٹوٹ گئی ہے۔ سلائی کے لئے ڈھیر سارے کپڑے آئے ہیں۔ مشین ٹھیک کروانے کو پیسے نہیں۔"
"پھر میں کیا کروں کنجرا؟"
کنجر چپ رہا۔ نیتی بیرنی نے کنگھی رکھی اور ہاتھ مونہہ دھونے چلی گئی۔ کنجرا ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔
نیتی بیرنی نے ہاتھ مونہہ دھو کر بدن سجایا، چولی بدلی —— پھر اس نے ساڑھی پہنی۔ تیار ہو کر بولی: "چل پترا۔"
وہ رات گئے تک جمیلہ کے گھر میں رہی۔ لوٹی تو نصرو کمرے کے باہر ٹہل رہا تھا۔ مارے غصے کے بیکل تھا۔ وہ نصرو کو دیکھتے ہی مسکرائی۔ نصرو نے اس مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہیں دیا۔ پھر جب اس نے کنجی تھمائی تو نصرو نے خاموشی سے قفل کھول دیا۔ وہ تو کپڑے بدلنے لگی اور نصرو چپ چاپ بیٹھ گیا۔ اب تو اسے نصرو کی سنجیدگی کھٹکی۔ بولی: "تو چپ چپ کیوں ہے نصرو؟"

"گیارہ بجے ہیں میری گھڑی میں اتنی دیر کہاں رہی؟"

"ہونہہ، تو بھی بس وہی ہی نکلا۔ جمیلہ کے گھر گئی تھی۔ آپ بھی بیمار ہے۔ اس کی مشین بھی بیمار ہے۔ دونوں کو ٹھیک کروایا ہے میں نے۔"

"لیکن جمیلہ سے تیرا کیا واسطہ نیتی؟"

نیتی بیرنی برہم ہوئی اور قدرے جلال میں آکر بولی "اگر میرا واسطہ نہ ہو تو وہ چار دن میں مر جاتے۔ اس کنجر نے تو اُسے چھوڑ ہی دیا ہے۔ اب وہ بال بچوں کو کیسے پالے؟ میں خرچ نہ دوں تو اور کون خرچ دے؟ کون ہے اس کا اس دنیا میں؟"

اس کے جلال میں صداقت تھی، سچ کی آگ تھی۔ وہ پھر بولی "لوگ جانتے ہی نہیں۔ کنجری کنجری ہوتی ہے اور عورت بھی۔"

نصرو کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ جمیلہ کو مرنا نہ چاہیے۔ اسے بھی اس دنیا میں زندہ رہنے اور بال بچوں کو پالنے کا حق حاصل ہے اور یہ کارِ خیر نیتی بیرنی کے ذریعے ہو تو کیا مضائقہ ہے؟

رات سورگ میں گزری۔

کلی پھوٹی، صبح کھلی، زمین جگمگائی۔ ایک دنیا بیدار ہوئی لیکن تکیہ نیک سائیں کے بھنگی چرسی ہوش میں نہ آئے۔ دراصل انہیں رات بھر سونے جاگنے کا دورہ پڑتا رہتا۔ فجر کے وقت ذرا اٹھیں ہو جاتے۔ نیتی بیرنی بھی کمرے میں بے سُدھ پڑی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے بچھونے کے سلوٹ وہ ساری کروٹیں گنوا رہے تھے جو رات بھر بدن نے لیں۔ خاکدان میں سگریٹوں کے بجھے ہوئے ٹکڑے پڑے تھے۔ گلاس میں تھوڑی سی شراب رہ گئی تھی۔ چاندنی جوتی پلنگ تلے دھری تھی

اور جوتی والا باہر تکیے میں پڑے تلے ڈنڈ پیل رہا تھا۔ اس نے تیرے جھرنی والے کو بھگل کیا تھا اور پھر کیوں نہ بھگل کرتا؟ وہ تیرے جھرنی والے کی طرح عورتوں کی کمائی تو نہ کھاتا تھا۔ وہ تو عورت کا یار تھا۔

موتی شاہ کمرے میں داخل ہوا تو پہلے اس کی نظر نیلتی بیرنی کے بدن پر پڑی جو منی سکرٹ پہننے والیوں کو مات کر رہا تھا۔ پھر اس کی نظر شراب والے گلاس پر پڑی۔ اس نے دو گھونٹ میں گلاس کی شراب تمام کی پھر کمرے کے ماحول کا جائزہ لیا۔ چمکیلی بھڑکیلی چاندنی جوتی نیک سائیں کا منہ چڑا رہی تھی جو اس وقت یہاں نہ تھا لیکن موتی شاہ تو چاندنی جوتی سے بھی زیادہ تشویشناک خبر لایا تھا۔ اس نے نیلتی بیرنی کے شانے ہلائے اور کہا، "بی بی!"

بی بی نے "دفع ہو" کہا اور دوبارہ نیند میں کھو جانا چاہا لیکن موتی شاہ کے پاس اس کی نیند سے کہیں زیادہ توجہ طلب خبر تھی۔ اس نے پھر شانے جھنجھوڑا اور چلّا کر کہا "نیک سائیں پکڑا گیا ہے بی بی!"

موتی شاہ نے تو شانہ ہی جھنجھوڑا تھا۔ خبر نے اس کا دماغ جھنجھوڑ دیا۔ ہوش میں آئی تو موتی شاہ پھر بولا "نیک سائیں! نیک سائیں پکڑا گیا ہے۔"

"نیک سائیں پکڑا گیا ہے؟ کیسے، کہاں؟"

"اٹک کے پل پر ہی دھر لیا گیا۔ چرس اور افیون سے بوری بھری ہوئی تھی۔ وہ تو کانٹا تھا خرانٹ تھا۔ اتنا سیانا تھا۔ بوری پھینک دیتا دریا میں۔ رشوت دے دیتا، معافی مانگ لیتا۔"

"بی بی! قسمت اُلٹ جاتی ہے، بھاگ کھوٹا ہو جائے تو بڑے سے بڑا کانٹا

بڑے سے بڑا خرّانٹ، بڑے سے بڑا سیانا مونہہ کے بَل آ گرتا ہے۔"
نیتی پیرنی کے ہاتھ میں سگریٹ سلگتا رہا۔ انگلیاں جلنے لگیں تو اس نے سگرٹ پھینکا۔

"بی بی! وہ کہتا تھا اب کے اتنا مال ہاتھ لگے گا کہ تیرے لیئے کوٹھی بنوا دے گا۔"
بی بی اور بھی غمگین ہو گئی۔ کوٹھی کا نام سنتے ہی اُسے نیک سائیں کا غم لگ گیا۔
"کتنا اچھّا تھا وہ، کتنا خیال تھا اسے میرا!"
موتی شاہ نے یہ جملہ سُنا اور اپنی آنکھوں کے سامنے چاتنی ہوتی کو جُھکتے بھی دیکھا۔ اس نے زیرِ لب کہا" رنڈی" اور رنڈی تک یہ حرفِ شیریں نہ پہنچا
وہ دلدوز انداز میں بولی، "پھر اب کیا ہو گا؟"
"مقدمہ چلے گا۔"
"اس کے لئے تو پیسہ چاہیئے۔"
"ہاں، پیسہ چاہیئے، پیروی یونہی تو نہ ہو گی۔"
وہ سَر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑا بہت پیسہ اس کے پاس تھا لیکن مقدمے میں تو پیسہ پانی کی طرح بہانا پڑے گا۔ نیک سائیں ایسا وار دانیا روز روز تو پیدا نہیں ہوتا۔ لاکھوں میں ایک ہوتا ہے مائی کا لال۔ اس نے نیتی پیرنی کے سارے حق حقوق پورے کیئے اور اب گویا انہیں ادا کرنے کا وقت آ گیا تھا لیکن پیسہ چاہیئے تھا ـــ مقدمے کے لئے، اس کے لئے، جمیلہ اور جمیلہ کے بچّوں کے لئے، افسر و کے سکوٹر کے لئے اور پیسہ دینے والا اندر تھا۔ دو سہاروں میں سے ایک سہارا ٹوٹا تو وہ مضطرب ہوئی اس کا دل بجھ گیا بتّیس دانتوں میں سے

نکلنے والی ہر بات پوری کرنے والے کو وہ کیسے بھول جاتی ؟ اس نے تو عقل و ہنر کی بدولت تکیے کو اوّل درجے کا کاروباری مرکز بنا دیا اور اس کا نظم و نسق نہایت خوش اسلوبی سے چلایا۔ کس دھوم سے قوالی کی محفلیں جمتیں۔ کیسی با قاعدگی سے جوا ہوتا، بھنگ گھٹتی، چرس پی جاتی اور اندر خانے ہر قسم کی نشہ آور چیزیں پرچون اور تھوک کے بھاؤ بک جاتیں۔

دن بھر وہ مقدمے کا، اپنا، جمیلہ کا، جمیلہ کے بچوں کا، نصرو کے سکوٹر کا خیال کرتی رہی۔ اس نے سگرٹ پر سگرٹ پھونکے، کمرے میں دھواں بھر گیا۔ اسے ٹبّی کا خیال آیا لیکن اب وہاں کیا دھرا تھا ؟ وہاں تو دل ڈوب رہے تھے، امیدیں بھٹک رہی تھیں۔ ٹبّی اُجڑ رہی تھی۔ ٹبّی اب کسی کی آس پوری نہ کر سکتی تھی۔ نصرو آیا تو وہ ٹکٹکی باندھے چھت سے آویزاں فانوس دیکھ رہی تھی جس میں ننھے ننھے رنگ برنگی قمقمے گندھے تھے جلتے تو روشنی کے پھول کھل جاتے۔ کیسے کیسے پھول کھلائے تھے۔ پھول سائیں نے ! پھر جب ٹیوبیں جلتیں تو رات میں دن طلوع ہو جاتا۔

نیلتی پیرنی کو محویت کے عالم میں دیکھ کر نصرو دروازے پر ہی رُک گیا۔ اور جب دیر تک اس کی توجہ اپنی جانب نہ کھینچ سکا تو کھانسا۔ نیلتی پیرنی نے بے پروائی سے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر پہلے ہی نقطے پر نظریں لے آئی۔

"بیٹھ جا نصرو !"

اس آواز میں گرمجوشی کی بجائے دردمندی تھی، دھیماپن تھا۔ نصرو بیٹھ گیا اور بولا۔ "تجھے آج کیا ہو گیا ہے، بی بی !"

"نیک سائیں پکڑا گیا ہے۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔"

پھر" ہوں" کہہ کر چپ ہو گیا۔ دل میں خوش تھا کہ اب نیک سائیں کی جنت اسی کی ہو رہے گی لیکن آج جنت افسردہ تھی۔ اس نے دلجوئی کے لئے کہا" برا ہوا بی بی! پر تو غم نہ کر!"

"کوئی اپنے آپ بھی غم کرتا ہے؟ غم تو آپ ہی اندر سے پھوٹ پڑتا ہے۔"

"چل دریا کی سیر کر آئیں جی ہلکا ہو جائے گا۔"

"نہیں اڑیا! آج سیر کو جی نہیں چاہتا۔"

"جیسے تیری مرضی۔"

نصرو چپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ بولی" نصرو! تو تانگہ گھوڑا خرید لے!"

"کیوں سکوٹر نہیں لیتا؟

جس کے بھروسے پر سکوٹر لینا تھا وہ تو اندر ہو گیا۔ میرا تو خرچ ہی اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کے سوا، دوسرا پورا نہیں کر سکتا۔"

"تھوڑا بہت خرچ تو میں بھی چلا دوں گا لیکن گھوڑے تانگے کا قرض بھی تو اتارنا ہو گا۔"

"تجھ سے یہ خرچ پورا نہیں ہو سکتا، بی بی! تھری کیسل کے سگرٹ پیتی ہوں، کبھی دیسی نہیں پی۔ یہ خرچ تو وہ ہی پوری کرتا تھا۔"

"ہوں۔"

رات بھر تدبیریں سوچتی رہی۔ تکیے کا کاروبار بڑا مشکل تھا۔ پولیس کی زد سے بچنا، جواریوں سے نمٹنا، چرس کا اسٹاک چھپا کر رکھنا، اثر و رسوخ سے کام لینا آسان نہ تھا۔ لے دے کے موتی شاہ اور مولا ملنگ رہ گئے تھے۔ نیک سائیں کے جانشین لیکن تکیے کا انتظام سنبھالنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ وقت آن پڑا تھا اور اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔

نصرو نے گھوڑا تانگہ لے لیا۔ چاچا نے مشکی دے دی۔ مشکی بھی ایسی جیسے پری۔ پورے اڈے پر سب سے الگ نظر آتی اور دوڑنے میں بجلی تھی۔ ہنہناتی تو گردن تن جاتی اور لانبی لانبی ایال ہوا میں لہراتی۔ پھر تانگہ؟ وہ تو قوسِ قزح تھا۔ ساتوں رنگ اس پر اتار دیئے تھے کاریگر نے۔ نہایت نفاست پسند اور شوقین مزاج اس پر بیٹھتے۔ معمولی گاہک سے تو نصرو سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ جو بھی آتا سالم تانگہ کرتا۔

ایک دن مینہ پڑا اور آسمان پر قوسِ قزح نکھری۔ رنگوں کی موجیں اس میں آکر ٹھہر گئیں۔ ایک گوشے میں چاند نمودار ہو گیا تھا۔ بادلوں کے جزیرے جگہ جگہ ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ مینہ پڑا تو ہوا میں خنکی آگئی۔ نصرو کے عین سامنے قوسِ قزح کا پل کھڑا تھا۔ طبیعت مچلی، جی میں آئی چل کر بی بی کو لائے اور قوسِ قزح پر نکل آئے۔ پانچ سات روپے کم کمائے تو کیا ہوا؟ ابھی خیال کی گردش تھمی نہیں تھی اور وہ باگیں تھام کر مشکی کو اسٹارٹ کرنے ہی کو تھا کہ پیچھے سے ایک لڑکے کی آواز آئی "تانگہ!" یہ آواز نُوبی کی تھی۔ اور کسی کی آواز ہوتی تو وہ کان بھی نہ دھرتا۔ لیکن نُوبی کی آواز پر کیسے سنی ان سنی کرتا؟ اس نے ایڑ لگائی۔ دو اور تانگے آواز

کے کوندے پر لپکے۔ نصرو کی مشکی فرّاٹے بھر کر آئی اور اگلی ٹانگوں پر ناچنے لگی لیجبر اور بوبی کے تانگے بھی بلا کے خوبصورت تھے۔ ان کے گھوڑے بھی بڑے بانکے تھے لیکن نصرو کی مشکی کے چمکتے ہوئے ریشمی پٹھے کی شان ہی اور تھی۔ شاہی دروازے کے باہر والے دروازے پر جگمگاتے جھلملاتے ہوئے تین تانگے آکھڑے ہوئے جن کے جانور بڑے ہیکل تھے۔ سواری بڑے نخرے سے برآمد ہوئی۔ بوبی کے ہمراہ کبوتری رنگ کے نئے برقعے میں ایک عورت اندر باغ میں سے شاہی دروازے کی جانب آئی۔ چال میں پھرتی تھی۔ برقعہ او چمک رہا تھا۔ اور یہ تانگے ایسے ہی چمکتے دمکتے ہوئے برقعوں کے لئے مخصوص تھے۔ انگلیوں میں جڑاؤ انگوٹھیاں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ عورت نے نقاب اٹھائے بغیر بوبی کے کان میں کچھ کہا۔ بوبی اور عورت تانگے میں بیٹھ گئے۔ نصرو نے بوبی کو دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ جمیلہ کس بنت سے تانگے میں بیٹھی ہے۔ جانتا تھا کہ نیلتی پیرتی کے پاس اب اتنا روپیہ نہیں کہ جمیلہ اور جمیلہ کے بچوں کا خرچ بھی پورا کرے۔ اب تو یہ خرچ خود اسی کو پورا کرنا تھا۔

عورت نے دونوں نقاب گرا رکھے تھے لیکن ننگے پاؤں کی دہ بار بار نمائش کرتی۔ نصرو نے جمیلہ کو دیکھا تو نہ تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ نیک سائیں بڑا حسن پرست ہے۔ اس کا انتخاب ضرور دلآویز ہوگا۔

لانبی لانبی مرتعش انگلیوں نے اشارہ کیا اور نصرو نے مشکی کا رُخ اشارے پر پھیر دیا۔ ہوا میں سانٹا لہرایا، مشکی بجلی ہو گئی۔ بڑی سڑک پر نکل آیا تو مشکی رکتی تھمتی ہوئی دھنک کے متوازی دوڑ رہی تھی۔ ایک بار مرتعش انگلیوں نے

اشارہ کیا تو نفرو نے پیچھے کو ذرا گردن موڑی اور اس کی نظر پوری ننگے بازو پر پھسل گئی۔ اس کی مضبوط انگلیاں مچل گئیں اور وہ چکنے چمکیلے، ملائم گداز بازو کو دبانے کے لئے تڑپا۔ اسے اندازہ ہوا کہ معشوق بے نظیر ہے۔ جو ہو سو ہو، نیتی پیرتی سے بے وفائی ہوتی ہو تو ہو، وہ کون اس کی بیوی تھی اس سے کاہے کی وفا، کاہے کی بے وفائی، آج وہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دے گا۔ اس نے پھر چابک ہوا میں لہرایا مشکی اور بھی بھڑکی اور وہ آپ معشوقِ بے نظیر کے حسن کے خط و خال مرتب کر کے پھڑک اٹھا۔ رگ و پے میں حرارت دوڑ گئی اور لہو میں مستی کوندنے لگی۔ اس نے بالو کا نغمہ چھیڑا ؎

ہتھ جوڑا اے پکھیاں دا
نالے ساڈا ماہی لگدا
نالے چانن اکھیاں دا

بوبی لپک کر اگلی سیٹ پر جا بیٹھا اور گاہے گاہے دو انگلیاں ہونٹوں میں رکھ کر زور سے سیٹیاں بجانے لگا۔ مشکی بار بار بھڑکتی۔ نفرو بھی سیٹیاں بجانے لگا اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔ مشکی اب بڑے ہوٹل کی سمت جا رہی تھی اور نفرو کے چاچا نے کہہ رکھا تھا، بڑے ہوٹل کی سواریاں لینا۔ مونہہ مانگا کرایہ ملے گا اور قرض جھٹ پٹ اُترے گا۔ لیکن نفرو تو سود و زیاں کی منزل طے کر کے عقل و خرد سے دور جنون ہستی کے سراب میں آ گیا تھا جہاں آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔

پچھلی نشست پر عورت بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی اس کی زلفیں ہوا میں لہرا جاتیں جنہیں وہ مرصّع انگلیوں سے سمیٹ لیتی۔ اس پر ایک کار کی روشنی پڑی اور

اس نے نقاب اُلٹ لئے۔ کار کی رفتار سُست پڑ گئی۔ وہ مسکرائی۔ روشن کار اور روشن چہرے میں سمجھوتہ ہو گیا کار رُک گئی۔ مرصع انگلیوں نے اشارہ کیا، مشکی رُک گئی۔ انگلیوں نے بوبی کے چٹکی بھری۔ بوبی اور مرصع انگلیاں نیچے اتر گئیں نصرو نے جنون و مستی کے سراب سے پلٹنے کی کوشش کی لیکن اسے دیر ہو گئی۔ اور عورت کار میں جا بیٹھی۔ بے نقاب عورت نے کار والے کو دس کا نوٹ نکالنے کو کہا۔ سَو سَو کے نوٹوں میں پانچ پانچ کے دو نوٹ تھے عورت نے نوٹ لے کر بوبی کو دیئے اور نصرو کو تھما آنے کو کہا۔ اب نصرو جنون و مستی کے سراب سے پلٹ آیا تھا۔ عورت کا جانا پہچانا ہوا تاب دار چہرہ اس پر بجلی بن کر گرا۔ بوبی تانگے میں ایک نوٹ پھینک کر کار میں آ بیٹھا جو شعلہ وار گزر گئی۔ نصرو کا سارا غصّہ اس کے حلق میں سمٹ آیا اور اس نے پوری قوّت سے چلّا کر کہا "گشتی"۔

"اوراق" لاہور

رضیہ فصیح احمد

بڑماں

وہ بڑی اماں سے کب بڑماں بنیں کسی کو یاد نہیں۔ ان کی عمر کا بھی کسی کو اندازہ نہیں۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا وہ لاٹھوں لاٹھ تو نہیں مگر ہاں صحت کی اچھی تھیں اور پھر برسوں ان میں ذرا سی تبدیلی بھی نہیں آئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ جیسی ہیں سدا ایسی ہی رہیں گی۔ سالہا سال سے وہ کسی تاریخی عمارت کی طرح قائم و دائم تھیں جس کے نہ ہونے کا کبھی کوئی تصور بھی نہیں کرتا۔

آنکھوں دیکھی نہیں کانوں سنی ہے کہ جب اولاد نہ ہونے کے بہانے میاں نے دوسری شادی کی تو یہ ماتھے پر بل نہ لائیں۔ چھوٹی کی ساری اولاد کو یہ پیدائش کے بعد سمیٹ لیتیں جیسے قدرت نے یہ تقسیم کار کر رکھی ہو کہ وہ جنیں اور یہ پالیں۔ چھوٹی کے سارے بچے انہیں بڑماں کہتے اور یوں چمٹے رہتے۔ جیسے گڑ پر چیونٹیاں۔ ریڈیو پر فلمی گانوں کی فرمائش کی طرح اُن کی فرمائشوں

کا کوئی اختتام نہ تھا۔ ہاتھوں کا میل اتارنے کے انداز میں روٹیاں مل مل کر ملیدہ بناتیں اور خوب شکر گھی ڈال کر ان کو ٹھونساتیں۔ میدہ بھون کر اس میں آم اور چلینی ملا کر گڑ لھیا پکتا۔ بچے بھاگ بھاگ کر کام کرتے۔ اسی ہبڑ ربڑ میں چھوٹی کو خبر ہو جاتی وہ آن کر بڑبڑاتیں۔

"اے بڑی کیا ہو گیا ہے تمہیں، مہینے کا گھی دو دن میں ڈھا دو گی! اے وا، روز حلوے روز پراٹھے!"

بڑی تلملا کر کہتیں: "اے رہنے دو، تمہیں کبھی بچوں سے پیارا ہو گا موا، کون سے حلوے پکتے ہیں، ایک ذرا لپٹا بنا کر دے دیا تو قیامت آ گئی! جاؤ تمہارا یہاں کیا کام ہے۔ اپنے میاں کے کوٹھے سے لگ کر بیٹھو میں جانوں میرے بچے۔" یہ سب یوں ہوتا جیسے دونوں میں لاگ لپیٹ ہو رہی ہو۔ میاں آجاتے تو کہتے "ہاں ہاں بچے ہیں کھانے دو۔ بڑی ہمیں بھی چکھانا!"

"اے خاک، یہ موا حلوہ ہے؟ نہ خشک میوہ، نہ کیوڑہ نہ الائچی، یونہی بچوں کو بہلانے کو بنا دیا ہے تمہارے حلق سے کہاں اُترے گا۔"

میاں ہنستے، چھوٹی بڑبڑاتی چلی جاتیں، اور بڑی ماں فخر سے بچوں کو بلا بلا کر دیتیں۔

"لے جنو تو اور لے لے، اے ٹیکن تو بھی چکھ۔" بچوں کے درمیان سے الگ رہ کر چھوٹی کو کتنا سکون ملتا تھا اور چھوٹی سے بچوں کو چھین کر اپنا لینے میں بڑی کے جذبہ رقابت کو کتنی تسکین ملتی تھی یہ تو خدا جانیں یا اُن کا خدا مگر یہ ضرور ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ مطمئن تھیں۔ رات کو کبھی بڑی ماں اُٹھتیں اور میاں کے شبستان کا دروازہ بند دیکھتیں دل پر گھونسہ سا پڑتا مگر جلد ہی وہ جی بہلانے کو بچوں میں گم ہو جاتیں۔ کبھی کبھی میاں

جگنو بنے اُن کی اندھیری سی کوٹھری کو جگمگا نے بھی آتے مگر اب انھیں خود ہی سجنے سجانے کا شوق نہیں رہا تھا۔ دل کے نازک شیشے پر بال تو پڑ ہی چکا تھا" او ہنہ ہٹاؤ۔۔۔ یہ کیا بڑ بھس ہے۔ دائیں بائیں بچے سو رہے ہیں" وہ عذر پیش کرتیں۔

خدا ایک در بند کرتا ہے تو ستر در کھول دیتا ہے۔ بڑمّاں پر محبت کا ایک در بند ہوا تھا تو واقعی ستر در کھل گئے تھے جس کو دیکھو مارے محبت اور مروّت کے بچھا جا رہا ہے۔ خاندان میں کوئی شادی بڑمّاں کے انتظام کے بغیر نہیں ہوئی۔ کتنی ہی شادیاں بڑمّاں کی بیماریوں کی وجہ سے ٹل ٹل گئی تھیں "نہ بھیا بڑمّاں ہمارے خاندان کی بزرگ ہیں ان کی شرکت کے بغیر یہ شادی نہ ہوگی" وہ چلنے پھرنے لگیں تو تاریخ مقرر ہو گئی۔ شادیوں میں وہ کئی کئی دل ادا کرتیں۔ شادی کا حساب کتاب کھانے کا انتظام اور پل پل پر ضرورت پڑنے والی ہر چیز کا خیال "اے فلانے بلاوا جا رہے ہو تو دلہن کی نتھ کے لئے دو موٹی موتی اور ایک چُٹکی لیتے آنا" یہ چیزیں دولہا کے گھر کی ہوتی ہیں۔ موقع پڑا تو جا کر سمدھیانے سے بھی بھڑ لیتیں "اے تم دلّی والوں کے ہاں یہ رواج ہوگا، ہمارے یہاں یہ دستور نہیں" غرضیکہ بڑمّاں کیا تھیں اچھی خاصی امرت دھارا تھیں کہ سر میں درد ہو تو ماتھے پر تھوپ لو، پیٹ میں درد ہو تو پانی میں ڈال کر پی لو، اگر گھٹیاں ہوں تو چینی میں دو قطرے ڈال کر چٹا دو۔

دیور کے ہاں بھایا ہونے لگتا تو وہ دہلیز کی مٹی لے ڈالتے، بھابی کے بجائے وہ بھی بڑمّاں ہی کہتے "ارے چلو بڑمّاں تمہاری دلہن تمہیں بہت یاد کر رہی ہے" کچھ دن تو وہ ٹالتیں پھر آخر مارے مروّت کے اپنی پوٹلی میں اٹرم سٹرم باندھتیں۔ ادھر دو چار چھوٹی منجھلی لونڈیاں چھوٹی کی ناں ناں کر کے ان کے ساتھ ہو لیتیں۔

"اے جانے دو تم سے باقی ہی نہ سنبھلیں گے۔" وہ چھوٹی کے پھوہڑ پن کا علی الاعلان تذکرہ کرتیں۔ بات ٹھیک تھی۔ یہ تو وہاں جا کر نواز بیٹا کے پوتڑے کھولنے باندھنے اور اکٹھوارے سٹھوارے میں لگ جاتیں یہاں باقی بچے چھوٹی اماں کو ناک چنے چبوا دیتے۔ بچے جن جن کر کچھ ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ یہ جان لیوا کام اب ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گیا تھا مگر بڑی کے جانے کے بعد ان کی جانوں کو سمیٹنا اور ان کی ہٹوں کو پورا کرنا ان کے بس کا نہیں تھا۔ ان کو گئے دو چار دن ہوتے کہ یہ ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھتیں مشکل سے کچھ اور دن صبر کرتیں پھر ڈولی لے کر پہنچ جاتیں "اے ہے تم تو آ کر بیٹھ رہیں کچھ گھر کی بھی خبر ہے، بچوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔"

"لو اور سنو، ابھی بچی کو چھوڑ کر کیسے آ جاؤں۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن تو ہوئے ہیں مجھے آئے۔"

"میں کیا جانوں، منجھلے کو کالی کھانسی ہو گئی ہے۔ کھانس کھانس کر دم دیئے دے رہے ہیں۔"

"اے ہے یہ کیا ہوا، میں تو اچھا بھلا چھوڑ کے آئی تھی، شہتوت کے پتّے اور شہد چٹایا؟"

"سب کچھ کر لیا۔" چھوٹی یوں کہتیں جیسے اب دواؤں سے گزر کے دعا کی کسر رہ گئی ہو۔

"لو بوا سنبھالو اپنا بٹوہ میں چلی، جانے میرے بچّے کو کیا کر دیا۔" اب لاکھ کوئی روکے وہ نہ رکیں گی، گھر آ کر دم لیں گی اور منجھلے کی پٹّی سے پٹّی لگا کر رات رات

بکھر جائیں گی، بھوبل میں اَلا بَلا بھون کر اُسے دیں گی اور چھوٹی یوں الگ ہو جائیں گی جیسے کسی کو امانت لوٹا کر نچنت ہو گئی ہوں۔

بھائیوں کے گھر کوئی بیمار ہو، بچّہ ہونے والا ہو یا کسی بچّے کی روزہ کشائی ہو کوئی نہ کوئی بڑمّاں کو لینے آ پہنچتا۔ وہ تھوڑا بہت عذر کرتیں پھر اصرار کے آگے ہتھیار ڈال دیتیں۔ بھائیوں کی ضرورت پر اُن کا جانا بھی ضرور اور چھوٹی کا یہ کہنا بھی "اب جا کر بیٹھ نہ رہنا، جلدی آ جانا، تمہارے پیچھے یہ بچّے مجھے کھا جائیں گے، تمہارے لاڈ نے دو کوڑی کا کر دیا ہے انہیں۔" "ہاں ہاں میں نے تو سب کو بگاڑا ہے، چل تم اچھی ہو، کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتیں۔" اور یہ سچ تھا کہ کوئی بچّہ بیمار ہو، چوٹ لگ جائے یا جل جائے روتا جھینکتا سیدھا بڑمّاں کے پاس آتا۔ چھوٹی ہزار ہے مامتا کے درمیان میں کہتی رہ جائیں "اے ہے کیا ہوا، ادھر آ، میں دیکھوں" بچّہ پلٹ کے دیکھے بغیر سیدھا اس اندھیری کوٹھری میں پہنچتا جو بڑمّاں کا ٹھکانہ تھا۔

گرمیوں کی دوپہروں میں سارا زمانہ سو جاتا، نہ سوتیں تو بڑمّاں اور ان کے چیلے چانٹے۔ وہ بیٹھی چھوٹی چھوٹی کترنوں سے بٹوے سیتی رہتیں اور بچّے لڑتے رہتے "یہ میرا ہے"

"واہ تمہارا کہاں سے آیا، اُس دن بھی تم نے لے لیا تھا، یہ میرا ہے نا بڑمّاں؟" وہ بڑمّاں کو سپریم کورٹ میں بلاتا۔

"اے ہے بننے تو دو، پہلے ہی ہاتھ سے ڈال دی، لے یہ تو دھاگہ بٹا دھاگے بٹنے، بٹوے اور تلے دانیاں بنتیں اور بٹنیں۔ قرآن شریف کے تکوے، غلاف، گوٹے

لپکے لگ کر تیار ہوتے۔ اس سے دل اُکتاتا یا بچے فرمائش کر بیٹھتے تو جلتی دوپہریا میں چولہے کے پاس جا بیٹھتیں اور ہنڈکلیاں شروع ہو جاتیں۔

ایک دیور جانے کہاں کالے کوسوں رہتے تھے، بیوی کے بچہ ہونے لگا تو انھوں نے بڑماں کو بلا بھیجا۔ چھوٹا سا قصبہ جہاں کوس بھر پر کوئی بڑھی کھنڈی دائی رہتی تھی، اسی کا سہارا تھا۔ ہونی شدنی عین وقت پر برابر کے گاؤں میں میت ہو گئی، وہ پرسے میں چلی گئی۔ ایسے وقت خدا نے بڑماں کو ہمت دی کہ انھوں نے باورچی خانے کی گٹھل چھری سے نال کاٹا، گرم پانی کر کے بچے کو نہلایا اور جیسے تیسے زچہ کو سنبھال لیا۔ دائی اپنا حق چھنے جانے پر دل ہی دل میں غصے کے پیچ و تاب کھاتی رہی۔ انھی کے ہاتھوں ایک اور بچی نے ریلوے ٹرین میں جنم لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بچے خدا کی دین ہوا کرتے تھے۔ ہر سال نہیں تو دوسرے سال ہر گھر میں ایک نئی روح کا آنا گویا فرض تھا، اسی لئے ہر گھر میں بڑماں کا پھیرا لگتا ہی رہتا۔ سیکڑوں بچے دائی اور نرس کے ہاتھ سے سیدھے بڑماں کے ہاتھوں میں آتے تھے۔ ان کے ہاتھ سے گھٹی پینے والے بچوں کی گنتی ہی نہ تھی اور تو اور خاندان کی دو ایک بوڑھی عورتوں کو قبر میں پہنچانے سے پہلے غسل دینے کا کام بھی کر چکی تھیں۔ غرض کوئی ایسا کام نہ تھا جسے کوئی عورت کر سکے اور بڑماں نہ کر سکیں۔ احسان ماننے والے جس طرح دامے درمے بن پڑتا ان کا احسان اتارنے کی کوشش بھی کرتے۔ جاتے وقت کسی نے نیا ریشمی جوڑا بنا دیا۔ کسی نے نئی رضائی دے دی۔ اس طرح ان کا پرانا ٹرنک ریشمی کپڑوں سے پُر رہتا۔ پہنتی تو کم ہی تھیں۔ موج میں آتیں تو بھانجی بھتیجیوں کو بانٹ دیتیں۔

ایسے ہی کسی کام سے گھر سے کوسوں دور تھیں کہ میاں کی بیماری کا تار پہنچا۔ ہوائی جہاز ان دنوں تھے مگر صرف آسمان پر اڑتے نظر آتے تھے۔ ان میں سفر کرتے کسی کو نہ سنا تھا۔ لے دے کے ریل گاڑیاں تھیں جو کھڑ بڑ کرتی دن رات چلتیں تو دنوں میں لمبے سفر بھی طے ہو ہی جاتے۔ بڑماں گھر پہنچیں تو میاں کو زمین کے نیچے سوئے بھی دیر ہو چکی تھی۔ باہر ٹوپی اوڑھے مرد سیپارے پڑھنے میں مصروف تھے، اندر دوپٹوں سے سر ڈھانکے عورتیں ہل ہل کر قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ خود تو عرصے سے بیواؤں کی طرح رہتی تھیں مگر سوکن کا سفید دوپٹہ اور سر کنڈے سے ہاتھ دیکھ دیکھ کر دل پر گھونسہ سا پڑا اور وہیں دہلیز پر گر پڑیں۔ پھر جب ہوش میں آئیں تو سارا گھر پہلے کی طرح سنبھال لیا۔ چھوٹی سے وہ پہلے بھی نہیں جلتی تھیں۔ اب تو وہ قابلِ رحم تھی۔ اس کے پاس ایک میاں تھا وہ بھی نہ رہا۔ ان کے بچے ماشاء اللہ سب حیات تھے، پھل پھول رہے تھے۔ جس طرح مالی اپنی پھولتی پھلتی کیاری کو دیکھ کر خوش ہوا کرتا ہے اسی طرح بڑماں اپنے پوتوں اور نواسوں کی فوج کو دیکھ کر نہال ہوتیں۔ بچے بھی سب بڑماں کو برابر یاد رکھتے۔ آخر ان کے گھروں میں بھی تو بیماریاں، تقریبیں اور بچے ہوتے تھے۔

بڑماں پر دوسرا بڑا صدمہ چھوٹی کی موت تھی جس نے ان کی کمر توڑ دی۔ ایک دو نہیں تیس پینتیس سال کا ساتھ تھا، پھر اس نے خدمت بھی تو نہیں کروائی اس کا کبھی انہیں غم تھا بس بیٹھے بٹھائے چل کھڑی ہوئی جیسے میاں کے پاس جانے کو ادھار کھائے بیٹھی ہو۔ بڑماں کو یوں لگا جیسے کوئی برسوں سے تھامی ہوئی لاٹھی ہاتھ سے چھین کر بھاگ گیا ہو۔ اچانک دنیا کیسی خالی خالی لگنے لگی۔ اس زندگی

میں کیا خاک رکھا ہے۔ جس میں میاں اور چھوٹی نہ ہو۔ رہے ان کے بچّے تو اصل میں یہ تھے تو اسی بیل کے بیج جو اچانک سوکھ گئی تھی۔ چھوٹی کسی گھناؤنی سی بیماری میں مبتلا ہوتیں، بیماری طول کھینچتی۔ کچھ دل پر میل آتا تو اور بات ہوتی مگر ان کے یوں چل دینے میں تو سوائے احساسِ محرومی کے کچھ نہ تھا۔ بڑمّاں اس چھت کی طرح بیٹھ گئیں جس کے نیچے سے اچانک ستون کھینچ لیا گیا ہو۔ اس بڑی سی حویلی میں جہاں کبھی بند دروازے دل پر دھوکے دیتے تھے گھومنے پھرنے کا کچھ مزا نہ رہا۔ آج بھائیں بھائیں کرتے کھلے دروازے کھانے کو آتے تھے۔ جلاپے بنانے میں کوئی سواد نہ تھا۔ جب گھی پر کوئی ٹوکنے والا نہ ہو۔ بچّوں کے ساتھ چاؤ چونچلوں میں بھی تو جب ہی لُطف تھا کہ چھوٹی مقابلے پر تھی اب تو وہ ہارے کے اس مرغ کی طرح تھیں جس کے سارے مقابل کھپ گئے ہوں ایسی جیت اور شاہی کس کام کی۔

پھر وہ دَور آیا جو اب تک بہت سے دلوں میں ناسور بن کر پل رہا ہے جس نے تخت والوں کو تحت الثّریٰ میں پہنچایا اور بوریا نشینوں کو بادشاہی دی۔ ۴۷ء میں سارا کنبہ ریزہ ریزہ ہو کے چھنٹ چھانٹ بے گھر بے در اس سرزمین میں پہنچا جسے پاکستان کہتے ہیں اور پورے ملک میں جس کو جہاں سر چھپانے کی جگہ ملی بیٹھ گیا۔ اس افراتفری میں کیا کھویا کیا پایا حساب کتاب کرنے کی بھی کسی کو فرصت نہ تھی۔ نفسا نفسی کا ایک دَور تھا، آیا اور چلا گیا مگر وہ بات پھر پیدا نہ ہو سکی، اکھڑے دل پھر نہ جمے، جمنے کی کوشش میں لوگوں نے چاہا اپنی جڑیں مضبوط کر لیں کھونا ہی ہے تو کیوں نہ ذرا گہرائی تک کھودیں۔ سب اسی کھودنے اور جمنے کی ادھیڑ بُن میں پڑ گئے اور کسی نے نہیں دیکھا کہ بڑمّاں اس بوڑھے درخت کی طرح جس کی ایک آدھ ہی جڑ

جسم پائی ہو، آہستہ آہستہ سوکھ رہی ہیں۔ اس حادثہ' دارو گیر میں ان کا پرانا پلنگ
ٹرنک تو صحیح سلامت پہنچ گیا تھا مگر وہ خود آدھی ہی آ پائی تھیں۔ ان کے دماغ
پر کچھ اثر ہو گیا تھا جس کا احساس ایک دم نہیں دھیرے دھیرے ہوا۔ کام کرنے
کی وہ بے پناہ دھن اب نہیں رہی تھی۔ کسی نے کہہ دیا تو کر لیا۔ ورنہ بس ٹہلے جائیں
جیسے پاؤں میں پہیے لگ گئے ہوں یا کسی نے چابی دے کر چھوڑ دیا ہو۔ "بڑی ماں اب
بس کرو تھک جاؤ گی۔ لو بیٹھ کر یہ سبزی بنا دو۔" وہ سبزی بنا دیتیں اور پھر ٹہلنا شروع
کر دیتیں۔ چلتے چلتے خود ہی بڑبڑاتی رہتیں۔ کوئی غور سے سنتا تو بڑبڑاہٹ کا
موضوع کوئی ایسی بات ہوتی جو انھیں بری لگی ہو چاہے وہ آج ہوئی ہو، یا
مہینوں برسوں پہلے۔

"بڑی ماں کس سے باتیں کر رہی ہو؟" کوئی پوچھتا تو وہ چڑ جاتیں۔

"اے واہ کس سے باتیں کر رہی ہوں؟ خواہ مخواہ مجھے تنگ مت کیا کرو۔"
اور ٹہلے جاتیں۔ اسی وجہ سے انھیں بھوک بہت لگتی۔ ہر وقت یا وہ چپ رہتیں یا ٹہلتی رہتیں۔
اب وہ اتنا کام بھی نہیں کرتی تھیں کہ گھر کے بچوں سے بڑھ کر انھیں کھلایا جائے۔

"اے ہے بڑی ماں تم نے تو بچوں کو بھی مات کیا ہے۔ ہم نے تو تم سے بھی
پہلے ناشتہ کیا ہے۔"

"بھوک لگی ہے۔" وہ لجاجت سے کہتیں۔ پھر جو بچی کچھی روٹی، باسی سالن
اور پڑا پڑایا دودھ نظر آتا پی ڈالتیں۔ کھا پی کر وہ پھر ٹہلنا اور بڑبڑانا شروع کر دیتیں۔
یہ ٹہل قدمی اتنی بڑھی کہ کمرہ اور دالان کا چکر لگا لگا کر انھوں نے گھر
والوں کو گھن چکر بنا دیا۔ ہر وقت کی بھوک نے گھر والوں کو کھا لیا اور بڑبڑاہٹ کا

یہ عالم ہوا کہ وہ چلتی ہوا سے لڑنے لگیں۔ چڑیا بولتی تو جھنجھلاتیں "اے واہ جا اپنا کام کر، کیوں دماغ چاٹ رہی ہے مار چوں چوں چوں چوں، اور کوئی کام نہیں ہے تجھے۔" مرغی کٹ کٹ کرتی تو چلّاتیں "ہاں ہاں بیگم صاحبہ سُن لیا انڈا دیا ہے تم نے، بس اب زیادہ مت اِتراؤ، سارے زمانے کی مرغیاں انڈے دیتی ہیں ایک تم ہی نرالی نہیں ہو۔" بچے سن لیتے تو تماشہ بنا لیتے، وہ اور جھنجھلاتیں، بچوں کو ستاتیں تو وہ اور چھیڑتے۔ غرض گھر میں یہ ہنگامہ چڑچڑی عورتوں کو بدمزہ کر دیتا وہ بچوں کو مار دینے کی دھمکی کے ساتھ بڑی ماں کو بھی باتیں سُنائیں کہ خواہ مخواہ بچوں میں بچی بن رہی ہیں۔ فوراً شریر بچوں کی طرح انہیں کسی کام میں پھنسا دیا جاتا جیسے وہ اُلٹا سیدھا کر کے پھر محاذ پر آن پہنچتیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اپنی جن دلی خواہشات کو وہ ایک زمانے میں کام کر کر کے بھولی تھیں اب انھوں نے دوسری آسان راہیں ڈھونڈ لی تھیں۔ کام میں اب ان کا دل نہ لگتا تھا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی رتیاں تڑا رہی ہوں۔ آٹا جیسے وہ کسی زمانے میں بڑے پیار سے سہج سہج گھنٹوں مکیاں مار کر گوندھا کرتی تھیں اب منٹوں میں گھول کر رکھ آتیں۔ روٹیاں پکاتیں تو کبھی جلی کبھی کچی، ہانڈی بھونتیں تو چراند رہ جاتی۔ برتن دھوتیں تو مارے چکنے کے چپکتے کہ ایک ایک برتن دوبارہ دھونا پڑتا۔ گھر کی عورتیں بہتیرا جتنا جتنا اور سُنا سُنا کر کہتیں مگر ایک کان سے سُن کر دوسرے سے صفا اُڑا دیتیں۔

اب لوگوں کا معیارِ زندگی بھی اونچا ہو رہا تھا۔ چھوٹے سے گھر میں چاہے گھر والوں کے بیٹھنے کی جگہ نہ ہو مگر مہمانوں کے لئے سجتے سے صوفے ضرور ہوں۔ رات کو بچے ایک پلنگ پر چار چار سوتیں مگر نیلام گھر سے خریدی گئی کھانے

کی میز اور کرسیوں کو جگہ ضرور ملے ۔ بچے بھی اب گھروں کی بجائے اسپتال میں پیدا
ہونے لگے تھے ۔ شادیوں میں اب ایسے " ایٹ ہوم " ہونے لگے تھے جس میں بڑی
اماؤں کی ضرورت ذرا کم ہی پڑتی ہے ۔ ایک تو چیز کی مانگ پہلے ہی کم ہو اور پھر
اس کی کوالٹی بھی خراب ہو جائے تو اس کو کون دھارے گا ۔ بڑی ماں بھی بقول
ایک انگریزی داں پوتے کے اب " نیوسنس " ہو گئی تھیں ۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانوں
میں تو قطعی ان کا ٹھکانہ نہ تھا ہاں پرانے دھرانے گھروں میں ٹوٹی چارپائی کی طرح
کونے میں پڑی رہتیں مگر چند دن گزرتے تو کسی نہ کسی بہانے سے ان کی بلٹی
دوسرے گھر روانہ کر دی جاتی ۔ جہاں گھر میں کوئی بیمار ہوا یا مہمان آئے تو سب
سے پہلا کام یہ ہوتا کہ بڑی ماں کو رکشہ میں بٹھا کر کسی دوسرے نواسے یا پوتے کے
ہاں چلتا کیا جاتا وہاں دو ایک دن ان کی آؤ بھگت ہوتی پھر ردی اخبار کی طرح
ادھر ادھر رلتی پھرتیں ۔ ان کی بھوک اور بڑبڑاہٹیں جب زیادہ پریشان کرتیں
تو کوئی بہانہ ڈھونڈ کر انھیں تیسرے گھر بھیج دیا جاتا ۔ گھر کی لڑکیاں کسی نہ کسی
طرح ان کے ٹرنک سے کپڑے اڑانے کی فکر میں رہتیں ۔ ان کی قسمت سے تنگ
پجامے کی فیشن لوٹ رہی تھی اور پرانے زمانے کی سی ساٹن اور مٹھی میں بند ہو جانے
والے دوپٹے اب کہاں ملتے تھے ۔ محبت کی بھوکی بڑی ماں سے جب لڑکیاں گھس
لگاتیں تو وہ خوش ہو کر فوراً جوڑے کے جوڑے ان کی نذر کر دیتیں ۔

اب بڑی ماں پر جو کچھ خرچ ہوتا اس کا حساب ذہنوں میں محفوظ رکھا جاتا
تاکہ موقع ملتے ہی دوسرے رشتہ داروں کو سنایا جا سکے ۔ ایک وہ بڑی ماں تھیں
جن کو ہر گھر میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا ۔ اب ٹانگ برابر کی چھوکریاں کہتی تھیں ۔

کام کی نہ کاج کی سیر بھر اناج کی۔" جب دیکھو باورچی خانے میں کچھ نہ کچھ ٹٹول رہی
ہیں۔ بچے بچے کو پتہ تھا کہ یہ ہماری سگی نانی دادی نہیں ہیں، بے اولادی ہیں
بے چاری، ہم نہ رکھیں گے تو اور کون رکھے گا۔

"اے ہے یہ رات کا قیمہ ہے چُھپا دے نہیں تو وہ نگل لیں گی۔" ان کے
بارے میں ایسی باتیں اب عام ہو گئی تھیں۔ بھوک کی شدّت اور تسکین کی کمی
نے جنون کو ایک اور راہ سُجھائی۔ ٹہلتی ٹہلتی آتیں اور ناک ہوا میں دے کر کہتیں،
"اے ہے سیب کی خوشبو آرہی ہے، ہے نا، کہاں ہیں منّی ارے ایک ٹکڑا ہمیں
بھی دے نا۔" منّی جیسے خود سیب سونگھے برسوں ہو گئے تھے جل کر کہتی "سیب
نہ کچھ اور، پاگل ہو گئی ہو بڑی ماں تم تو۔" مگر وہ اس وقت تک سیب سیب کی رٹ
لگائے رکھتیں جب تک انھیں دوسرے کمرے میں امرود یا کیلے کی خوشبو نہ آجاتی۔
کسی نئے گھر میں جاکر جب انھیں یہ خوشبو آتی تو گھر کا کوئی شریف بچّہ یا نفسیات
کا ادھ کچرا طالب علم انہیں یہ چیزیں لا دیتا کہ شاید اسی طرح ان کا دل بھر جائے
مگر ان باتوں کا الٹا اثر ہوتا، پھر تو ان کی ناک راہ ہی دیکھ لیتی۔ کبھی قورمے
کی خوشبو چلی آرہی ہے، کبھی متنجن، کبھی بریانی۔ اتنا حوصلہ کوئی کہاں سے لاتا۔ دوسرے
ہی دن سے تو تو میں میں شروع ہو جاتی۔ خالی پیٹ کب تک ان مرغن کھانوں کا
ذکر اور خوشبو برداشت کرتے۔ کام دام اب وہ نہیں کرتی تھیں۔ اوّل اس
لیے کہ ان کو سجھائی کم دیتا تھا، دوسرے، لوگوں کے کہنے کے مطابق بادلوں
میں جان ڈال لی تھی ذرا سی دیر میں دال کا دلیہ کر دیتیں۔ کچھ دن بعد ان کے
جنون نے ایک اور رنگ پکڑا۔ انھیں یہ خیال ہو گیا کہ لوگ انھیں چھوڑ کر بھاگ

جائیں گے۔ سارا دن گھبرا گھبرا کر کہتیں "ارے کہاں جا رہے ہو، مجھے بھی ساتھ لے چلیو"

ہر نئی بات کچھ دن تو مذاق رہتی پھر جی کا جلاپا بن جاتی۔ اچھا بھلا ایک آدمی گھر میں بیٹھا ہے دوسرا اس کے سر ہو رہا ہے کہ بول تو کہاں جا رہا ہے، تو وہ آپ ہی مرکھنا بیل بن جائے گا۔ جوں جوں ان کی آنکھیں کمزور ہو رہی تھیں، توں توں یہ وہم بڑھتا جا رہا تھا۔ ذرا گھر میں خاموشی ہوئی اور وہ بڑبڑائیں "ارے کہاں چلے گئے سب، مجھے چھوڑ گئے، ہائے میں اکیلی رہ گئی، کیا کروں، کہاں چلے گئے سب؟"

"مر گئے" جل کر کوئی کہتا تو وہ کھل اٹھتیں "ہو! ارے میں سمجھی سب چلے گئے۔؟"

یہ مرض بڑھا تو وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر میاں بیویوں کے پلنگ ٹٹولنے لگیں۔ سوتے میں چونک کر کوئی چلا اٹھتا "کون؟" تو وہ بڑی ہی معصومیت سے کہتیں۔ "سو رہے ہو؟ میں سمجھی چلے گئے"

ایک دفعہ کسی شخص کو جھک جھک کر چلتے دیکھ کر کوئی بچہ ڈر کر چیخ اٹھا۔ سارے گھر میں چور چور کا شور مچ گیا۔ محلے والے جاگ اٹھے اور آخر میں نکلا کون، بڑی ماں۔ یہ باتیں برداشت سے باہر ہوئی جا رہی تھیں۔ ہر آئے گئے کو سنائی جاتیں تاکہ ان کے سہارے موقع پاتے ہی انہیں کسی اور گھر روانہ کیا جائے۔ کہاں تو وہ سالوں رہتی تھیں تو لوگ "اور رہئے" کا مطالبہ کرتے تھے اور اب مہینے میں چار گھر گھوم لیتیں۔ ریشمی کپڑے بٹ بٹا گئے تھے اور ان کی جگہ ملے ہوئے کپڑے چیتھڑا ہوتا

کر ختم ہو چکے تھے۔ بستر بھی بوسیدہ اور خراب تھا مگر اب ان کو کھلانا ہی دوبھر تھا کہ اس مہنگائی کے زمانے میں ان کے لئے جوڑے اور گھوڑے بھی ہوتے۔

گھر میں تقریب ہوتی تو بڑماں کو چھپا دیا جاتا یا دوسرے گھر بھیج دیا جاتا، ہاں نہیں تو بڑبڑاتی پھریں گی سارے گھر میں، اصل ڈر اس بات کا تھا کہ کسی نے دیکھ کر پوچھ لیا کہ کون ہیں تو کچھ کہتے بن نہ پڑے گی اپنا گھٹنا کھولو آپ ہی لاجوں مرو۔ اب ان کی حالت اس قابل نہ رہی تھی کہ انھیں کسی کے سامنے فخریہ پیش کیا جا سکے اور جان بوجھ کر سبکی کرانے کا فائدہ! فیشن ایبل گھرانے ہاتھ جوڑتے کہ ہمارے ہاں باہر کے لوگوں کا آنا جانا ہے، انہیں یہاں نہ بھیجو البتہ کھانے پینے کا خرچ دینے کو تیار ہیں۔ یہ بھی زبانی جمع خرچ تھا کون مانگتا تھا اور کون دیتا تھا۔ جس گھر میں پڑ جائیں آپ ہی روٹی دے دیتا کھانے کا خرچ لینے کی بدنامی کون سہتا۔

دن گزرتے رہے۔ گھر والوں کو پتہ بھی نہ چلتا۔ باہر والا کوئی بہت دن بعد دیکھتا تو کہتا بڑماں بہت کمزور ہو گئی ہو۔ ہڈیوں سے ماس لگ گیا ہے۔ گھر والے بتاتے کہ کوئی خاص بیماری نہیں ہے بس بڑھاپا ہو گیا ہے اس لئے پیٹ سدا خراب رہتا ہے یا پیٹ میں کیڑوں کا بسیرا ہے کہ ہر وقت کھانے کو رہتی ہیں۔ آنکھیں بھی اس رفتار سے روشنی کھو رہی تھیں کہ پاس رہنے والوں کو کچھ اندازہ نہیں تھا، یا پھر ان کی حرکتوں نے اس قابل ہی نہ رکھا تھا کہ کوئی ان کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتا اور گھر کے ہزاروں جھگڑے تھے کہ گھر میں پڑی ہوئی بڑی بی کے پیچھے لوگ خوار ہوتے پھرتے۔ اچھے بھلے آدمی کام کرتے

کرتے تھک جاتے تھے۔ ایک صبح کے گھر سے نکلے ہوئے کہیں اندھیرے میں
گھر لوٹنا نصیب ہوتا۔ کراچی کی زندگی تھی کہ سانس لینے کا موقع نہ دیتی تھی۔ مکان
دکانیں، سڑکیں ہر چیز ٹھسا ٹھس تھی۔ جگہ اور وقت کی کمی کی بات کوئی کراچی
والوں سے پوچھے، گھر کے سیکڑوں ضروری کام برسوں ٹلتے رہتے۔ کوئی بیمار ہوتا
تو یہ سوچ کر جان نکلتی کہ کون گھنٹوں جا کر دوا کے لئے قطار میں کھڑا ہو۔ عطاروں
اور نیم حکیموں کی چاندی ہو رہی تھی۔ بیماری کے اسپیشلسٹوں تک رسائی بادشاہوں
کے درباروں کی رسائی ہو گئی تھی۔ ایسے میں کون انھیں ہسپتال لے جانے
کی مہم کا ذمہ لیتا اور لیتا بھی تو کس سے یہ ہفت خواں سر ہوتا۔

دن یوں ہی گزر جاتے اگر بات اور نہ بڑھتی، مگر کون چیز دنیا میں ہے
جو ایک حالت میں ہے جسے تغیر نہیں۔ ہر آدمی، ہر شے بہتر یا بدتر صورت میں
بدلتی رہتی ہے۔ بڑماں کی حالت کی بہتری کی کیا امید تھی بس دن بدن بگڑ ہی
رہی تھی۔ جب تک وہ خود جھیل لیتی تھیں۔ ان کی باتوں کو رو دھو کر برداشت
کر لیا جاتا تھا مگر جب نوبت یہاں تک پہنچی کہ غسل خانے لے جانا ہو تو ہاتھ پکڑ
کر لے جاؤ تو بڑی مشکل پیش آتی۔ وہ چلاتی رہتیں اور "ابھی ذرا تو صبر کرو تم
تو بچوں سے بھی گئی گزری ہو گئیں" وغیرہ آوازیں ان کے کانوں میں پڑتی رہتیں۔
اگر وہ صبر کرتی رہتیں تو اس صبر کی کوئی میعاد نہ تھی۔ چنانچہ وہ ٹٹول کر اترتیں اور
جس جگہ کو غسل خانہ سمجھ لیتیں وہیں بیٹھ جاتیں۔ بعد میں بڑی ہائے ہوتی۔ کراچی
کی بھنگنیں ہر وقت ہاتھ نہیں آتیں اور اب تو جب سے گھروں میں فلش عام
ہو گئے تھے انھیں گندے کام کرتے ہوئے اُلٹیاں آنے لگی تھیں۔ ایسی حالت

میں جب گھر والوں کو ان کی بے جا حرکتیں سمیٹنا پڑتیں تو ان پر کوسنے کاٹے نہیں
تو کیا پھول برستے۔ اب وہ یا تو ان باتوں سے بالا ہو چکی تھیں یا سُن کر انجان
بننے میں مہارت ہو گئی تھی کہ ذرہ بھر پروا نہ کرتیں بس تکیے سے سر لگائے گردن
آگے جھکائے، آنکھیں بند کیے، ہونٹ بچّوں کی طرح بسورے خود ہی کہ جانے
کون سے عالم میں کھوئی رہتیں۔ دن رات ان کے لیے برابر ہو چکے تھے جس وقت
اس بیہوشی سے چونکتیں سب سے پہلے کھانا مانگتیں چاہے اس وقت رات کے
دو بجے ہوں یا صبح کے چار۔ لوگوں نے اب نوٹس لینا چھوڑ دیا تھا کھانا اس
وقت دیا جاتا جب کھانے کا وقت ہوتا بس ان کی موجودگی کا احساس اس
وقت ہوتا جب وہ ایسی ویسی حرکت کر بیٹھتیں۔ ان حرکتوں میں اضافہ ہوا تو انہیں
گھر کے باہر ایک ایسے کمرے میں ڈال دیا گیا جہاں وہ جو جی چاہے اور جہاں
جی چاہے کرتی رہیں۔ دوسری صبح بھنگن ناک پہ کپڑا باندھ کر کمرہ دھو جاتی۔ اس
دُھلائی اور خراب ہو جانے والے کپڑوں کے پیسے وہ الگ لیتی۔ بڑماں کے کمرے
میں سے مرغیوں کے دڑبے ایسی کھرانڈ آتی ان کو کھانا دینے والا بھی سانس
روک کر بمشکل چند منٹ وہاں ٹھہرتا۔

وقت کسی کے لیے رُکتا تو نہیں۔ دن اور راتیں ریس کے گھوڑوں کی طرح
بھاگے جاتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے لڑکیوں کے چہرے پر حیا اور لڑکوں کے گالوں
پر بال پھوٹ آتے ہیں۔ شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگتی ہیں، پھر اُن کے بچے
بڑے ہو جاتے ہیں اور وہ بھی اسی تیزی سے بڑھنے لگتے ہیں۔ بڑماں کے پوتے
بھی آل اولاد والے ہو گئے تھے ایک پڑپوتے اور ایک پڑنواسی کی شادی ٹھہر گئی

تھی۔ جیسا کہ آج کل کا دستور ہے۔ بڑی محنت سے بڑے گھرانے ڈھونڈے گئے
تھے۔ شادی کی تیاریاں بڑے زوروں پر تھیں۔ بڑے گھرانوں سے ٹکر لینے نے
سارے گھر کا پلیتھن نکال دیا تھا۔ پھر بھی بات بنتی نظر نہ آتی تھی۔ ایسے ہی ایک
دن جب گھر میں لیا جیب جوڑتے ٹانکے جا رہے تھے، بڑی اماں چپکے سے چل بسیں،
صبح کو کوئی ناشتہ لے کر گیا تو دیکھا ختم ہو چکی ہیں۔ ان میں تھا ہی کیا ایک سانس
چل رہا تھا وہ کسی وقت خاموشی سے یوں بند ہو گیا جیسے کسی نے سوئچ آف
کر دیا ہو۔ فوراً انھیں اٹھا کر گھر میں لایا گیا ہر طرف سناٹا سا دوڑ گیا۔ کسی طرف
سے آہ و بکا کی آواز بلند نہیں ہوئی لڑکیوں نے چپکے چپکے دو چار آنسو بہائے بڑی اماں
کی موت پر نہیں بلکہ ان کے ساتھ اپنی زیادتیاں یا ناانصافیاں یاد کر کے۔ خاندان
والوں کو اطلاع دی گئی۔ بڑی اماں کا خاندان بڑے درخت کی طرح پھیل کر کہیں کا
کہیں جا پہنچا تھا۔ لوگ آتے جاتے تھے، چپ چاپ بیٹھتے جاتے تھے اور سب
سارے آخری کام بڑے سکون سے ہوئے اور وہ ایسی خاموشی سے وداع کر دی
گئیں جیسے کسی بیوہ عورت کی رخصتی ہو۔ اس کے بعد کا مرحلہ زیادہ دشوار کن تھا۔
ایک شادی میں چار اور دوسری میں پانچ دن تھے۔ دنیا والے کیا کہیں گے کہ ابھی
ماں بڑی بی کا جسم بھی ٹھنڈا نہ ہوا کہ بیٹے پوتے رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ لاکھ کچھ
ہو دین سے دنیا رکھنی بھاری ہے۔ شادی کی تاریخیں ٹالنی پڑیں گی۔ مگر شادی کی
تاریخیں بدلنا بھی مشکل تھا۔ کہاں کہاں سے لوگ آئے بیٹھے تھے، ایک بیٹا انگلینڈ
جانے کو پا بہ رکاب بیٹھا تھا۔ لڑکی کا دولہا چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ پھر جانے کب چھٹی
ملے اور لڑکیوں کی شادی میں آج کل دیر دار ذرا مناسب نہیں: کب دام ہیں

آیا ہوا پنچھی پھڑپھڑا کر نکل جائے۔ ہاں نہیں تو جن گھروں میں شادیاں تھیں وہ ہرگز انھیں ٹالنا نہیں چاہتے تھے صرف کنبہ برادری کا ڈر تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کیا جائے۔ روز صبح سے شام تک بحث ہوتی مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچا جاتا۔ وقت اتنا کم تھا کہ مزید بحث کی گنجائش بھی نہ رہی 'تاریخ بڑھانی ہے تو فوراً بڑھا دو کہ آنے والوں کو بروقت اطلاع تو دی جا سکے مگر بڑمّاں کے ایک سمجھدار بیٹے نے آخر اس مشکل کا حل ڈھونڈ لیا۔ "دیکھو یہ موقع اچھا ہے، شادی کرو مگر دھوم دھڑکا نہ کرو، کھانے کے بجائے معمولی سی چائے ہو جائے۔ مہمان بھی کم بلائے جائیں کہ بس شرعی رسم کر رہے ہیں۔ بہانہ ہمارے پاس ہے ہی کہ ہمارے ہاں ایک بزرگ خاتون کا انتقال ہوا ہے ہم دھوم دھام سے نہیں کر سکتے۔۔۔۔ یاد رکھو یہ موقع پھر کبھی نہ آئے گا۔"

چنانچہ یہی ہوا۔ بڑمّاں مرتے مرتے بھی ایک کام کر گئیں۔ جن تقریبوں میں ہزاروں خرچ کرنے کے بعد بھی اُلاہنے کا دھڑکا تھا انہیں سیکڑوں پر نمٹا گئیں اور کسی طرف سے کوئی اعتراض نہ ہوا۔ سچ ہے نیک آدمیوں کی موت بھی نیک ہوتی ہے۔

"سیپ" کراچی

پروین سرور

سراب

ایور گرین کلب کے وسیع لان میں کلچرل شو ہو رہا تھا۔

میں نے ہزار بار بڑی منت سے رفعت کو سمجھایا کہ میں گھر داری میں اتنی الجھ چکی ہوں کہ اس قسم کے ہنگامے اب میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے مگر وہ نہ مانے۔ کہنے لگے: "تمہارے لئے ہی تو میں ٹکٹ خرید کر لایا ہوں ورنہ مجھے پچاس روپئے خرچنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"پچاس روپئے!" میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ چائے کا نیا سیٹ ہاتھوں سے پھسلتے پھسلتے بچا۔ "ارے ارے" رفعت نے لپک کر پیالی سنبھالی "تم تو ذرا ذرا سی بات پر گھبرا جاتی ہو۔"

"آپ کو پچاس روپئے ناحق برباد کرنے کی کیا مصیبت تھی؟"

"بھئی ــــ وہ ــــ" رفعت قدرے نادم ہو کر بولے "اپنے سمیع صاحب ہیں نا ــــ انھوں نے ہی شو کروایا ہے۔ اُن کا بے حد اصرار تھا کہ میں تمہیں بھی لیکر آؤں۔"

"اُن کا کیا ہے۔ چندہ جمع کرنے کو تو وہ ساری دنیا کو اکٹھا کر لیں گے۔ اُن کی بلا سے بعد میں کوئی ناقوں مرتا رہے۔" میں ایک دم جھگڑنے کے موڈ میں آ گئی: "کوئی تُک بھی ہو بھلا! ایک نہ دو، اکٹھے پورے پچاس روپے —— کوئی خدا کا خوف بھی ہونا چاہیے۔"

لیکن رفعت نے گویا کہ منہ پھیر جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے شکست خوردہ سی آواز میں بولے: "نینا کا ڈانس پروگرام ہے۔"

ڈانس؟ اور وہ بھی نینا کا! میں نے سنک میں گرم پانی انڈیل کر جلدی جلدی برتن باہر نکالنے شروع کیے اور پونچھنے بیٹھ گئی۔ بار بار یہی خیال آتا رہا کہ گرہستی میں دھنس کر میرے جیسی عورتیں وقت سے کتنی پہلے بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ نہ کہیں آنے کا خیال، نہ جانے کا۔ بس پیٹ کاٹتے اور خواہشات کا گلا گھونٹتے ہی گزر سے چلی جاتی ہے، مگر زندگی تو نینا جیسی لڑکیوں کی ہوتی ہے جو کبھی بوڑھی نہیں ہوتیں۔

جیسا ایور گرین کلب ویسی ہی ایور گرین نینا!

چمکتی آنکھیں، دہکتے گال، لہراتے بال اور ٹھمکتی ہوئی چال۔ سکول کے دنوں میں بھی وہ ایسے ہی جھلملاتی تھی جیسے شبنم میں نہا کر آئی ہو۔

ہم دونوں ایک ساتھ بچپن کی منزلیں طے کر کے بڑی ہوئی تھیں۔ اُس نے تعلیم مکمل بھی نہیں کی تھی کہ اپنے پیا کے ساتھ سوئٹزرلینڈ چلی گئی تھی۔ سمیع صاحب بڑے مصروف کاروباری آدمی تھے۔ آدھی دنیا میں اُن کے دفتر کی شاخیں پھیلی تھیں۔ بنگلے پر تین تین کاریں کھڑی رہتیں۔ باوردی ڈرائیور ایک اشارے کے منتظر ہوتے۔ اندر ڈرائنگ روم میں ریکارڈ پلیئر پر ہر وقت مدھم سُروں میں انگریزی

دھنیں بجتی رہتیں۔ قیمتی قالینوں پر سفید روسی کتے لڑھکتے۔ نینا کی ممی شوخ رنگ کی ساڑھی پہنے بڑے اہتمام سے کافی بنایا کرتیں۔ اُن کے گلے میں پڑے ہوئے نت نئے ڈیزائن کے ڈائمنڈ کٹ نیکلس آنکھوں کی روشنی لوٹ لیا کرتے۔ ذرا سی چمک ہوتی تو یوں لگتا جیسے تارہ ٹوٹا۔

اکلوتی اولاد تو نگینہ ہوتی ہے جسے تراش خراش سے ہیرا بنا لیا جاتا ہے۔ نینا کی تربیت سمیع صاحب نے بڑے دھیان سے کی تھی۔ اُس کے لیے ایک چھوڑ چار چار اُستاد ہفتے میں مختلف اوقات میں آتے تھے۔ ایک پیلے ڈانس کے لئے۔ ایک توڑے سکھانے کے لئے، ستار کے اُستاد جی اور تھے، راگ راگنیوں کے اور۔ پڑھنا لکھنا اُس کے لئے بہت ضروری نہیں تھا۔ بس وہ تو کاتی پھرتی رہتی تھی۔ چال میں اٹکھیلیاں خود بخود آگئی تھیں۔ جی بھر کر فلمیں دیکھتی۔ کلاس میں خالی وقت ہوتا تو کہانیاں سُنا سُنا کر سب کو للچایا کرتی۔ ہر سال یورپ کا چکر لگا کر واپس آتی تو داستانوں سے بھری ہوتی۔ سکول سے واپسی پر جب کبھی وہ مجھے اپنی بڑی سی کار میں چھوڑنے آتی تو میں تمام راستے احساسِ کمتری کے مارے مرتی آتی۔

رفعت سے بیاہ کر کے میں اور بھی گہرے غار میں جا گری۔ گھر کے کاموں کی ایک طویل فہرست اُلجھے دھاگوں کی طرح میرے سامنے رکھی رہتی۔ بارہا میرے دل میں یہ خواہش ابھرتی کہ کاش! رفعت بھی نینا کے بیا کی طرح کاروباری سیٹھ ہوتے۔ بنگلوں اور کاروں کے مالک تو خیر ہوتے ہی۔ مگر اُن کی طرح آدھی درجن کلبوں کے ممبر ضرور ہوتے۔ میری منی کے لئے پڑھی لکھی آیا ہوتی۔ میرے پاس وقت بے وقت کہیں آنے جانے کے لئے ایک بڑی سی کار ہوتی جسے میں خود ڈرائیو

کرتی۔ باورچی خانے میں دیسی انگریزی کھانا پکانے کے لئے خانساماں موجود رہتا — اردلی ہوتا۔ بیرا ہوتا۔

لیکن — مجھے تو بیک وقت خانساماں بھی بننا پڑتا اور آیا بھی۔ اردلی بن کر رفعت کے کپڑوں پر برش کرنا بھی میرے ذمے، اور استری کرنی، جوتے پالش کر کے ایک قطار میں رکھنے، بستر بچھانے اور راتوں کو منی کے ساتھ جاگ کر بیٹھنا، کہیں آنے جانے کے لئے ٹیکسی یا رکشا کا کرایہ بچا کر بس کے لئے گھنٹوں سڑک پر کھڑے ہو کر انتظار کرنا اور جب بس نہ ملتی تو مایوس ہو کر ڈبڈبائی نظروں سے سر جھکائے میلوں پیدل بھی چلنا۔

کاش میں نینا ہوتی تو اپنے پپا کے ساتھ مزے سے کبھی امریکہ جاتی، کبھی یورپ گھومتی، کبھی سوئیٹزرلینڈ کی حسین وادیوں میں سنہرے خواب دیکھتی۔

رفعت نے بڑی فراخ دلی سے پچاس روپے خرچ کر ڈالے تھے۔ بار بار میرے دل میں اُبال اُٹھتا کہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالوں۔ ابھی مہینے بھر کے ڈھیروں اخراجات کا پہاڑ میرے سامنے کھڑا تھا۔ منی کے لئے دودھ کے ڈبے منگوانے تھے، بجلی کا بل ادا کرنا تھا، خود رفعت کے کپڑوں کی سلائی کا بل چکانا تھا۔ جتنی تیزی سے منہگائی بڑھ رہی ہے اس سے دُگنی رفتار سے درزی کی سلائی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ رفعت کے سبھی پرانے سوٹ چھلنی ہو چکے تھے۔ اس لئے مجبوری میں نئے سوٹ سلوانے ضروری تھے۔ آخر اپنا بھرم بھی تو رکھنا ہوتا ہے۔

البتہ میرے جہیز کی لائی ہوئی سبھی ساڑھیاں ایک ایک کر کے میرے

ساتھ ہی بدرنگ ہو چکی تھیں"۔ شاذیہ" رفعت کی آواز سنائی دی: "جلدی تیار ہو جاؤ"
"آ رہی ہوں، رفعت،" میں نے مردہ آواز میں کہا اور ایک ایک کر کے سبھی پرانی ساڑھیاں الماری میں سے کھینچ کر پلنگ پر ڈھیر کر دیں۔ سب کی سب بےجان لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔

میں نے جلدی جلدی منہ دھو کر ایک آسمانی ساڑھی لپیٹ لی جس کا پیوند چُنٹوں میں چھپا لیا۔ پھر آئینے میں جھک کر خود کو ڈھونڈا تو دھک سی رہ گئی۔ میں کہاں کھو گئی تھی؟

میرے چہرے پر بن بلائے مہمانوں جیسا ہلکی لکیروں کا ناگوار جال پھیل رہا تھا۔ رنگت پرانے فرنیچر کی طرح سردی گرمی کی زیادتیاں سہہ کر اُڑ چکی تھی۔ بالوں کی سیاہی پر دھوئیں کا غبار آ چلا تھا۔ چہرے کے تیکھے نقوش پھیکے پڑ چکے تھے۔

"میں نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی۔ مجھے وہاں نہیں جانا چاہیے۔" میرے اندر سے پکار اُٹھنے لگی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر چلانا چاہا تو رفعت نے بے اختیار گھسیٹ لیا: "جلدی چلو۔"

"میں کیسی لگ رہی ہوں، رفعت؟"

"بس ٹھیک ہے۔"

ان کے لہجے میں ایسی جھلک تھی جیسے کہہ رہے ہوں کہ اب تمہارے اچھے لگنے کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے؟"

ہم دونوں گھر سے باہر نکلے تو رفعت نے پڑوس میں جا کر گھر کی کنجیاں خالہ بی کے حوالے کرتے ہوئے منی کو ایک بنڈل کی صورت لپیٹ کر اُن کے سپرد کر دیا۔

دلوں میں چور لیے ہم چپ چاپ پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ ٹکٹوں پر پہلے ہی بہت
روپے ضائع ہو چکے تھے اور شو شروع ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔

راستہ طے کر کے جب ہم ایور گرین کلب کے ہرے ہرے لان میں پہنچے تو
سارے شہر کی رونق وہاں سمٹ آئی تھی۔ ہر طرف ہنستے مسکراتے چہرے تھے کوئی
غمگین نہ تھا۔ میری طرح کسی کی پیشانی پر کم مائیگی کے احساس کی شکن نہ تھی۔
بل کھاتی لڑکیاں تھیں، لمبے بالوں والے بے فکر جوان تھے، نیچی پیٹی ادھیڑ عمر
عورتیں تھیں، اور بے ہنگم، بے ڈول زندہ دل مردہ۔ احساسِ کمتری کا ایک
جانا پہچانا خول میرے گرد اونچا اُٹھتا گیا، جبھی تو میں نے اُس نرم گرم ماحول
کے ایک کونے میں چھپ کر چپ چاپ ساری شام گزار دی۔

پہلے چائے ہوئی۔ پھر جب ذرا جھٹ پٹا ہوا اور شام گہری ہو چلی تو دل
بہلانے والے بڑے فخر سے اپنے ہاتھوں میں بیگ سنبھالے نظر آنے لگے۔

نینا کی ممی بالکل نینا لگ رہی تھیں بلکہ اُس سے بھی دس برس چھوٹی۔ اونچا
سا ہیئر سٹائل بنائے، باریک سنہرانی ساڑھی میں تنا ہوا شاداب تبسم، ننگی کمر،
کھلے گلاب جیسی ڈھلی ڈھلی رنگت۔ گلے میں ڈائمنڈ کٹ نیکلس۔ کبھی ایک میز
پر کبھی دوسری پر، کبھی تیسری پر، کسی تتلی کی طرح چٹکیوں میں ساڑھی سنبھالے ادھر
سے اُدھر منڈلا رہی تھیں۔

نینا کے پپا سدا کے بل ڈاگ تھے۔ یورپ اور امریکہ کی مسلسل سیاحتوں
نے تو انھیں اور بھی باہر والا بنا دیا تھا۔ ڈھیلے پائنچوں کی پتلون، سوٹ کا کوٹ
اُتارے قمیص پر صرف واسکٹ پہنے، آستینیں ذرا سی اوپر کو چڑھائے، بے حد

قیمتی ٹائی اور ٹائی پن لگائے، پھیلے ہونٹوں میں پائپ دبائے، ادھ بنی سٹیج کے گرد غراتے پھر رہے تھے۔ کام کرنے والے اُن کے بھاری بوٹوں کی دھمکوں سے چونک کر جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگتے۔ بڑا رعب تھا اُن کا۔

میں اپنی کرسی پر بیٹھی ٹکٹکی باندھے نینا کی ممی اور پپا کو بڑے رشک سے دیکھتی رہی۔ درختوں کے جھنڈ میں دیکھتے ہی دیکھتے لکڑی کی سٹیج تیار ہو چکی تھی۔ سٹیج کے دامن میں ذرا گہری خندق کھود کر پام کے پودوں کی صورت سلسلہ وار بجلی کے قمقمے لگائے گئے تھے۔ بھاری سیاہ پردے گرے تھے۔ ذرا ہل جاتے تو جھری میں سے فرش پر بچھے ہوئے نرم روئیں دار قالین کے گرد نینا کے ڈرائنگ روم کی آرائش کا سارا سامان نظر آنے لگتا۔ بڑے بڑے سنگ تراشی کے مجسمے، چمکتے ہوئے گلدان، رنگین نظاروں کی تصویریں، پس منظر کے لیے حسین وادیوں کے کھنچے ہوئے پردے، غیر ملکی گڑیاں . . . .

تقریباً سبھی سامان نینا کی ممی باہر کے ملکوں سے لائی تھیں۔

جب پردہ ذرا زیادہ سرک جاتا تو اندر کی طرف سے دو نامعلوم ہاتھ اُس کی رسّی کھینچ کر دُرست کر دیتے۔ پھر سیاہ پردہ ایک عجیب سی سیاہ آہنی دیوار بن جاتی۔ جس پر دائیں بائیں دو نارنجی رنگ کے پھنکارتے ہوئے اژدہوں کی تصویر بنی تھی جو ایک معصوم سی بھولی بھالی ناچنے والی کو گھیرے میں لیے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

اس تصویر پر نظر پڑتی تو سارے بدن میں کپکپی سی دوڑنے لگتی۔ معلوم نہیں میرے روئیں روئیں میں ایک اَن جانا خوف کیوں بس گیا تھا؟

پھر اچانک ہلکا ہلکا سا ساز بجنا شروع ہو گیا۔ تمام بتیاں ایک ایک کر کے جل

اُٹھیں — لوگ اپنی اپنی جگہ بے تابی سے پردہ اُٹھنے کے منتظر ہو کر بیٹھ گئے۔

پل بھر میں نینا چھم چھم کرتی، جادو جگاتی سٹیج پر آ گئی۔

وہ چمکتی آنکھوں اور دمکتے گالوں والی دس برس پہلے کی نینا تھی۔ ماتھے پہ کم کم لگائے گورے تلووں میں گلال اور ہتھیلیوں کی پشت پر حنائی جال سجائے، پیروں میں گھونگروؤں کی چوڑی پٹی باندھے! وہ ایک دلربا انداز میں مسکرائی جھک کر سلام کیا۔ پھر اس نے بل کھا کر فرش پر ایک پاؤں مارا۔ طبلے پہ تھاپ پڑی اور اُس نے باہیں پھیلا لیں۔

لچکے گوٹے کی بس ایک بجلی سی تھی جو رہ رہ کر کوندنے لگی۔ وہ اپنی باہوں میں سب کچھ سمیٹتی چلی گئی۔

تھا تھئی تھک تھک۔۔۔ ہاتھوں کے کنول بن رہے تھے، ہونٹوں کی کلیاں چٹک رہی تھیں، پلکوں کے اُدھچے تیر برس رہے تھے، کلائیوں کے گجرے دھک رہے تھے اور کولہوں پر سے ڈھلک کر پھسلتی ہوئی گھنے بالوں میں گوندھی چوٹی کی ناگن لہرا رہی تھی۔

نرت تھا، تال تھا، نال کے بھنور تھے، اُونچی نیچی گت کے ہلکورے تھے۔ ایک جادو سا جاگ اُٹھا تھا۔

ایک نہیں دو تین رقص ہوئے۔ نینا سارے شہر کو لوٹ کر لے گئی

پھر جب شو ختم ہوا تو وہ اچانک میرے پیچھے سے آکر میرے گلے میں جھول گئی:

"شادی!" اُس نے مجھے بھینچ کر کہا۔ "تم تو پہچانی بھی نہیں جاتیں۔" اُس نے میرے کھردرے ہاتھ بے اختیار اپنے نرم نرم ہاتھوں میں دبا لئے۔

میں نے گھبرا کر اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔

اُس نے میرے اُڑے اُڑے بال کنپٹیوں کے پیچھے سنوار کر کہا! "کتنی بدل گئی ہو۔"

"ہاں، نیلما۔" میں نے بے دلی سے کہا؛ "دن ہی کچھ ایسے آ گئے ہیں۔"

"بیمار ہو گیا؟"

"نہیں نہیں،" میں نے جھٹ بات بدلنے کو کہا؛ "تم سناؤ، کیا ہو رہا ہے؟"

"ہونا کیا ہے" وہ ایک ادا سے منہ پھلا کر بولی۔ "بس، بور ہوتی ہوں سارا دن۔"

"کہیں باہر جانے کا پروگرام نہیں ہے کیا؟"

"ہے تو سہی۔"

"کب تک؟"

"شادی کے بعد" وہ اترا کر شرمائی۔

"آہا" میں نے ہنس کر کہا، "کون ہے وہ خوش قسمت؟"

"دکھاؤں؟"

"ہاں — ہاں۔"

اُس نے چونک کر سٹیج پر کھڑے ہوئے سازندوں اور طبلچیوں کو ہدایات دیتے ہوئے ایور گرین کلب کے گھونگریالے بالوں والے مینجر کی طرف اشارہ کیا؛ "وہ۔ احمد ہیں۔"

"مگر، نیلما" میں نے تعجب سے کہا، "تمہاری منگنی تو پہلے . . ."

"ارے چھوڑو، شادی" اُس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا۔ "وہ بھی کوئی

منگنی تھی!"

"لیکن واجد کی پہنائی ہوئی انگوٹھی تو تم بڑے ارمانوں سے پہنے پھرتی تھیں۔"

"انگوٹھی کا کیا ہے" اُس نے کمال بے نیازی سے منہ چڑایا۔ "جب چاہو پہن لو۔" پھر وہ بڑے رومانٹک انداز میں اُنگلی میں پڑی ہوئی ایک نئی انگوٹھی گھماتے ہوئے بولی: "وہ تو ایک جذباتی دور تھا، ختم ہو گیا۔"

"تم اسے جذباتی دور کہتی ہو؟ حیرت ہے۔"

"ہاں، شاذی، دیکھو نا،" اُس نے میرے دونوں شانے اپنے ہاتھوں میں تھام کر بڑے وثوق سے سمجھایا، "تعلیم کا ابتدائی زمانہ ہوتا ہی ایسا نادانی کا ہے کہ پہلی مرتبہ جو بھی لڑکا سامنے آتا ہے بس آنکھیں بند کر کے جھٹ سے اُس کے متعلق فیصلہ کر لیا جاتا ہے مگر پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسا موقع بھی آتا ہے کہ۔ ۔ ۔ ۔"

"تم خوش ہو؟"

"بے — حد —" اُس نے بڑے سرور میں آنکھیں بند کر کے مجھے بھینچ کر گلے لگا لیا۔ اُس کے روئیں روئیں میں ناچنے والیوں کی دھمک رچی تھی۔

"احمد کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ کلب کا کام تو بس پارٹ ٹائم ہی ہے۔ ایڈورڈ روڈ پر بہت بڑا ذاتی بنگلہ ہے۔ دو کاریں ہیں۔ ایک کوٹھی کراچی میں ہے، ایک کاٹیج سمندر کے کنارے ہے، ایک ایبٹ آباد میں گھر ہے۔ ایک مری میں، ایک . . ."

وہ بنگلوں اور کاروں کے ساتھ ساتھ چاہتوں کا دفتر کھول رہی تھی

اور میرے اشک کا جام لبریز ہوتا چلا جا رہا تھا۔

کاش اگر میں نینا نہ ہوتی تو اُس کی بہن ہی ہوتی۔ یہ تتلی جیسی ممّی میری بھی ماں ہوتیں اور یہ بُل ڈاگ جیسے غرّاتے ہوئے چوڑے کلّے کے پپا میرے بھی پپا ہوتے۔

پھر —— میں بھی ایک سجے سجائے بنگلے میں رہتی۔ میرے اردگرد نوکروں اور دلیوں کا ہجوم ہوتا۔ مجھے ہل کر کوئی کام نہ کرنا پڑتا۔ بس نرم نرم صوفے میں دھنس کر خواب دیکھا کرتی؛ اور پھر جب میں جاگتی تو میرا ایک قدم ایک کار میں ہوتا، اور دوسرا قدم —— دوسری کار میں۔ میں بھی سال میں دو مرتبہ دنیا کے گرد چکّر لگا کر آتی۔

مجھے اپنی کھردری ہتھیلیوں، اپنی میلی ملگجی ساڑھی، اپنے گھِسے ہوئے سینڈلوں، خود اپنے آپ پر ترس آنے لگا۔

پھر نینا کی شادی بڑی دھوم سے ہو گئی۔ اُس نے مجھے بھی بڑے اصرار سے بلایا مگر میں نہیں گئی۔ کس صورت سے جاتی ؟

مہینوں اُس کی شادی کے چرچے ہوتے رہے، مدتوں اُس کی خوبصورت تصویریں اخباروں کی زینت بنی رہیں۔ ایک رنگین مووی بھی تیار کی گئی تھی۔ ہزاروں ہی شاٹ لئے گئے تھے۔ ہر پوز میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ شادی کے بعد وہ ہنی مون منانے کے لئے ہانگ کانگ چلی گئی۔

اُس کا تصور میرے ذہن میں خوشبو کی طرح بسا تھا۔ دن بھر کے کام کاج کے بعد جب میں تھک کر سونے کے لئے لیٹتی تو نینا ایک پھول کی طرح مجھ پر

آن گرتی۔ میں بار بار سوچتی کہ شادی ہر زندگی کا ایک نازک موڑ ہوتا ہے مگر مینا کے لئے یہ موڑ تو لاکھوں خوشیوں کا پیغام لے کر آیا ہے۔ یقیناً ہانگ کانگ سے آگے وہ جاپان چلی گئی ہوگی۔ آڑو اور خوبانیوں کے شگوفوں سے گھرا ہوا اُس کا لکڑی کا خوبصورت بنگلہ ہوگا۔ اُس کی صبح حسین ہوگی، دوپہر اُس سے بڑھ کر شگفتہ ہوگی اور شام رنگین....

وہاں روشنی ہوگی، خوشیاں ہوں گی اور قہقہے....

میں انہی خیالوں میں ڈوب کر سو جاتی اور صبح کو جب سو کر اُٹھتی تو میرا تکیہ بھیگا ہوتا اور آنکھیں بوجھل۔ نت نئے کاموں اور اخراجات کی طویل فہرست میرا انتظار کر رہی ہوتی: دودھ کا بل، اخبار کا بل، بجلی کا بل، دھوبی کی دھلائی، ننھے کی دواؤں کا بل، منی کے نئے جوتوں کی فکر، باورچی خانے کا کام، گھر کی صفائی، کپڑے دھونا، مرمت کرنا، راشن لانا....

میں عہد کر لیتی کہ اپنی منی کا بیاہ سوچ سمجھ کر کسی اونچے سے گھر میں کروں گی جہاں روپے کی ریل پیل میں یہ سب اخراجات بڑے معمولی نظر آئیں۔ دولت کی گرمی سے تو ہزاروں جھمیلے موم کی طرح پگھلائے جا سکتے ہیں۔

تین چار برس اس کشمکش میں گزر گئے۔

اب تو ننھا بھی ہوشیار ہو چلا تھا۔ میں نے سوچا بیک وقت دو بچوں کو سنبھالنا ناممکن ہے۔ اب منی کو اسکول میں داخل کروا ہی دینا چاہئے۔ کوئی کہاں تک مرتا بھرتا رہے۔ رفعت سے بات کی تو وہ یوں گھبرا گئے جیسے میں نے منی کے بیاہ کی بات چھیڑ دی۔ اُن کے ماتھے پر پھوٹتے ہوئے پسینے کے قطرے صاف

کہہ رہے تھے کہ اتنی تھوڑی تنخواہ میں منی کی فیس کیسے نکل سکے گی؟

"مگر، تعلیم تو بہت ضروری ہے، رفعت!"

ہم دونوں نے بڑی بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر وہ ایک لمبا سانس کھینچ کر کہنے لگے "بہت ضروری ہے۔ واقعی بہت ضروری ہے۔ آج کل کے زمانے میں تو جب تک لڑکیاں لڑکوں کی طرح پڑھ لکھ کر روزی کمانے کے قابل نہ ہو جائیں حالات سے نپٹنا ناممکن ہے۔"

بات ادھوری چھوڑ کر میں نے فیصلہ کیا کہ منی کو کسی بڑے سے سکول میں نہ سہی کسی سستے سے پرائیویٹ سکول میں ہی لے جاؤں گی۔ آج کل قدم قدم پر تو سکول کھلے ہیں۔

منی سکول کا نام سن کر خوشی سے تالیاں بجانے لگی۔ میں نے دوسرے دن صبح ہی اٹھ کر اُس کا منہ دھلایا۔ نیا فراک پہنایا اور بالوں میں سُرخ ربن باندھ دیا۔ وہ بار بار میرا منہ چومتی تھی، پیاری پیاری باتیں کرتی تھی، جھک جھک کر میری طرف دلار سے دیکھتی تھی۔

اپنے گھر کی بڑی سڑک پار کر کے جب میں اُسے ایک چھوٹی سی کوٹھی میں کھلے ہوئے پرائیویٹ کنڈرگارٹن سکول میں پہنچی تو لان میں پی۔ ٹی ہو رہی تھی۔ بار بار سیٹی بجتی تھی ننھی ننھی بچیوں کے پرے سفید یونیفارم پہنے ایک دائرے میں جمع تھے۔ کبھی ہاتھ پکڑ پکڑ کر گھومتے تھے، کبھی بیٹھتے تھے، جھکتے تھے اور اٹھتے تھے۔ مس نینا گراؤنڈ میں کلیلیں بھر رہی تھی۔ وہی چھریرا بدن، نرت کا سا انداز، بڑی بڑی آنکھوں میں اتنی چمک اتنی دمک جیسے کسی کا شدید انتظار ہو۔

مجھے دیکھ کر وہ دُور ہی سے بھاگی آئی: "نشا۔۔۔ذی!" اس نے بے تحاشا بازیں پھیلائیں۔" اوہ، بلبنا، تم؟" میں اُس سے لپٹ گئی۔" یہاں کیسے؟"

"دیکھ لو۔"

"شادی کے بعد بدلی نہیں ذرا بھی۔ کہاں ہوتی ہو؟"

"ممّی کے پاس۔"

"اور۔۔۔احمد؟"

"چھوڑ دیا!"

"چھوڑ دیا؟"

"ہاں اور کیا۔" وہ اس طرح بولی جیسے بڑی معمولی سی بات ہو۔

"کیوں؟"

"لڑائی جو ہو گئی۔"

"تو صلح کر لی ہوتی۔"

"توبہ!" اُس نے جھک کر منی کو پیار کیا۔ پھر بولی: "میرا ابھی ایک بیٹا ہے۔ بابو! یہیں کہیں ہو گا۔" اُس نے تلاش میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔" پپا کیسے ہیں؟" میں ابھی تک اُدھیڑ بن میں لگی تھی۔ کسی طرح تشفی نہ ہو رہی تھی۔" وہ تو مر بھی گئے۔" بلبنا لمحہ بھر کے لئے افسردہ سی ہو گئی۔" میں نے طلاق لی تو اُن کا ہارٹ فیل ہو گیا۔"

"مگر۔" میں ابھی شکایت کے لئے الفاظ ہی تول رہی تھی کہ وہ جھٹ میرے لہجے کو پہچان کر بولی: "ہاں، نشا ذی، ہم نے بڑی خاموشی سے اُن کا

کفن دفن کردیا۔ اب کہاں سارے شہر کو اکٹھا کرتے۔

"مگر، نینا، احمد تو۔۔۔"

"فراڈ تھا وہ تو، پکا فراڈ!"

"فراڈ؟"

"ہاں، اور کیا۔ نہ بنگلے، نہ کاریں، نہ کاروبار، نہ بینک بیلنس۔ شادی کے بعد سیدھا گاؤں لے گیا مجھے۔ وہاں اُس کی بوڑھی بیمار ماں تھی اور گنوار سی بہنیں۔ توبہ!"

میرے ذہن میں ٹمٹماتی ہوئی تمام روشنیاں ایک ایک کر کے گل ہونے لگیں۔

"ہانگ کانگ جانے کا تو محض پراپیگنڈا تھا۔ وہاں کوئی سٹینڈرڈ بھی ہوتا گاؤں میں؟ دفع کرو غم کس بات کا ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی: "اب تو شادی بھی ہو رہی ہے۔"

"کس کی؟" میں چونک کر بولی۔ "تمہاری یا احمد؟"

"چہ۔ احمد کی تو ہو بھی چکی۔ اپنے ہی جیسی لے بھی آیا۔"

"تو تمہاری ہو رہی ہے؟"

"ہاں، نشانی، اور کس کی۔"

میں دھک سی رہ گئی۔

"جواہرات کا بیوپار ہے۔" وہ مجھے یقین دلانے کو آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ کیا لندن، کیا امریکہ، کیا جاپان، کیا افریقہ۔۔۔"

"میرے پاس کوئی ٹریننگ نہیں ہے اس لئے ہاں کچھ نہ کر سکی۔ یہ نوکری تو میں نے وقت گزارنے کے لئے کر لی ہے۔ شادی ہوتے ہی ہم افریقہ چلے جائیں گے۔ وہاں بہت بڑا بزنس ہے۔ ممی بھی یہی کہتی تھیں کہ گھر پر بیکار بیٹھنے سے اچھا تو یہی ہے کہ میں یہاں بچوں کو پی ٹی کروا دیا کروں۔"

"بہت اچھا کیا، نینا۔" میں نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

"شادی!" وہ مجھ پر جھک آئی۔ "ابھی راحیل مجھے لینے آئے گا۔ مرتا ہے خدا کی قسم۔ جان دیتا ہے۔ اُسے آرٹ سے بے حد لگاؤ ہے۔ میرے فن کی بڑی قدر کرتا ہے۔ جب تک ہم افریقہ نہیں جائیں گے میں ایک ڈانسنگ سکول کھول لوں گی۔"

پھر وہ ہنس کر بولی: "منی کو میرے پاس بھیج دینا۔"

مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ نہ معلوم کیوں میری پتھرائی آنکھوں کے سامنے ایور گرین کلب کی سٹیج پر ٹکے ہوئے بھاری سیاہ پردوں پر پھنکارتے ہوئے ناگ اژدہوں میں گھری ہوئی ناچنے والی کی تصویر ٹھہر گئی تھی۔

"نہیں نہیں،" میں نے گھبرا کر سوچا۔ "یہ کبھی نہ ہو گا۔"

پھر میں منی کو اُس کی کلاس میں بٹھا کر واپس چلی آئی۔

میں نے اپنے تصورات کے سبھی دریچے ایک ایک کر کے بند کر دیے۔ اب میں اپنے ذہن پر چھائے اندھیرے میں سکون کی روشنی تلاش کرنے کے لئے بھٹکنے لگی۔ اب میں اپنے خالی وقت میں ننھے کو تھپک تھپک کر لوریاں سناتی اور ذہن بہلایا کرتی۔ میں اُسے صبح کے وقت سکول پہنچانے جاتی، دوپہر کو لینے جاتی۔ کسی کسی

دن اُس کی فیس جمع کروانے جاتی۔ میری مصروفیات میں اضافہ ہو چکا تھا مگر میں بہت مطمئن تھی۔

نینا شادی کے بعد بھی کافی عرصے کام کرتی رہی۔ پھر اچانک وہ چھٹی لے کر کہیں چلی گئی۔ غالباً افریقہ کا پروگرام پورا ہو گیا تھا۔

ایک شام منی میرے گھٹنے سے لگی بیٹھی قاعدہ پڑھ رہی تھی اچانک پوچھنے لگی: "ماں، طلاق کسے کہتے ہیں؟"

"طلاق؟" منی کے منہ سے یہ لفظ سن کر میں کانپ گئی۔ میں نے بے تابی سے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"سب کہتے ہیں۔" اُس نے میرا ہاتھ اپنے منہ پر سے ہٹا کر کہا۔ "سب کہتے ہیں بی بی کو طلاق ہو گئی۔"

"ایسی باتیں نہیں کرتے، منی۔" میں بدحواس ہو کر بولی۔

"سب لڑکیاں کہتی ہیں اماں، وہ اچھا آدمی نہیں تھا۔ بی بی کو بہت مارتا تھا۔ زخم ڈال دیتا تھا۔"

میں نے باتوں میں بہلا کر منی کو ٹال دیا مگر مجھے تمام رات نیند نہ آئی۔ کروٹیں بدلتے ہوئے صبح ہو گئی۔ دوسرے دن میں نینا سے ملنے سکول پہنچی مگر وہ نوکری چھوڑ کر کہیں جا چکی تھی۔

سال پہ سال گزرتے گئے۔ منا بستہ لٹکائے سکول جانے لگا۔ رفعت کی ترقی ہو گئی تو ہم نے اپنا مکان بھی مرمت کروا لیا۔ رفعت اب بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔ ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ خود میں بھی کمر جھکا کے رہنے لگی — منی

اب بڑی ہو گئی تھی۔ اب وہ میرے بہت سے کام بھاگ بھاگ کر کر دیا کرتی تھی۔ اپنے باپ کے رومال دھو دیتی، کپڑوں پر استری کر دیتی، چھوٹی موٹی صفائی کر لیتی، چائے بنا لیتی، ہنڈیا بھون دیتی۔ مجھے اب جیسے قرار آ چلا تھا۔ ذہن میں جو خراشیں تھیں وہ مٹ چلی تھیں۔ جو پھانسیں چبھی تھیں ایک ایک کر کے نکل چلی تھیں۔ سوچنے سمجھنے کے انداز بدل رہے تھے۔ پڑوس بہت بدل چکا تھا۔ کئی پرانے مکان ڈھائے جا چکے تھے۔ اُن کی جگہ نئے مکان بن گئے تھے۔ کھلے اور ہوادار مکان، جدید طرز کے خوش نما بنگلے، دو منزلہ عمارتیں، سیمنٹ کی جالیوں سے سجے پھول دار بیلوں سے ڈھکے اُونچے اُونچے گھر۔ ۔ ۔

سامنے ہی ایک جوہڑ ہوا کرتا تھا جس کے کنارے پڑی ہوئی مٹی بھری غلاظت میں مرغیاں دانہ چگتی پھرتی تھیں۔ دنوں کی محنت سے یہاں ایک دو منزلہ کوٹھی نما مکان بن گیا۔ کوئی ٹھیکیدار صاحب تھے جو بجری اور چونے کی سپلائی کا کام کرتے تھے۔ اپنے نئے گھر میں اُترے تو چاروں طرف پہلے شیرینی بانٹی اور پھر میلاد شریف کے رقعے بھیجے۔ پڑھنے والی کا خاص اہتمام تھا۔ سُنا تھا کہ آواز میں بلا کا سوز ہے۔ نعت کیا پڑھتی ہے دل نکال لیتی ہے۔۔

مجھے میلاد شریف کی محفل سے زیادہ پڑھنے والی کا اشتیاق کھینچ کر لے گیا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ تھکی تھکی سی فضا تھی۔ ٹھیکیداروں کے گھر پکی اینٹوں کے صحن میں دیگیں چڑھی تھیں۔ برآمدے پر نیلے استر کی بھاری چقیں گری تھیں۔ ہال کمرے میں چاندنیوں کا فرش تھا۔ کارنس کے پاس ہی مسند سجی تھی جس پر پھندنے دار گاؤ تکئے رکھے تھے۔ قریب ہی ایک تپائی پر سیپارے جمع تھے۔

محلے کی بیبیاں ایک ایک کر کے آئیں، سیپارہ اُٹھا کر بڑی عقیدت سے چوم کر آنکھوں سے لگاتیں اور چاندنی پر بیٹھ کر تلاوت میں مصروف ہو جاتیں تاکہ جتنے میں مغلانی بی کی آمد ہو ایک کلامِ پاک ہی ختم ہو جائے۔

کمرے میں بتیاں جلی تھیں۔ روشنی کی جگر مگر ہو رہی تھی۔ دروازے پر پھول دار پردے گرے تھے۔ باہر بہت سے بچے کھیل رہے تھے۔ ٹھیکیدار کی بہو بار بار انھیں دور ہنکاتی۔ پھر گوٹے کناری کا آنچل سنبھال سیپارہ اُٹھا لیتی۔

"آگئیں، آگئیں! مغلانی بی آگئیں۔" بچوں نے شور مچایا۔

عورتیں سیپارے چھوڑ بھاگی گئیں۔ دو چار گلاب موتیے کے ہار لئے آگے بڑھیں۔ ایک نے لپک کر پردہ اُٹھایا۔ دوسری نے انھیں مسند پر بٹھا یا۔ گلے میں ہار ڈالے، کلائیوں میں گجرے باندھے۔ الائچی مصری کی تھالی آگے بڑھائی۔ مغلانی بی نے دو دانے منہ میں ڈالے۔ ٹھیکیدار کی بہو نے اُٹھ کر اگربتیاں سلگائیں۔ گلاب پاش ہلا کر ساری محفل کو معطر کر دیا۔

مغلانی بی کا رنگ زرد تھا، کھچڑی بال تھے۔ بیمار نظر آرہی تھیں۔ ململ کے کرتے پہ بیل بنی تھی۔ گردن میں تعویذ کا کالا ڈورا جھانک رہا تھا۔ سر پر ڈھکا ہوا ململ ہی کا مسلا دسلا دوپٹہ تھا۔ گلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالا تھی۔ ہاتھ میں سبز امام کی تسبیح باندھے اُنھوں نے بڑی عقیدت سے میلاد نامہ آنکھوں سے لگایا۔ پھر حلق کی کھوہ میں سے نازک سی آواز لہرا کر نکالی:۔

"درود پڑھو، درود پڑھو، عاشقو درود پڑھو۔۔"

وہ درد میں ڈوبی درود پڑھ رہی تھیں۔ سب ہی پڑھ رہے تھے مگر مجھے اپنے خیالوں میں خبر ہی نہ ہوئی کہ کب میلاد شروع ہوا، کب ختم ہوا۔ احساس اگر تھا تو بس اتنا کہ سوز میں ڈوبی ہوئی ایک آواز، جھلمل جھلمل کرتی، محفل پر چھائی جا رہی ہے۔

دعا کا وقت آیا تو ساری محفل نے ہاتھ اُٹھائے۔ مغلانی بی کی ہچکیاں بندھی تھیں۔ سسک سسک کر، رُک رُک کر، کانپتے ہونٹوں پر فقرے ڈھل رہے تھے۔ بے روزگاروں کیلئے روزگار کی دعا، ناداروں، بے سہاروں کے سہارے کی دعا، لاوارثوں اور یتیموں کی دستگیری کی دعا، مریضوں کی شفا کے لئے دعا! نہ معلوم کتنی دعائیں اٹھیں اور بکھریں۔ جب قرض داروں کی نجات کا ذکر آیا تو وہ بے قابو ہو گئیں ہچکیاں دبی دبی چیخوں میں بدل گئیں۔ روتے روتے مغلانی بی نڈھال ہو گئیں۔ اُنھوں نے دعا کے لئے اُٹھے ہوئے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور زمیں مسند پر بے جان سی گر گئیں۔

"نینا!" میں نے اُسے سہارا دے کر اُٹھاتے ہوئے ٹھنڈے پانی کا گلاس اُس کے ہونٹوں سے لگایا۔ "نشا — جی!" اُس نے پژمردہ ہو کر کہا۔ اور ٹپ ٹپ اُس کے آنسو گالوں پر گرنے لگے۔

"یہ کیا حالت بنائی ہے؟"

"رضائے الٰہی۔" اُس نے آنسو پونچھ کر خاص مغلانیوں کے انداز میں کہا۔

"تمہاری تو شادی ہو گئی تھی؟"

اُس نے رحم کی جلتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

"تم تو ڈانسنگ اسکول..."

وہ ایک کرب میں تڑپ کر رہ گئی۔ جیسے اس کو تیر سا چبھ گیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیا۔ "کہاں رہی اتنے دن؟" "ہاں، شادی" وہ بڑے دکھ میں بولی "میری شادی ہو تو گئی تھی۔ مگر راحیل اچھا آدمی نہیں تھا۔"

"اب کے پھر؟"

"اب کیا کہوں۔ وہ خود تو قلاش تھا مگر شادی اُس نے کاروبار کے خیال سے کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اُس کے لئے جہیز میں خزانے لے کر آتی۔ میرے ساتھ تو صرف میرا ابلو تھا۔"

"خزانے؟"

"ہاں، شادی! اُس کا منصوبہ یہ تھا کہ جب میں ڈھیروں روپیہ لاؤں گی تو وہ سیاحت کے لئے باہر جائے گا مگر جب میں خالی ہاتھ وہاں پہنچی تو وہ مجھ پر ظلم کرنے لگا۔ بڑی بے دردی سے مارا کرتا تھا۔ ناچار میں نے طلاق لے لی۔"

ذرا سا رُک کر وہ بولی: "پپا مرے تو لاکھوں بلکہ کروڑوں کا قرض چھوڑ گئے بنگلے کی قرقی بھی ہو گئی۔ ادائیگی پھر بھی نہ ہو سکی۔" وہ جیسے سوتے میں بول رہی تھی "اب تو ممی بیچاری کو فوت ہوئے بھی عرصہ ہو گیا۔"

"اوہ نینا!"

اُس نے اپنے پلو سے آنسو پونچھے، حلق کھنکار کر صاف کیا، ہونٹ کاٹ کر بڑی حسرت سے بولی: "بہت خوش نصیب تھے پپا اور ممی — اپنی زندگی تو بہت اچھی گزار گئے — آرام سے مر بھی گئے۔"

وہ بار بار آنسو روک رہی تھی، پھر بھی اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ آواز حلق میں گھُٹ رہی تھی۔

"حوصلہ رکھو، نینا، حوصلہ!"

"میرے پاس حوصلے کے علاوہ اور ہے بھی کیا۔ جبھی تو میری شادی ہو رہی ہے۔"

"شادی!"

"ہاں" اُس نے بڑی بے نیازی سے سر ہلایا۔ حاجی رمضان علی نے مجھے اپنے عزیزوں سے بڑھ کر پناہ دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بے سہارا عورت کا اس دنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے، اور یہ ہے بھی ٹھیک۔ میرے پاس تو سَر چھپانے کی جگہ بھی نہ تھی۔ کسی نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ کہاں ہو؟"

منی جوان ہو گئی ہے۔ اُس کے بہت سے پیام آ رہے ہیں۔ رفعت روزانہ بحث کرتے ہیں کہ منی کا بیاہ بہت اُونچے گھر میں کریں گے جہاں دولت کی ریل پیل ہو گی، معیارِ زندگی بہت بلند ہو گا۔۔۔۔

میں اپنی منی کا بیاہ اپنے ہی جیسے گھر میں کروں گی، میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر لیا۔

"اُن کی پہلی تین بیویاں ہیں،" نینا بڑی رازداری میں مجھ پر جھک آئی۔ "دس بارہ بچے بھی ہیں۔ سب بہت خوش ہیں مل جل کر گزارہ کر لیں گے۔ نکاح ہوتے ہی ہم حج کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ خدا بڑا کارساز ہے، شہزی۔" اُس نے میرا ہاتھ بڑے پیار سے دبایا۔

رفعت سے روزانہ بحث کرنے کے بعد ہم نے منی کی منگنی کر دی۔ آفتاب بالکل رفعت کی طرح ایک دفتر میں ملازم ہے۔ چھوٹی سی تنخواہ ہے اور اخراجات کی ایک طویل فہرست۔ منی دن بھر کام کرے گی، پیٹ کاٹ کر اور اپنی معصوم خواہشات کا گلا گھونٹ کر گزارہ کرے گی۔ برتن مانجھ مانجھ کر اُس کی ہتھیلیاں کھردری ہو جائیں گی۔ اُس کے چہرے کی رونق چند ہی دنوں میں ختم ہو جائے گی۔ میری طرح وہ بھی بنگلوں اور کاروں کے خواب دیکھ کر سو جایا کرے گی اور صبح کو جب اُٹھے گی تو اُس کا تکیہ بھیگا بھیگا ہو گا۔ مگر میں خوش ہوں۔۔۔ بہت خوش۔۔۔

کل میں اُس کے جہیز کے لئے ساڑھیاں خریدنے گئی تھی۔ بازار سے واپس آ رہی تھی تو کالے شاہ کے مزار کے گرد لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ راستہ چلنا دشوار تھا۔ لنگر تقسیم ہو رہا تھا شاید۔ جبھی تو بھک منگوں اور فقیروں نے اُودھم مچا رکھا تھا۔

اسی ہنگامے میں مجھے نیلنا نظر آگئی۔ اُس کے ساتھ میلے پرانے کپڑے پہنے تین چھوٹے چھوٹے بچّے تھے۔ جو راہ گیروں کو سلام کرتے، اُن کے پیچھے ہاتھ پھیلا کر بھاگتے، اور پھر ہانپ کر واپس آجاتے۔ لوگ گزرتے گزرتے کچھ پھینک جاتے تو دونوں ہاتھوں سے بٹور کر چھین جھپٹ کرتے ماں کی جھولی میں ڈال دیتے۔

وہ فٹ پاتھ پر بوسیدہ سا برقعہ لپیٹے بیٹھی تھی۔ ایک سوکھا ہوا زرد ہاتھ مانگنے کے انداز میں پھیلا ہوا تھا۔

میں نے قریب جا کر آہستہ سے پکارا: "نینا!"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"نینا!" میں نے دوبارہ کہا۔

اُسے کوئی جنبش نہ ہوئی۔

"نینا، نینا" میں نے اُسے جھنجوڑ ڈالا، اُس کا بخار میں جلتا ہوا ہاتھ اپنی ہتھیلیوں میں دبایا مگر وہ ساکت بیٹھی رہی جیسے موجود ہی نہ ہو۔

"سویرا" لاہور

لطیف کاشمیری

رسل جو

میں شام مال روڈ کے ایک بک اسٹال سے کتابیں خرید کر جب باہر نکلا
تو کتابوں کا سات سیر کا پیکٹ ایک دم سات من کا ہو گیا۔ اس وقت مال پر ٹہلتے
ہوئے خوش پوش لوگوں کے بڑھیا سوٹوں پر نگاہ پڑ چکی تھی اور مجھے احساس ہو چکا
تھا کہ میں خود بھی ایک اوسط درجے کے سوٹ میں ملبوس ہوں اس لئے اپنے
اور دوسروں کے سوٹوں کی لاج اسی بات میں تھی کہ پیکٹ کسی مزدور کو تھما دیا
جاتے۔ ارد گرد نگاہ دوڑائی مگر کوئی مزدور نما شخص نظر نہ آیا۔ آخر خود ہی پیکٹ
اُٹھا کر دائیں بائیں دیکھتا، کسی قدر جھینپتا ہوا چل پڑا۔ چند قدم کے فاصلے پر
پیچھے سے ایک مسکین سی آواز آئی "ہم اٹھا لے بابو صاب؟"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ "بابو صاب" کہہ کے ہنسی نکالنے والا یہ ایک انسان نما
مزدور تھا جو شاید ابھی ابھی زمین کی تاریک تہوں سے کہیں پھوٹا تھا۔ کیونکہ اس
کے دھول میں اَٹے ہوئے فلاکت زدہ چہرے پر جو حسین سی مسکراہٹ کھیل رہی

تھی، اس میں سادگی اور معصومیت کا ایسا امتزاج تھا جو کسی نومولود بچے کے بشرے پر زندگی کی ہما ہمی پہلی بار دیکھنے پر ابھر آتا ہے۔

"وہ سامنے شہر جانے والی جو لوکل بس کھڑی ہے نا بس وہاں تک سامان لے چلو، دریہ لو۔" میں نے دس پیسے کا ایک سکہ نکال کر اس کی مٹھی میں تھما دیا۔ مزدور کا پسینہ نکلنے سے پہلے اس کی مزدوری چکا کر میں نے بہ زعم خود مزدور میں خود اعتمادی اور اعتبار کا لازوال جذبہ تخلیق کر دیا تھا۔

"اس کا کیا جرورت تھا بو صاب" اس نے بوسیدہ واسکٹ کی اندرونی جیب میں دس پیسے رکھتے ہوئے اس معمولی فاصلے اور برائے نام بوجھ کا خیال کر کے شاید یہ بات کہی تھی لیکن مجھے اس میں اس کی نجابت اور شرافت کی جھلک آئی۔ اس نے مسافروں کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے بس کے اندر جا کر ایک سیٹ پر پیکٹ جما دیا۔ میں اسی سیٹ پر بڑے اطمینان سے براجمان ہو گیا اور بس ڈولتی ناؤ کی طرح ہچکولے کھاتی شہر کی طرف بڑھنے لگی۔

میں نے دیکھا، بس میں میرے قریب ہی کھڑا وہ مسکرا رہا تھا۔ مجھے حیرت تو ہوئی لیکن میں نے اپنے ساتھ والے آدمی کو کسی قدر دھکیل کر اس کے لئے جگہ بنانا چاہی، مگر وہ بڑے اطمینان کے ساتھ زمین پہ بیٹھ گیا۔

"تم اترے نہیں ؟" میں نے اس کی سادہ مگر پراسرار سی مسکراہٹ کا پس منظر جاننے کے لئے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

دھول کی تہوں کے نیچے اس کے پژمردہ رخساروں کے کلوں میں ذرا سی جنبش ہوئی اور اس کی شریانوں میں خون کی گردش نے لمحہ بھر کے لئے مدھم سی

سرخ چمک دوڑا دی" بس جی ہم بھی شہر جائیں گا۔" اُس نے پھر بتیسی نکال دی۔

"کیا نام ہے تمہارا ؟" میں نے اُس کی ذات میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"رسل جُو" ایک بے مقصد سی احمقانہ ہنسی کے درمیان اُس نے جواب دیا۔

بس کنڈیکٹر ایک کونے میں کھڑا ٹکٹ کے لئے ہانک لگا رہا تھا۔ وہ قریب سے گزرا تو چپکے سے میں نے شہر کے دو ٹکٹ لے لئے۔ اس خیال سے کہ جب رُسل جُو کو معلوم ہوگا تو وہ حیران ہوگا لیکن وہ حیران نہیں ہوا بلکہ اس انکشاف پر عجیب ممنونیت اور احسان مندی کے جذبات سے لبریز آنکھوں سے میری جانب تکنے لگا۔ جیسے میں نے اس کا سات پیسے کا ٹکٹ خرید کر اس پر بہت بڑے احسان کا بوجھ لاد دیا ہو۔ اس بوجھ سے اس کی کمر تو نہیں مگر اُس کا دل کسی قدر ضرور جھک گیا۔

میں راجہ بازار میں بس سے اُتر پڑا۔ یہ اس لوکل بس کا آخری اسٹاپ تھا میں کتابوں کا بنڈل بغل میں داب کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ چند قدم چلنے کے بعد معاً میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ ایک موہوم سے تجسس آمیز خوف نے میرے لاشعور کے پرندوں پر سرسرانا شروع کر دیا۔ بس پر چڑھتے اور اُترتے وقت جیب کترے جو ہاتھوں کی صفائی دکھاتے ہیں، اُن کے تذکرے سُن چکا تھا۔ پھر چور اچکوں کو مسافروں کی جیبوں کو دُور سے جانچ کر اُن کا تعاقب کرنے میں بھی کمال حاصل ہے۔ میں ٹھٹکا اور میرا ایک ہاتھ خود بخود کوٹ کی اندرونی جیب میں بٹوے کو ٹٹولنے کے لئے سرک گیا۔ پھر اطمینان کی ایک ہلکی روشنی لہر نے معاً میرے چہرے کے نقوش کا احاطہ کر لیا۔ اس

اطمینان بخش لہر کے دوران، میں پیچھا کرنے والے اس سائے کو دیکھنے کے لئے مُڑا ہی تھا کہ وہ اُچکسا کر اچانک میرے سامنے آگیا اور میلے پیلے پیلے دانت نکالتے ہوئے میرے ہاتھ سے کتابوں کا بنڈل چھیننے لگا۔ مجھے اس کے رویے پر کسی قدر رشک گزرا اور جھنجھلاہٹ بھی ہوئی۔ "چھوڑو بھئی۔ کیا تم مسافروں کا سامان زبردستی اُٹھاتے ہو؟"

رُسل جو میرے سوالوں کا جواب دیئے بغیر کتابوں کا بنڈل اپنے چوڑے شانوں پر جما چکا تھا۔ "تم کس طرف جائیں گا بابو صاب؟" مجھے اُس کے لہجے میں عجز و انکسار کی گھلاوٹ محسوس ہوئی۔

"میں تو جامع مسجد کی طرف جاؤں گا۔ لیکن بندۂ خدا تم کس سمت کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"ہم بھی جمعہ مسیت کی طرف جاتی بابو جی۔"

سوچا عجیب جنگلی اور دیوانے مزدور سے پالا پڑا ہے۔ ایسے دیوانے سے جو اپنے مطلب کے لئے تو ہوشیار ہے۔ اس نے سوچا ہے کہ چلو اپنے گھر کی طرف جاتے جاتے ساٹھ ستّر پیسے اور اس شخص سے ہتھیا لو۔ لیکن مجھے بھی اپنی گرہ کا پکا بننا پڑے گا۔ میں بھی اس زبردستی کے مزدور کو ایک اٹھنی سے زیادہ ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا۔

یوں تو یہ پیکیٹ شہر سے جامع مسجد تک میں خود ہی اُٹھا کر لے جا سکتا تھا کیونکہ یہاں مال روڈ کی طرح کسی ایسے خوش پوش نوجوان کے ملنے کی توقع نہ تھی جو بیک وقت میرے سامان اور ٹائی پر استہزائیہ نگاہیں ڈال سکے۔

لیکن رسل تو ایسے لوگوں کی پیٹ کی آگ کے لئے ایندھن مہیا کرنا بھی تو ہم ایسے سفید پوش انسانوں کا فرض ہے۔

"پیٹ کی آگ کے لئے دن بھر کام کر کے کتنا ایندھن اکٹھا کر لیتے ہو؟" میں نے قدرے مزاحیہ انداز میں اُس سے پوچھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ میرا مطلب سمجھ جائے گا، مگر اُس نے اپنی مخصوص عاجزانہ مُسکراہٹ کے ساتھ میری سَمت دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "ہم اُدھر صبح سے شام تک دھیاڑ داڑی پر کوم کرتی ٹھیکیدار اچھا آدمی نہیں ہوتی۔ مہینہ میں دو چار دھیاڑی کھا کھاد کاٹ لیتی — ما —" اس کا جی ٹھیکیدار کو موٹی سی گالی دینے کو چاہا اور گالی کا ایک حرف اُس کی زبان پر آکر اٹک گیا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟" میں اس کی دلچسپ شخصیت کی تہوں میں اُترنے کی کوشش کرنے لگا۔

"کشیر کا بو بو صاب" وہ تشکر آمیز نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا "سو پور میں ہمارا اجدّی پشتی مکان ہوتی۔ ہم بال بچہ کے ساتھ اب اِدھر پنجاب میں سر چھپاتی۔ اُدھر کا پھوجی لوکھ لڑائی میں ہمارا کھیت اور گھر بار جلا دیتی۔ گریب کے لئے بو بو بی اس جمین پر کوئی جگہ نہیں ہوتی۔"

اُس کے افلاس زدہ چہرہ پر مسکراہٹ کی جگہ یکایک نفرت اُبھر آئی۔ نہ جانے یہ نفرت ظلم کے خلاف تھی یا اُس کی اپنی ذات کے خلاف۔

چلتے چلتے یکایک وہ رُک گیا۔ کچھ سوچتا ہوا سا۔ مجھے اس وقت وہ ایک

اچھا خاصا فلسفی لگ رہا تھا جس نے گردشِ حالات کے تحت یا محض زندگی کے تلخ حقائق اور خیالات کی ریل پیل سے اُکتا کر محنت مزدوری میں پناہ لی ہو۔

"محنت مزدوری کر کے کتنا کچھ روز کما لیتے ہو تم؟" میں نے ہمدردانہ لہجے میں اُس سے پوچھا۔

"ڈیڑھ دو روپیہ جی" کبھی کبھی بارش ہوتی یا موسم خراب ہوتی تو مجوری نہیں ملتی۔ اس روز گھر میں چولہا نہیں جلتی۔ بس پرانا دارمہ اور ستو پر گزارتی ہم لوکھ۔"

رسل جو بڑے خلوص کے ساتھ اپنے گھریلو حالات بتا رہا تھا۔ لٹ لٹا کر دھاتر کی حیثیت سے پنجاب میں آ بسنے تک کی داستان اُس نے چند ہی جملوں میں مجھے سُنا ڈالی۔ میرے دل پہ اس کی سادہ اور معصوم باتوں کا اتنا اثر ہوا کہ میں دُور تک انہی تصورات و احساسات میں غلطاں چلتا رہا۔

جامع مسجد کے قریب ہی راجہ بازار کے بڑے چوک میں مجھے ایک پرانا شاعر دوست مل گیا۔ جس نے اپنی نئی غزل سُنانے کے لئے مجھے زبردستی روک لیا۔ غزل اُس کے قول کے مطابق نئی تھی مگر اس میں وہی عشق و محبت اور وصل و فراق کی گھسی پٹی داستانیں دہرائی گئی تھیں۔ میں نے جلدی جلدی گلو خلاصی کے لئے اس کی دوسری نئی غزلیں سننے کے لئے طوعاً و کرہاً دوسرے دن کا وعدہ کر لیا۔ ذرا آگے بڑھ کر اچانک مجھے رسل جو کا خیال آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دوست تو مجھے نظر آ رہا تھا لیکن مزدور غائب تھا۔

اس احساس کے ساتھ ہی کہ اس بنڈل میں لائبریری کی چند سات

سو روپے کی کتابیں تھیں، میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے بدحواس سا ہو کر پیچھے کی طرف تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ دور تک راجہ بازار کی پُر رونق شاہراہ پر مصروف کاروباری انسانوں اور خریداروں کا ایک سیلابِ عظیم تھا۔ جس میں مجھے کہیں، رسل جو کا کتابوں کے بنڈل میں چھپا ہوا سر نظر نہ آیا۔ آخر وہی ہو کر رہا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ شام کا رینگتا ہوا سرد اندھیرا ایک دم اماوس کی مہیب رات میں بدل گیا۔ اس کی برف آلود گہرائیوں میں، اپنے آپ کو ڈوبتا ہوا اور دھنستا ہوا محسوس کرنے لگا۔ دل ہی دل میں ہر کس و ناکس پر اعتبار کر لینے کی عادت پر افسوس بھی اُبھرا۔ رسل جو خود تو غائب ہو چکا تھا لیکن اس کا سادہ، بے ریا اور معصوم سا چہرہ ابھی تک میری آنکھوں تلے گھوم رہا تھا۔ سچ ہے لوگوں کے ظاہر اور باطن میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ میں اپنی انسان دوستی کی کربناک شکست کے متعلق سوچتا ہوا، انتہائی کبیدہ خاطری کے عالم میں گھر کی طرف چل دیا۔

میں ان قیمتی کتابوں کے زیاں پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا متلاشی نظروں سے دائیں بائیں دیکھتا دیوانہ وار آگے بڑھنے لگا —— اب اُسے کہاں ڈھونڈوں؟ کہاں جاؤں؟ کیا تھانے میں رپٹ لکھوا دوں؟ پھر خیال آیا کہ جہاں اپنے دوست سے مصافحہ کرکے چند لمحوں کے لئے کھڑا ہوا تھا اور اس نے تازہ غزل سنانا شروع کر دی تھی۔ شاید وہیں کہیں کسی تھڑے کی اوٹ میں وہ چور دبکا بیٹھا ہو بھاگا بھاگا اُدھر گیا۔

زندگی اسی طرح رواں دواں تھی۔ کسی کے سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر۔

شام کے ملگجے اندھیرے میں رینگتے ہوئے کاروباری لوگوں کے دھیمے دھیمے شور پر مکھیوں کی بھنبھناہٹ کا گمان ہو رہا تھا ـــ دکانیں بجلی کے قمقموں سے بقعۂ نور بنی تھیں لیکن میرا دل نا امیدی اور احساسِ زیاں سے گمبھیر اندھیاروں میں ڈوب رہا تھا۔ رہ رہ کر رسل جو کا معصوم اور بھولا سا چہرہ نظروں تلے میری بدنصیبی کی علامت بن کر گھوم رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ہی تو میرے اعتماد کو کسی کی پُراسرار شخصیت سے ٹھیس پہنچی تھی اور میں پہلی بار نظریاتی شکست کی ایک تلخ کیفیت سے دوچار ہوا تھا جو کسی لحاظ سے بھی زہر بھرے جام کی تلخی سے کم نہ تھی۔

رسل جو کہیں نظر نہ آیا تو میں مایوسیوں اور افسردگیوں کے اندھیاروں میں محصور سا ہو کر گھر کے راستے پر ہولیا۔ پھر گھر کے نزدیک پہنچ گیا۔ سامنے بجلی کی روشنیوں میں جامع مسجد کے سپید بیضوی گنبد اور منقش در و دیوار نظر آرہے تھے۔ مسجد کا بلند روشن مینار وحدت الوجود کا اظہار کر رہا تھا اور مؤذن اللہ کی بڑائی کا اعلان کر رہا تھا۔

"اللہ بہت بڑا ہے ـــ اللہ بہت بڑا ہے"

لیکن ـــ میں نے سوچا ـــ انسان بہت چھوٹا ہے ـــ انسان بہت ہیچ ہے ـــ وہ اپنے گھر میں آسودگی کا چراغ روشن کرنے کے لئے دوسروں کے دیئے بجھا دیتا ہے ـــ وہ تو اللہ ہی کا نائب اور اس کا وجودِ معنوی ہے۔ پھر اس نے اپنی بڑائی اور عظمت کو کیوں دنیا کے بازار میں نیلام پر اٹھا دیا ہے؟

میں چند لمحوں کے لئے پلٹ کر کھڑا ہو گیا اور بازار کی طرف نادھر اُدھر تکنے لگا

معاً مجھے محسوس ہوا جیسے بازار کے اس شور و ہنگامے میں کوئی مجھے پکار رہا ہے، آواز مانوس سی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو فرطِ مسرت سے میری باچھیں کھِل گئیں۔

"بوبوجی! تم عجیب آدمی ہوتی۔ ہم ادھر سارا سڑک پر تم کو دیکھتی پر تم نظر نہ آتی۔ تمہارا ٹھکانہ معلوم ہوتی بوبوجی تو سامان ہم گھر پہنچا دیتی۔"

میں چند لمحوں تک حیران کھڑا اسے سر سے پاؤں تک دیکھتا رہا پھر میرا جی رسول بُو کو خوشی سے سینے کے ساتھ چمٹا لینے کو چاہا۔ میں نے اس سے یونہی تجسس کی خاطر پوچھا "تم یہاں مسجد میں کیا کر رہے تھے۔ کیا نماز پڑھنے چلے گئے تھے؟"

"ناہیں بوبو صاب! ہم نماز پڑھنے نہیں جاتی" اس نے حسبِ عادت کھکھلیسی نکال دی "ہم تو ادھر سیڑھیوں پر بیٹھا تمہارا انتظار کرتی۔ تم نے بولا نہ بوبو کہ تم جمعہ مسیت کے پاس رہتی۔"

میں رسول بُو کو ساتھ لے کر مسجد کے سامنے والی گلی میں مڑ گیا۔ دروازے پر دستک دیتے ہوئے میں نے سوچا کہ کل جب میں اپنے دوست شاعر سے ملوں گا تو مروت اور لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر اسے کہوں گا کہ وہ زندگی کے بارے میں دکھا کرے۔ اس کی لطافتوں، اس کی کثافتوں اور اس کی صداقتوں کے بارے میں۔ اپنی بے تکی شاعری اور بے وقت کی راگنی کو چھوڑ کر اس کوہستانی مزدور کے متعلق کوئی عہد آفرین نظم لکھے۔ اس کی دیانت، اس کی معصومیت، جفاکشی اور محنت کی عظمت کے سامنے اپنا سر نگوں کر دے۔ اس لازوال انسانیت کے بارے میں کچھ لکھے جو سنگینوں کے سائے میں بھی زندہ و تابندہ رہتی ہے اور لُٹ لُٹا کر

وطن سے دور آکر لوٹ کھسوٹ کے شکار معاشرے میں، غربت کے دن گزارنے پر بھی فنا نہیں ہوتی۔

ماں نے دروازہ کھول کر ایک نظر چیتھڑوں میں لپٹے انسان پر ڈالی اور جا کر مصلے پر بیٹھ گئی۔ تسبیح کے دانوں کو رولتے ہوئے اس کا سپید بالوں والا سر نامعلوم انداز میں برابر ہلتا رہا۔

میں نے کتابوں کا بنڈل رسل جو کے ہاتھ سے لے کر تپائی پر رکھ لیا اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے سپاٹ چہرے پر بڑی معنی خیز قسم کی ایک مقدس سی چمک مسکراہٹ کا روپ دھار کر بکھر گئی اور اس نے نفی کے انداز میں گردن ہلا دی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی اور میں نے چند آنے اور شامل کر کے رقم اس کی پھٹی ہوئی واسکٹ کی اوپری جیب میں ڈال دی۔ وہ یہ رقم اپنی جیب سے نکال کر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھا اور میں خفگی میں پیچھے ہٹ گیا۔

"ہم یہ ناہیں لیں گا۔" وہ منمنایا۔

"عجیب انسان ہے۔" میں بڑبڑایا "کیا یہ کم ہیں؟ لیکن میں اب ایک پیسا بھی اور نہیں دوں گا۔" میری متانت بھری آواز کی کڑیاں تحکمانہ انداز سے جا ملیں۔ وہ حسب عادت مسکرا دیا۔

ماں اس دوران مصلی لپیٹ کر اٹھ چکی تھی۔ رسل جو نے سوا روپیا کتابوں کے بنڈل کے پاس تپائی پر رکھ دیا تو ماں نے جھنجھلا کر کہا "نہیں لیتا تو نہ لے، تمہیں کیا پتا بیٹے! ان مزدوروں کی گٹھلیوں میں ہزاروں روپیہ جمع ہوتا ہے۔" تسبیح کے

دالوں کو جلدی جلدی گھماتے ہوئے ماں نے انکشاف کیا۔

پھر بھی مجھے رسل بوُ کی حالتِ زار پر ترس آگیا۔" اچھا تو تم ڈیڑھ روپیا لئے بغیر نہیں ٹلو گے۔" میں بڑی مستعدی کے ساتھ جیب سے چوّنی نکالتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

لیکن وہ اپنی اسی مسکراہٹ کے ساتھ معاً کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا "ناہیں بوبوبی! یہ بات ناہیں ہوتی۔ جب تم گریب کے ساتھ اتنا مہربانی سے پیش آتی۔ اتنا اچھا سولوک کرتی۔ تو ہم بھی ایسا ناہیں کریں گا — ہم پونسا ہرگز ناہیں لیں گا۔"

میں وہ ڈیڑھ روپیا لے کر اس کے پیچھے تقریباً دوڑ پڑا لیکن وہ بڑی پھرتی کے ساتھ، رات کی سیاہیوں کو اُجالتا ہوا، گلی کے موڑ پر غائب ہو گیا — میرے سر کبھی اَدا نہ ہو سکنے والا قرض چھوڑ کر۔

"فنون" لاہور

نگہت لغاری

مِس عاصمہ حبیب

جس دن لمبے بالوں والی نامکمل سی عاصمہ حبیب کالج میں داخل ہونے آئی تھی۔
تو ایسے لگا جیسے کالج کے لمبے برآمدوں میں کوئی ننھی سی چڑیا پھدک آئی ہے۔ وہ
اتنی چھوٹی اور دُبلی تھی کہ اُس کے انسان ہونے پر بمشکل یقین آتا تھا، پر خبر نہیں کیا بات
تھی پہلے دن ہی سارا کالج اس سے مرعُوب ہوا جاتا تھا۔ انتہائی خوب صُورت تیکھے
نقشے والی حقیر خقیر سی عاصمہ حبیب کو دیکھ کر خوشی اور ہمدردی کے جذبات بیک وقت
اُبھرے پڑتے تھے ـــ لگتا تھا خدا نے اپنا سارا کام بس گردن کے اوپر ہی اُوپر
کیا ہے۔ اس کا خوبصورت چہرہ اس کے حقیر بدن پر ڈیکوریشن پیس لگتا تھا جیسے
مٹی کے ٹوٹے پھوٹے گلدان میں تازہ اور خوبصورت پھولوں کا گلدستہ ـــ نہ بدن پہ
کوئی بوٹی نہ کمر میں کوئی لچک، 'نسوانیت کے سارے آثار مِٹے مِٹے اور چھپے چھپے'۔ پر
خبر نہیں کالج بھر کے لوگوں کو اس بے رَس سی عاصمہ حبیب میں کیا نظر آتا کہ سارا دن
مکھیوں کی طرح اس پر بھنبھناتے اور بھرے بھرے بدنوں والی لڑکیاں یہ سب کچھ

اور حیرت سے دیکھتیں ـــ یہ تو دوسرے تیسرے روز ہی پتا چل گیا کہ یہ ننھی سی چڑیا بڑی ذہین ہے۔ ہر بات کا ایسا فر فر جواب کہ پروفیسر نیاں بغلیں جھانکنے لگتیں۔ بعض لڑکیاں تو اُسے کوئی ماورائی مخلوق سمجھ کر گھنٹوں تاکتیں۔ لیکن آہستہ آہستہ جب اس کے سارے لچھن ان کے سامنے آئے تو لڑکیاں اُس سے شدید نفرت کرنے لگیں۔ بعض اسے قابلِ رحم سمجھ کر نظر انداز کر دیتیں۔ لیکن بہر حال جو کچھ بھی تھا عاصمہ حبیب کالج کا ایک ایسا نقطہ مرکزی بن کر رہ گئی تھی جس کے گرد کالج کا ہر وجود گھومتا تھا۔ وہ میری روم میٹ تھی اور آج بھی اچھی طرح یاد ہے اس نے کبھی کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیا تھا، وہ ہر ایک سے اتنے عجز اور انکسار سے بولتی کہ دوسرا بچھ بچھ جاتا تھا۔ کوئی لڑکی بیمار ہوتی تو عاصمہ حبیب سب سے پہلے پہنچتی جس دن ناز فاطمہ کی ماں کی موت کی خبر آئی تھی عاصمہ ناز کے ساتھ گجرات اس کے شہر گئی تھی اور سو روپیہ بھی اس کی چھوٹی بہن کو دے آئی تھی۔ جسے جنم دے کر اس کی ماں فوت ہوئی تھی اور وہ پنگھوڑے میں اکیلی پڑی رو رہی تھی۔ دس بیس تو کتنی ہی لڑکیاں روزانہ قرض لے لیتی تھیں لیکن عاصمہ حبیب نے کبھی اُن کا نام بھی یاد نہ رکھا۔ ٹک شاپ پر بھی کتنی ہی لڑکیاں اس کے نام پر کھا لیتیں۔ اور اگر میں کبھی اِن باتوں کی طرف اس کی توجہ مبذول کراتی تو ہمیشہ ہنس کر یہ کہہ دیتی "چھوڑو یار اور بہت سی باتیں توجہ کے قابل ہیں۔ کھانے دو انہیں ـ خوشی بہت مہنگی چیز ہے دوست ـ اور اگر انہیں اس طرح خوشی ملتی ہے تو بخدا میں بہت خوش ہوں" وہ ہمیشہ ایسی باتوں سے مجھے لاجواب کر دیتی تھی ـ ہر دیکھنے والے کو عاصمہ حبیب سے شدید نفرت کے ساتھ شدید محبت

ہو جایا کرتی تھی۔ اور میری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ مجھے اُس کے بارے میں
جو جو باتیں معلوم ہوتیں اور میں نے خود جو کچھ دیکھا میرے دل میں اس کے لئے
بے حساب نفرت تھی مگر معلوم نہیں کیا بات تھی میں سوچتی اگر مجھے عاصمہ حبیب
کے کمرے سے نکال دیا گیا تو میں بے سانس ہو کر رہ جاؤں گی۔ میں ایک لمحہ
بھی نہ جی سکوں گی۔ اپنے اندر کے ان جذبات کا تو مجھے اس روز پتا چلا جس
روز عاصمہ نے رات کو مجھے چاقو مار کر زخمی کر دیا تھا' لیکن جب لڑکیوں نے
مجھے دوسرے کمرے میں شفٹ کرنے کے لئے میرا سامان اٹھوایا تو میں نے چیخ
چیخ کر اُن کو یہ ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ عاصمہ رات
کو ہمیشہ صرف انڈر ویئر پہنے ننگ دھڑنگ سویا کرتی تھی۔ روز روز کا یہ معمول
میری برداشت سے باہر ہو گیا' کیونکہ اسے اس حالت میں دیکھ کر میں ذہنی طور
پر اس قدر پریشان ہو جاتی تھی کہ ڈھنگ سے پڑھائی نہ ہو پاتی تھی۔ اگلی رحم
میرا پرچہ تھا۔ عاصمہ اسی حالت میں میرے ساتھ کرسی پر آ کر پڑھنے لگی۔ میرا ذہن
چکرانے لگا کیونکہ اس سے پہلے وہ کم از کم میرے قریب آ کر یوں بے تکلفی سے
نہ بیٹھی تھی۔ بات ناقابل برداشت تھی۔ میں نے سختی سے کہہ دیا کہ تمہیں اس حالت
میں دیکھ کر مجھ سے پڑھائی نہیں ہوتی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی' عاصمہ اس بات
کو اتنا محسوس کرے گی وہ تیزی سے اٹھی' اٹیچی سے چاقو نکالا اور جھٹ پٹ چڑھا کر مجھ پر
ٹوٹ پڑی' حیرت اور غم سے میرا حلق خشک ہو گیا۔ وہ تو شکر ہوا باتھ روم کا پچھلا
دروازہ کھلا تھا۔ لڑکیاں عاصمہ کی چیخ و پکار پر اندر دوڑ آئیں (وہ غصے کے وقت
ہمیشہ زور زور سے چیختی تھی) اور اس طرح میری جان بچ گئی۔ میری دو انگلیاں

شدید زخمی ہوگئیں۔ بات وارڈن تک نہ پہنچ سکی۔ کیونکہ عاصمہ نے دوسرے ہی لمحے رو رو کر کچھ اس انداز سے مجھ سے معافی مانگ لی کہ اُلٹا میں اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ عاصمہ حبیب کے متعلق رو ندرو ند ایسی ایسی باتیں سننے میں آتیں کہ میرا ذہنی توازن بگڑنے کو آگیا — اُس کا دن رات ہوٹلوں اور کلبوں میں گزرتا اور صبح کالج میں آکر لڑکے ایک دوسرے کو بتاتے۔ یار اپنا آپ دینے میں بڑی سخی ہے۔ رات تو جی بھر دیا عاصمہ نے۔ کالج کا ہر فرد لشر یہ باتیں سُنتا اور میں کڑھ کڑھ کر مرنے کو آجاتی تھکی ماندی وہ رات کو ہوسٹل کی دیوار پھاند کر آتی اور ساری رات کراہتی رہتی۔ صبح پہلے پیریڈ تک شراب اُس کی آنکھوں میں تیرتی رہتی۔ رات کو کبھی کبھی وہ اتنے زور سے کراہتی کہ لڑکیاں گھنٹوں کتابیں سامنے رکھے بیکار بیٹھی رہتیں اور ایک دن جب لڑکیاں مل کر وارڈن کے پاس یہ سارا بات پہنچانے گئیں تو وارڈن نے آگ بگولا ہونے کی بجائے بجھے بجھے لہجے میں کہا ہر ایک کا اپنا اپنا کیریکٹر ہوتا ہے تمہیں اس کی کراہٹوں یا آوارگیوں پر ہاتھ ڈالنے کی کس نے اجازت دی ہے۔ تم جاسکتی ہو۔ اور لڑکیاں بڑبڑاتی لڑکھڑاتی واپس آگئیں — ہوسٹل اور کالج کا کوئی قانون اور ضابطہ اسے قابو میں نہ کر سکتا تھا۔ لڑکیاں صاف صاف کہتی تھیں کہ وارڈن عاصمہ حبیب کی آوارگیوں پر پردہ پوشی کرکے اُسے بربادیوں کے کنارے پر پہنچا رہی ہے اور جب یہی بھنک وارڈن کے کانوں تک پہنچی تو اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ یہ لڑکی بہت جلد مرنے والی ہے اور ہم اسے زیادہ دیر تک زندہ رکھ کر خوار نہیں کرنا چاہتے۔ اگر کوئی لڑکی اس پر فقرہ کس دیتی تو وہ بھرے کالج میں آنکھ مار کر کہہ دیتی — یاروں سے اُٹھوا دوں

گی ـــ سمجھیں ـــ اور لڑکیاں ساری بات سمجھ کر جلدی سے کھسک جاتیں ـــ
عاصمہ کے خلاف شکایات کا ایک انبار پرنسپل تک پہنچ چکا تھا اور وہ بھی سرزنش
کے لئے کسی مناسب موقعہ کی تلاش میں تھی۔ لیکن انہی دنوں پروموشن ٹیسٹ میں
عاصمہ حبیب نے ساری کلاس کو شکست دے کر ساری پروفیسروں کو چونکا دیا۔
عاصمہ کا پرچہ حیرت انگیز حد تک عمدہ تھا۔ اور اس طرح عاصمہ کے خلاف شکایات
کا دفتر ایک بار پھر مقفل کر دیا گیا۔ اور عاصمہ کی سرگرمیاں پھر تیز ہو گئیں۔ اب
ایک نیا جنون شروع ہوا تھا۔ وہ ہر روز شام سوئمنگ کا سیٹوم کاندھے پر ڈالے
نیشنل ہوٹل کے سوئمنگ پول میں نہانے جاتی اور راستے میں کسی بھی گاڑی والے
سے کہتی۔ اے۔ ڈیئر ہمیں نیشنل ہوٹل تک چھوڑ دو ٹیکسی نہیں مل رہی۔ اور کود ک
کر کار میں بیٹھ جاتی۔ کار والا کوئی پسند آجاتا تو دوستی کر لی جاتی۔ نہیں تو اترتے وقت
وہ ٹھینگا دکھا کر یوں بے نیازی سے گاڑی سے اتر جاتی جیسے کرایہ ادا کر دیا ہو ـــ
سوچتی ہوں عاصمہ حبیب کو کون بھلا سکتا ہے۔ اور آج جب میری بڑی بیٹی ہپی نے
مجھے آ کر بتایا کہ پرنسپل مس خان نے کالج کے ملٹی پرپز ہال کا نام عاصمہ حبیب ہال رکھ دیا
ہے تو میں سوچ رہی ہوں عاصمہ حبیب نے کونسا بڑا کام کیا ہے، وہ تو کالج کا نام
ڈبونے میں سر فہرست تھی۔ پھر یہ اچانک مس خان نے کیا کر ڈالا ہے۔ لیکن سوچتی
ہوں اس ننھی حقیر لڑکی نے ضرور کوئی بڑا کام کیا ہو گا۔ مجھے ملے تو اسے بیس سال
ہو گئے ہیں، خبر نہیں عاصمہ حبیب نے ان بیس سالوں میں زمانے بھر پر کیا کیا ستم
توڑے ہوں گے۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ عاصمہ حبیب نے ایک شام بڑی پریشانی
میں مجھے بتایا تھا کہ کل چائنیز ہوٹل میں مس خان نے مجھے سعید چاولہ کے ساتھ اس

حال میں دیکھا کہ اس کا ایک ہاتھ میری کمر میں تھا اور دوسرا ہاتھ میری ران پر تھا۔ عاصمہ حبیب نے یہ ساری بات اتنے ہلکے پھلکے ہو کر بتا دی کہ چند لمحوں تک میری قوت گویائی ختم ہو کر رہ گئی۔ لیکن وہ یہ ساری بات مجھے بتا کر یوں ہلکی ہو کر چٹکی بجاتی سگریٹ سلگانے بیٹھ گئی جیسے یہ سارا جرم میں نے کیا ہے اور دوسرے دن کا وہ طوفان بھی مجھے یاد ہے کہ مس خان نے ہال میں تمام لڑکوں اور لڑکیوں کے سامنے آگ بگولا ہو کر عاصمہ حبیب کو ڈانٹا تھا۔ اور عاصمہ نے مس خان کو جو جواب دیا وہ کالج کی تاریخ کا سب سے پہلا اور شاید آخری حادثہ تھا مس خان کی ڈانٹ کے جواب میں عاصمہ حبیب بڑے سکون سے اٹھی تھی اور بڑی گستاخی سے کہا تھا۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں اپنے ذاتی معاملات میں آپ کو تو کیا خدا کو بھی دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ کو مجھے روکنے کا کوئی حق نہیں، اور یہ کہہ کر عاصمہ حبیب خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی اور میں نے دیکھا مس خان اس وقت کچھ اس انداز سے مسکرائی تھیں جس کو کبھی بھی کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ مسکرا کر اور لرز کر میز کا سہارا لے کر بیٹھ گئی تھیں۔ ہال میں موجود ہر ذی روح نے سانس روک لی تھی۔ لگتا تھا جیسے ساری کائنات میں سب کچھ مر گیا ہے۔ اور کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ !! اور ایک دن مس خان نے مجھے دفتر میں بلوا کر عاصمہ حبیب کے والدین کے نام ایک خط لکھوایا۔ جس میں اس کی ساری کارستانیوں کی مختصر روداد تھی۔ یہ سب کچھ لکھتے وقت میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور میں سوچ رہی تھی مس خان کا یہ خط عاصمہ کے والدین پر کیسے بم بن کر اترے گا۔ اور وہ جواب میں شاید۔ عاصمہ حبیب کو اس تعلیم سے بھی محروم کر دیں

جس میں اس کا مستقبل اب بھی چاند کی طرح روشن نظر آرہا ہے۔ مس خان یہ خط مجھ
سے لکھوا کر شاید عاصمہ حبیب کو بھی مطلع کرنا چاہتی تھیں۔ وہ میری روم میٹ تھی اور
مس خان کا خیال تھا۔ میں اس خط کا ذکر ضرور عاصمہ حبیب سے کر دوں گی۔ میں
نے تو ذکر کیا یا نہ کیا بہر حال مجھے یاد ہے پانچویں روز عاصمہ حبیب کے باپ کا خط
آیا تھا جسے مس خان نے مجھے اور عاصمہ حبیب کو پڑھ کر سنایا عاصمہ کے باپ نے
لکھا تھا" عاصمہ اپنے قول و فعل کی خود مالک ہے اور اگر وہ یہی کچھ چاہتی ہے جو
وہ کر رہی ہے' تو ہم اُسے روکنا نہیں چاہتے اور نہ ہی آپ کو اُسے روکنے کی اجازت
دیتے ہیں۔" اس سے آگے کی سطور مجھے یاد نہیں بس اتنا یاد ہے اس وقت مس خان
زور، زور سے مسلسل اپنی کنپٹی پر پنسل بجا رہی تھیں۔ اور میں سوچ رہی تھی۔ عاصمہ
حبیب اُس ملک کا سب سے اہم اور سب سے دلچسپ نفسیاتی کیس ہے۔

مس خان کے کہنے پر دوسرے دن عاصمہ حبیب کا نفسیاتی کیس سوشل ورک
فورتھ ایر کی دو لڑکیوں شوکت اور ثریا اجمل کے سپرد کر دیا گیا۔ شوکت اور ثریا اجمل
اب سائے کی طرح عاصمہ کے ارد گرد اس انداز سے منڈلاتی رہتیں کہ اسے
خبر بھی نہ ہوتی۔ ثریا اجمل نے تو اپنی تحقیق میں عاصمہ حبیب کی سات پشتیں کھنگال
ڈالیں لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ثریا اجمل اپنی رپورٹ کی تیاری کے لئے اتنی اچانک عاصمہ
کے قریب آگئی کہ کوئی یقین نہ کر سکتا تھا وہ عاصمہ حبیب کا ہاتھ تھامے اسی کی
روشوں پر اتنی تیزی اور اتنی خوبصورتی سے کود آئی تھی کہ خود عاصمہ کو بھی یہ قطعی
احساس نہ ہو سکا کہ اس کے ساتھ فلیٹیز ہوٹل کے سوئمنگ پول میں نہانے والی
ثریا اجمل دراصل اس کے اندر کی غواصی کر رہی ہے اور رات کو چائنیز ہوٹل

میں اس کے ساتھ کھانا کھانے والی ثریا اجمل وہ سب کچھ دیکھنا چاہتی ہے جو
عاصمہ ہوسٹل اور کالج میں نہیں دکھا سکتی تھی۔ یہاں سعید چاولہ، جاوید انجم اور
اس طرح کے دوسرے دوستوں کے ساتھ وہ جو کچھ کر سکتی تھی۔ وہ وہاں تو نہیں
دیکھا جا سکتا تھا۔ عاصمہ حبیب کو اندر باہر سے ننگا دیکھنے کے لئے ثریا اجمل
اس کی خلوت اور جلوت میں سایہ بن کر گھس گئی تھی۔ عاصمہ بھی ایک دوست
پا کر خوش تھی۔ اور یہی تو وہ باتیں تھیں جو اسے عزیز بناتے ہوئے تھیں۔ میں
سمجھتی تھی عاصمہ ثریا اجمل کے ساتھ رہ کر اپنی روم میٹ کے آداب اور قدرے
سب کچھ بھول جائے گی۔ اور اگر وہ ایسا کر لیتی تو میں اسے ایک عام سی لڑکی
سمجھ کر بھول بھی جاتی۔ لیکن اس نے کبھی بھی میری توقعات کے مطابق کوئی بھی
کام تو نہیں کیا تھا۔ میں چاہتی تھی وہ مجھے ثریا اجمل کے سامنے نظر انداز کر دے
اور یہ قطعاً بھلا دے کہ میرا اور اس کا ساتھ ایک ہی کمرے میں بہت دیر سے
ہے اور یہ کہ ہم دراصل ایک دوسرے کی بہت عزت کرتی ہیں اور وہ تمام آداب
نبھاتی ہیں جو دو انسان ساتھ رہنے کی وجہ سے نبھاتے ہیں۔ میں یہی سب کچھ
چاہ کر عاصمہ حبیب کو اپنے دل و دماغ کے اندر عام کر دینا چاہتی تھی۔ لیکن
ہمیشہ کی طرح وہ اس موقع پر بھی میرے اندر اسی مقام پر کھڑی رہی جو بہت
اونچا تھا۔ اور جسے گرانے کے لئے میں ہر لمحہ کوشاں رہی۔ وہ ہر لمحہ ثریا اجمل کے
ساتھ رہتے ہوئے بھی میرے ساتھ تھی۔ میرے ساتھ احترام اور محبت کا وہی
اظہار۔ میری ہلکی سی تکلیف پر جاگ جاگ کر میری خدمت، میری ضروریات کی
پڑتال۔ میرے جذبات کا احترام۔ اور پھر لڑائی کا بھی وہی شدید انداز جس

کی انتہا ہمیشہ کسی مہلک چوٹ پر ہوتی۔ عاصمہ حبیب مجھے پھر انہی رنگین روشنیوں پر نظر آتی جہاں میں اُسے قطعاً نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ میں سمجھتی تھی ثریا اجمل اُسے یقیناً ان راہوں پر لے جائے گی جہاں وہ مجھے الگ کھڑی نظر نہ آئے گی۔ وہ مجھے لوگوں کے ہجوم میں انہی کے انداز میں بالکل عام سی لگے گی۔ اور اس طرح میں اپنے اندر عظمت کے اس مینار کو گرانے میں کامیاب ہو جاؤں گی جس کے ہر انیٹ روڑے پر عاصمہ حبیب قدم جمائے کھڑی تھی۔ میں سمجھتی تھی ہم دونوں کے درمیان ثریا اجمل کی یہ اچانک آمد میرے اندر نفرت کی وہ طاقت ضرور پیدا کر دے گی جس سے میں عاصمہ کو دھکا دے سکوں گی اور اس طرح میرے سینے پر پڑی وہ سِل کھسک جائے گی جس نے میری ساری طالب علمانہ زندگی تلپٹ کر دی تھی۔ اب یہ ساری باتیں کتنی ہلکی اور بے معنی لگتی ہیں۔ بیس سال کے ڈھیر سارے وقفوں نے عاصمہ حبیب کو پاؤں سے پکڑ کر میرے اندر سے نوچ کر اتنی دور پھینک دیا کہ وہ اس عرصے میں مجھے کبھی یاد نہیں آئی۔ لیکن سوچتی ہوں آج وہ اتنی بے حساب یاد آئی ہے کہ مجھے لگتا ہے میں ان بیس سالوں کے ہر لمحے میں اسے یاد کرتی رہی ہوں۔ صرف اسے۔ اور آج بیٹھی اپنی شکست پر رو رہی ہوں۔ عاصمہ حبیب کبھی بھی میری دوست نہیں تھی۔ پھر میں نے زندگی کے ہر لمحے میں اسے کیوں یاد رکھا ہے۔ ثریا اجمل تو چند دنوں کے لئے اس کے قریب آئی اور وہ سب کچھ پوچھ کر چلی گئی جو عاصمہ حبیب نے مجھے کبھی بھی نہ بتایا تھا۔ میں تنگی عاصمہ حبیب کے باہر کے خدوخال دیکھتی رہی اور الجھتی رہی۔ اور ثریا اجمل تو اس کے اندر سے ہو کر آئی تھی۔ اس کے اندر کا سب کچھ دیکھ آئی تھی۔ عاصمہ حبیب مجھے کتنی دیر دھوکے

میں رکھے رہی تھی مجھے ہمیشہ دوست کہتی رہی۔ پھر یہ کیسی دوستی تھی۔ بہر حال ثریا اجمل
نے عاصمہ کیس کی بڑی طویل اور بڑی دلچسپ رپورٹ پیش کی تھی اور اس میں وہ
باتیں بھی تھیں جو خود عاصمہ نے ثریا اجمل کو بتائی تھیں۔ ثریا اجمل کی رپورٹ کے
بعد پتہ چلا تھا کہ عاصمہ حبیب کی ماں کسی سکھ رئیس کی داشتہ تھی لیکن تقسیم ملک
کے بعد وہ کراچی آباد ہو گئیں اور وہاں شرافت کی زندگی گزارنے کے لئے ایک اسکول
میں خانہ داری کا مضمون پڑھانے لگیں کیونکہ وہ کھانے پکانے میں بہت ماہر تھیں۔
بعد میں انھوں نے ایک معمولی ہوٹل کے مالک ایک شخص خدا بخش حبیب سے
شادی کر لی۔ یہیں کچھ عرصے بعد عاصمہ حبیب پیدا ہوئی۔ زندگی بڑی پرسکون اور
محبت سے بھری بھری گزر رہی تھی۔ لیکن عاصمہ ابھی تین سال کی بھی نہیں ہوئی
تھی کہ خدا بخش حبیب کو ممتاز بیگم کے ماضی کا پتہ چل گیا اور پھر باقی عرصہ کچھ یوں
گزرا کہ خدا بخش حبیب انگارہ بن کر جئے ممتاز بیگم کی محبت سلیقے اور شرافت کا
کوئی چھینٹا اس آگ کو بجھا نہ سکا۔ المیہ یہ تھا کہ خدا بخش ممتاز بیگم کو الگ بھی نہ
کرتے تھے گویا شدید نفرت کے ساتھ شدید محبت بھی تھی۔ عاصمہ انہی حالات
میں جوان ہوئی لیکن عاصمہ کی حقیر جوانی بھی خدا بخش پر قیامت بن کر ٹوٹی۔ عاصمہ
حبیب تو وہ نکلی۔ جو وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ وہ ماں کو پٹتے دیکھ کر باپ کو اتنی
غلیظ گالیاں دیتیں کہ خدا بخش حبیب بچوں کی طرح چیخ چیخ کر اپنا گلا پھاڑ ڈالتا۔
ننھا سا وہ پرسکون گھر اب حشر کا میدان تھا۔ جہاں ہر لمحہ دھینگا مشتی گالیاں
ہوتیں۔ لیکن یہ دھینگا مشتی صرف باپ بیٹی کے درمیان ہوتی۔ وہ دونوں بچوں کی
طرح ایک دوسرے کو نوچتے کھسوٹتے کپڑے پھاڑتے اور ممتاز بیگم منہ پیٹ ڈالتی

کا پتّو رکھے زار و قطار روتی یا پھر ساری رات جاگ جاگ کر دونوں کی ذہنی اور
جسمانی صحت وسلامتی کی دعا مانگتی۔ ایک دن عاصمہ نے بتایا تھا کہ اس نے
اپنی کچھ سہیلیوں کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ لیکن جب وہ لوگ میز پر بیٹھے کھانا کھا
رہے تھے تو عین اس وقت بابا آئے اور مجھے بلا وجہ کس کر منہ پر چانٹا مار دیا
غصے اور غم سے میرا وہ حال تھا کہ میں نے اندھا دھند لاتوں اور مکوں سے بابا
کو مارنا شروع کر دیا۔ یہ مجھے خود بھی پتا نہیں اس وقت میرے اندر کہاں سے
اتنی طاقت آ گئی تھی۔ بابا نے بھی اس دن مجھے بہت مارا تھا اور میرے سامنے
کے دو دانت توڑ دیئے تھے اور پھر اس دن کے بعد میرا ہاتھ کھل گیا۔ اب ہم دونوں
ایک دوسرے کو پیٹا کرتے تھے لیکن ان حالات میں اگر میں کبھی کسی سہیلی کے یہاں
چھپ جاتی تھی تو بابا باؤلا ہو جاتا تھا وہ رات کو اٹھ اٹھ کر دیوانہ وار رو رو کر میرے
نام کی چیخیں لگاتا میری ماں کے پاؤں پکڑ کر میرا پتا پوچھتا اور پھر دن کو میری ماں
کو اتنا پیٹتا کہ وہ سوج کر نیلی ہو جاتی۔ مجبوراً مجھے گھر لوٹنا پڑتا۔ جس دن عاصمہ حبیب
گھر سے روٹھ کر ہوسٹل آ گئی تھی تو تین ماہ تک باپ کو اپنا کھوج نہ دیا تھا اور مجھے
یاد ہے وہ باؤلی شکل کا خدا بخش حبیب جب عاصمہ کو کھوجتا ہوا ہوسٹل آیا تھا اور
عاصمہ اسے ملی تھی تو وہ پاگلوں کی طرح بھینچ بھینچ کر عاصمہ حبیب کو پیار کر رہا تھا۔
اسے چھ سو روپے نقد دیئے (جو اس نے اسی رات اپنے دوستوں کو کاک ٹیل پارٹی
دے کر خرچ کر ڈالے تھے) اور بچوں کی طرح خوش ہو کر گھر چلا گیا۔ لیکن دوسرے دن
جب وہ ہوسٹل میں عاصمہ کو ملنے آیا تو اس نے ساری لڑکیوں کے سامنے اسے
اتنی گندی گندی گالیاں دیں کہ عاصمہ نے اسے دھکا دے کر ہوسٹل کا گیٹ بند

کر دیا تھا اور وہ چیختا ہوا واپس چلا گیا تھا۔ باقی کا سارا وقت کچھ یوں گزرا کہ وہ کبھی کبھی عاصمہ کے لئے مٹھائی کے ڈبے کپڑوں کے ڈھیر اور پھلوں کی ٹوکریاں لاتا اور کبھی کبھی اُسے ساری لڑکیوں کے سامنے تھپڑ مار کر گالیاں دیتا ہوا چلا جاتا۔ اور اسی لئے عاصمہ نے اپنے اوقات کا زیادہ حصہ باہر گزارنا شروع کر دیا تھا۔ اور اگر کبھی کبھی وہ ہوسٹل میں موجود ہوتی بھی اور اس کا باپ اُسے ملنے آجاتا تو وہ کہلوا دیتی وہ ہوسٹل میں موجود نہیں۔ عاصمہ ہوسٹل کا اتنا دلچسپ کردار بن گئی تھی کہ اگر عاصمہ حبیب اس ہوسٹل اور کالج سے چلی گئی تو اس کالج کے سارے سٹوڈنٹ بھوک ہڑتال کر دیں گے اور پڑھائی کو ٹھپ کر کے گھروں میں بیٹھ جائیں گے۔ اور ایک دن واقعی عاصمہ حبیب چلی گئی میرے کمرے سے میرے کالج سے اور میرے ہوسٹل سے۔ اور میں جو سمجھتی تھی کہ کالج میں ہڑتال ہو جائے گی سٹوڈنٹ مرن برت رکھیں گے اور عاصمہ حبیب واپس آنے پر مجبور ہو جائے گی۔ واقعی یہ سب کچھ ہو گیا جس دن عاصمہ حبیب اچانک سفید پردوں والی سفید کار کی ڈگی میں اپنا سامان بھر کر چلی گئی تو لڑکیوں اور لڑکوں نے ہاتھ باندھ باندھ کر عاصمہ حبیب کو رو رو کر رو رو کر اپنی آنکھیں سوجا لیں اور ہوسٹل کے کھانوں کے دیگچے اُلٹ دیئے لیکن سب سے حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جب صبح کو وارڈن نے مس عاصمہ حبیب کے چلے جانے کی اطلاع دی تو مس خان نے وارڈن کو فوراً معطل کر کے سٹوڈنٹس کے ساتھ انتہائی ہمدردی کا اظہار کیا۔ دوسرے دن جب مس خان نے مجھے دفتر میں بلایا تو مجھے محسوس ہوا میرے اندر باہر اتنے آنسو جمع ہو گئے ہیں کہ اگر مس خان نے ایک دفعہ بھی عاصمہ حبیب کا نام لیا تو میں پگھل جاؤں گی۔ پاگل ہو جاؤں گی، اور مجھ سے کوئی

بات کبھی نہ ہو پائے گی مس خان کبھی کبھی میز پر سر رکھے پڑی رہتی تھیں۔ آنسوؤں کو روکنے
کی کوشش میں اُن کے رُخسار انگارہ ہو رہے تھے۔ وہ مجھ سے شاید عاصمہ کے
اچانک جانے کی وجہ پوچھنا چاہتی تھیں۔ لیکن اُن سے کچھ بھی نہ بولا گیا۔ وہ تھوڑی
دیر تک میری طرف دیکھتی رہیں۔ اور میں سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کوئی جواب نہ دے
سکی اور پھر اچانک ہی اُنہوں نے کہہ دیا۔ تم جا سکتی ہو۔۔۔ لیکن اب سوچتی
ہوں مس خان کے لئے تو میرے پاس اس وقت بھی کوئی جواب نہیں تھا اور نہ
آج کوئی جواب ہے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ عاصمہ نے پرانے رسالوں سے تھوڑی
کی بہت ساری ننگی تصویریں کاٹ کاٹ کر اپنے کمرے کی چاروں دیواروں پر چپکا رکھی
تھیں۔ وہ رات کو ان تصویروں پر ہاتھ پھیرتی پھیرتی سو جاتی۔ میں اکثر دن کو وہ تصویریں
احتیاط سے اتار لیتی تھی اور رات کو اُس کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے اسی طرح چپکا دیتی
تھی۔ اس طرح یہ بات وارڈن سے چھپی رہی۔ لیکن میں نے روز روز کی اس تکلیف
سے تنگ آ کر تصویریں اُتارنا چھوڑ دیں۔ ویسے بھی ان دنوں وارڈن کچھ بیمار تھی
اور اس کا راؤنڈ متوقع نہیں تھا۔ لیکن اُس رات اچانک وارڈن راؤنڈ پر آ گئی
کمرے کی ساری دیواریں یوں منقش دیکھ کر وارڈن کو غصہ آ گیا۔ لیکن وارڈن نے
حسبِ معمول عاصمہ حبیب کو کچھ کہنے کی بجائے تصویریں پھاڑ پھاڑ کر کبوتروں کی
کی طرح اُڑانا شروع کر دیں۔ بجلی بند تھی۔ عاصمہ کو غصہ آ گیا۔ وہی مہلک غصہ جس
کا شکار اکثر میں ہوتی تھی۔ عاصمہ نے جلتی ہوئی کنگ سائز موم بتی اُٹھا کر وارڈن
کے سینے میں گھسیڑ دی مجھے یاد ہے اس کی ایک چھاتی بُری طرح جل گئی تھی۔ وارڈن
نے اُسے عدالت میں گھسیٹنے کی دھمکی دی تھی۔ سوچتی ہوں عاصمہ ڈرنے والی تو ہرگز

نہیں تھی۔ پھر وہ کیوں چلی گئی۔ لیکن اس کی بے خوفی تو اس خط سے پتہ چل گئی جو دوسرے
دن اس نے وارڈن کے نام کسی نامعلوم جگہ سے بھیجا تھا۔ اُس نے لکھا تھا "غفلت میں
میرے ہاتھوں نے آپ کے ساتھ جو گستاخی کر ڈالی ہے۔ وہ چبھن مجھے نہ جینے دیتی ہے
نہ مرنے دیتی ہے۔ اے کاش مس بٹ مجھے عدالت میں کوئی سزا دلوا کر اس اذیت سے
نجات دلا دیں۔ میں نے بہت برا کیا ہے مس بٹ۔ اور یہ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس
ہوا ہے کہ میں نے واقعی بہت پنچ حرکت کی ہے جو کسی طرح بھی قابلِ معافی نہیں" مس بٹ
نے وہ خط مس خان کو دے دیا۔ مس خان اُس خط کو لئے لڑکھڑاتی پھر رہی تھیں
اور مجھے لگتا تھا عاصمہ حبیب کا ننھا سا وجود مس خان کی ہر سوچ اور ہر احساس پہ پھیل
کر رہ گیا ہے۔ عاصمہ حبیب کا یہ خط اس سلسلے کی وہ آخری بیڑی تھی جس نے مس خان
کی پوری شخصیت کو جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور آج جب بیس سال بعد عاصمہ حبیب کی ہر
بات اور ہر لمحہ مجھے یاد آ رہا ہے تو میں وہ بات بھی کیوں نہ لکھ دوں جو صرف عاصمہ اور
میرے درمیان ہوئی تھی۔ وہ بات جو آج سے کچھ سال پہلے مجھے بالکل بکواس لگی تھی۔
لیکن جو آج مجھے حیرت زدہ اور دکھی کئے جا رہی ہے جس شام اچانک عاصمہ نے
ہوسٹل چھوڑنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ مجھے اُس دن پہلی بار احساس ہوا تھا کہ دراصل
عاصمہ حبیب سے مجھے کتنی شدید محبت تھی۔ وہ محبت جو بے غرض اور سادہ سی ہوتی ہے۔ یا
خبر نہیں وہ جس میرا جذبہ باقی بھی تھا۔ لیکن مجھے لگتا ہے میرے دل میں عاصمہ کے لئے
اب بھی وہی محبت ہے جس نے مجھے اُس کے جانے والے دن خودکشی پر مجبور کر دیا تھا۔
حالانکہ اس کے وجود سے مجھے ہزاروں پریشانیاں اور تکلیفیں تھیں۔ جس دن شام کو وہ
سفید گاڑی میں اپنا سامان لینے آئی اور مجھے جاتے ہوئے خدا حافظ کہا تو اُس لمحے

مجھے محسوس ہوا تھا میری روح اچانک میرے اندر سے نکل کر یہیں کہیں فرش پر گر گئی ہے۔ میں نے اُسے دیکھا کہ اس کے سامنے نیلی سیاہی کی پوری بھری ہوئی شیشی اپنے حلق میں اُنڈیل لی تھی لیکن عاصمہ نے یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے سے میرا گال تھپتھپایا اور مسکراتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ اور اس وقت مجھے عاصمہ سے اتنی شدید نفرت ہو گئی تھی کہ میں نے بیس سال تک ایک لمحے کے لئے بھی اُسے یاد نہیں کیا تھا۔ لیکن آج جب میری بیٹی نے مجھے آ کر بتایا ہے کہ مس خان نے اُن کے کالج کے ملٹی پرپز ہال کا نام عاصمہ ہال رکھ دیا ہے اور ثریا اجمل کی رپورٹ کو اپنے تاثرات کے ساتھ کتاب کی صورت میں چھپوایا ہے۔ تو سوچتی ہوں دراصل عاصمہ حبیب ہمیں کتنی یاد ہے۔ اور آج مجھے مس خان نے عاصمہ حبیب پر لکھی ہوئی وہ کتاب بھجوائی ہے۔ کتاب کا صرف آخری باب پڑھ لوں گی۔ اس سے پہلے کا تو عاصمہ حبیب کا ایک ایک لمحہ میرے علم میں ہے۔ مس خان نے کتاب کے آخری باب میں لکھا ہے۔ عاصمہ حبیب آج کل ٹوکیو کی کسی جہاز ساز کمپنی میں انجینئر ہے۔ اور بی بی سی اپنے کسی پروگرام میں عاصمہ حبیب کی انگریزی نظموں کا ایک سلسلہ ہر روز کسی فرضی نام سے نشر کرتی ہے۔ مس خان نے مجھے اپنے خط میں لکھا ہے، وہ دو ماہ کی رخصت پر ٹوکیو جا رہی ہے، اور اس دو ماہ کا ہر لمحہ وہ صرف عاصمہ حبیب کے پاس گزارے گی۔ مس خان نے مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی ہے۔ لیکن سوچتی ہوں عاصمہ حبیب کے اتنے بڑے وجود کے سامنے اپنے اس حقیر وجود کو کیسے سنبھال سکوں گی۔ عاصمہ حبیب اب بھی میرے اندر بڑی اونچائیوں پر کھڑی ہے۔ لیکن جس سے مجھے نفرت ہے۔

"نقوش" لاہور

سی، ایل کاوش

اُس بازار سے

میرے ہاتھ میں بندھی ہوئی راکھی کو دیکھ کر حفیظ قندھاری نے کہا: "تم پاگل ہو!
عورت ماں ہوتی ہے۔ نہ بہن نہ بیٹی۔ اس کا مرد سے صرف ایک ہی رشتہ ہوتا ہے۔
جنسی رشتہ، مرد جنسی ہوس کا پیکر ہے اس لئے اسے پیٹ کی بھوک سے زیادہ جنسی
بھوک پریشان کرتی ہے۔ سماج کے بندھنوں کی وجہ سے وہ کچھ عورتوں کا لحاظ ضرور
کرتا ہے لیکن جس طرح فاقے کے عالم میں وہ کبھی کبھی روٹی چھین کر یا چرا کر کھا جاتا ہے
اسی طرح جنسی تسکین کے لئے رشتوں کی بے حرمتی کر سکتا ہے۔"

سید یزدانی جالندھری نے میرے ہاتھ سے مٹھائی کا ڈبہ چھین کر کھولا اور اسے
حفیظ کے سامنے بڑھا کر کہا۔

"لو مٹھائی کھاؤ۔"

سید نذیر ترمذی نے رس گلا حفیظ کے مونہہ میں رکھ کر اس کا مونہہ بند کر دینا
چاہا۔ حفیظ اسے کھاتے ہوئے میری طرف گھورتا رہا۔

ان دنوں لاہور کی ایک مشہور ایکٹرس مس ببرے راکھی باندھا کرتی تھی۔ میں ہندو، وہ مسلمان۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بھائی بہن مانتے تھے۔ حفیظ اس رشتے کے مخالف تھے۔ سید نذیر ترمذی کو اس بات سے تو اتفاق تھا کہ عورت بہن بن سکتی ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ ایک ایکٹرس بہن ہو سکتی ہے۔

سید یزدانی جالندھری کا خیال تھا کہ یہ بحث سراسر فضول ہے۔ سب رشتے ماننے اور نبھانے کی بات ہے۔ آج کے آدمی کی مشکل یہ ہے کہ وہ کہتا کچھ ہے اور مانتا کچھ ہے اور عمل کسی اور ہی بات پر کر ڈالتا ہے۔ حفیظ قندھاری نے کہا:

"یہ کلیہ عورت اور مرد کے رشتے پر کھرا نہیں اُترتا۔" اتنا کہہ کر اُس نے عورت کی بیالوجی بیان کر ڈالی۔ اور پھر عورت کی نفسیات کو سمجھاتے ہوئے فرائیڈ کی قبر کھودنی شروع کی۔ اور "کام سوتر" کا حوالہ دیتے ہوئے رشی واتسائن کی چتا کریدنے لگا۔

حفیظ قندھاری زندگی میں پھرتیلا اور بحث میں نوکیلا تھا۔ بحث میں کبھی ہارا نہیں اور زندگی میں کبھی جیتا نہیں۔ اُردو زبان وہ لکھنوی انداز میں بولتا تھا، پشتو دیہاتی پٹھانوں کی طرح، فارسی ایرانیوں کی مانند اور پنجابی تو اس کی مادری زبان تھی۔ نام تھا عبدالحفیظ کہلاتا تھا حفیظ قندھاری۔

تین مسلمان ایک ہندو، ہم چاروں دوست اکٹھے رہتے تھے۔ لاہور میں موچی دروازے کے باہر گھاٹی اترتے ہی ہمارا مکان تھا۔ مکان کا کرایہ یزدانی جالندھری اور نذیر ترمذی دیتے تھے۔ گھاٹی کے اس طرف منزل ہوٹل تھا۔ وہاں ہم لوگ کھانا کھاتے تھے۔ ہوٹل کا بل حفیظ کے ذمہ تھا اور میں تو ہندو تھا۔

ان دنوں منزل ہوٹل اور عرب ہوٹل اُردو ادیبوں کے دو ٹھکانے تھے۔ اردو

سبھا کا دفتر بھی منزل ہوٹل میں تھا۔ اُردو کے بڑے بڑے اساتذہ شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی، مولانا صلاح الدین احمد، احسان دانش، اختر شیرانی، چراغ حسن حسرت، قمر جلال آبادی، آغا شورش کاشمیری، ساحر لدھیانوی سب وہاں اکٹھے ہوتے۔ اُردو ادب پر بحثیں ہوتیں۔ زندگی کے رموز اور شاعری کے نکات پرکھے جاتے۔ یار لوگ تنقید میں اُستادوں کی ٹوپیاں اُچھال دیتے۔ اور کبھی کبھی لونڈوں کے سر پگڑیاں باندھ دیتے۔ حفیظ قندھاری ان مجلسوں کے لیڈر مانے جاتے تھے۔

حفیظ قندھاری نے زندگی میں ہمیشہ کام کی تلاش کی، مگر کبھی نام لیا نہیں حفیظ کے والد قندھار (افغانستان) میں ڈاکٹر تھے۔ جب ہم لوگوں کے مالی حالات خراب ہوتے تو حفیظ قندھاری چلے جاتے اور اپنے والد سے روپیہ لے آتے، اس روپیہ کے آتے ہی ہم سب دوست ایک ساتھ مال دار ہو جاتے تھے۔ گھر میں رنگ و روغن ہوتا۔ فرنیچر بدلتا۔ یاروں کے سوٹ سلنے لگتے۔ حفیظ قندھاری منزل ہوٹل کے باہر کرسی بچھا کر بیٹھ جاتے اور ہر جانے پہچانے آدمی کو ہوٹل میں کھینچ کر کھانے کی میز پر بٹھا دیتے۔ عرب ہوٹل سے کباب منگائے جاتے تو نگینہ بیکری انارکلی سے پیسٹری، کیک۔ یار لوگ خوب سیر ہو کر کھاتے۔ حفیظ کے خلوص کی تعریف کرتے۔ اس کی بحث اور تنقید کا چٹخارہ لیتے اور "زندہ باد" کا نعرہ لگا کر چلے جاتے۔

ایک بار کا ذکر ہے حفیظ قندھاری نئے نئے قندھار سے مال دار ہو کر آئے تھے، دعوتیں ہو رہی تھیں۔ یار باشی کے مزے آ رہے تھے۔ ایک شام کو ہم لوگ منزل ہوٹل میں اکٹھے ہوئے تو حفیظ قندھاری نہیں تھے۔ کہاں گئے تھے کچھ پتہ نہیں۔ گیارہ بجے تک انتظار کیا۔ پھر کھانا کھایا۔ لیکن کھانا بے مزہ رہا۔ حفیظ کی باتوں کی چٹنی دسترخوان

پر نہ ہو تو کھانا کیسا ۔ بس کسی طرح پیٹ بھر لیا اور جا کر سو گئے ۔

رات کو دو بجے حفیظ قندھاری نے دروازے پر دستک دی ۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ جھومتے نظر آئے ۔

"کہاں تھے تم ؟" میں نے پوچھا ۔

"قیامت کی گود میں ۔" حفیظ نے لڑکھڑاتے قدموں سے دہلیز کے اندر داخل ہو کر کہا ۔

"قیامت کی گود میں ؟" میں حیران ہوا ۔

"یار تصور میں تو گود ہی تھی ۔ لیکن حقیقت میں ۔ میرے سامنے بیٹھی تھی ۔"

"یہ شراب اسی نے پلائی ہے کیا ؟"

"نہیں میں نے پلائی ہے ۔"

"قیامت کو ؟"

"نہیں ، جس کے پاس وہ رہتی ہے اُس کو ۔"

"کس کے پاس رہتی ہے ؟"

"ہیرا منڈی گئے تھے تم ؟"

"ہاں ہیرا منڈی میں ہی رہتی ہے وہ ۔"

"لاہور کی طوائف ہے ؟"

"نہیں ریاست سوات کے کسی گاؤں کی گوری ہے ۔ بڑی معصوم پٹھانی ہے ۔ سوائے پشتو کے دوسری زبان نہیں جانتی ۔ اگر زبان سیکھ لے اور فلم کے پردے پر آجائے تو سب ہیروئنیں مات ہو جائیں ۔"

"تم اسے ایکٹریس بنانا چاہتے ہو؟"

یزدانی نے کروٹ بدل کر تیز آواز میں کہا۔

"سونے بھی دوگے؟" پھر وہ لپک کر اٹھے اور بتی بجھا کر بستر میں گھس گئے۔

حفیظ قندھاری نے پھسپھساتے ہوئے کہا۔

"لڑکی کا نام انور ہے۔ خوب صورت، جوان۔ ایمان کی نظر پڑ جاتے تو پسینہ آجائے۔ جس کے پاس ہے اس کا نام ہے اللہ دیا۔ اس کے مکان پر لوگ آتے ہیں، بیٹھتے ہیں لیکن صرف شراب پیتے ہیں۔" اور پھر خالی ہاتھ چلے جاتے ہیں "پسینے میں تر بتر" میں نے لقمہ دیا۔

حفیظ نے کہا۔ "اللہ دیا تو یہی کہتا ہے حضور میں خود اس سے نکاح کرنے والا ہوں۔ ہم کنجر ہیں۔ لیکن ہماری بھی عزت ہوتی ہے۔ ہماری بہنیں اور بیٹیاں تو بلنے پر بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن بہوئیں پردے میں رہتی ہیں۔ ستارے بھی انھیں نہیں چھو سکتے۔" وہ تو صرف آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ تمہاری نظر میں انور کو چھو آئی ہیں۔ لوگوں کے ہاتھ بھی چھو چکے ہوں گے۔"

"ناممکن!" حفیظ قندھاری بدک کر پورا پٹھان ہو گیا۔

"میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ ابھی تک وہ پاک دامن ہے۔ سوات کی کنواری کلی ہے انور!"

میں ہنس پڑا۔ لاہور سے پشاور تین میل دور ہے۔ پشاور سے سو میل دور مردان ہے وہاں سے ستر میل آگے ریاست سوات کا دارالحکومت منگورہ ہے۔ اور اس سے آگے انور کسی گاؤں سے آئی ہے اتنے لمبے سفر میں کلی کیا پھول بھی

دبتا جاتا ہے ـــــــ مرد کے ہاتھ ہتھکڑیوں کو توڑ کر ہوس کی پھونکوں سے اڑا دیتے ہیں اور یوں بھی بقول تمہارے عورت اور مرد کا رشتہ صرف ایک ہی ہے۔ اس لئے اب سو جاؤ رات گہری ہو گئی ہے۔"

حفیظ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بتی جلا دی۔ میں نے لحاف میں منہ چھپا لیا۔ انور بھی لیٹ گئے۔ حفیظ نے لحاف اتار پھینکا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ اور لاہور کی سردی کا احساس بھی غائب ہو چکا تھا۔

دوسرے دن ہم ہیرا منڈی میں تھے۔ ہمارے سامنے سوات ریاست کا دل کش شباب تھا۔ گداز بدن، تیکھے نقش، گورے رنگ میں گلاب کی سرخی گھلی تھی۔ لڑکی کیا تھی، اک سراپا جلوہ۔ اس کے لہجے میں پٹھانیت اور انداز میں نسائیت تھی۔ وہاں اردو بولتی تو تذکیر و تانیث کے فرق کو مٹا دیتی۔ اس پر بھی آدمی کا دل آواز کے اتار چڑھاؤ پر لہریں لیتا رہتا۔ اللہ دیا پاس بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ ہم آنکھیں سینک رہے تھے۔ حفیظ نے ایک سو روپے کا نوٹ نکالا اور کہا۔

"ذرا ناشتے کا بندوبست کرنا۔"

"اللہ دیا نوٹ لے کر کھلے کواڑ سے باہر نکل گیا۔ دروازے کا پردہ ہلتا رہ گیا۔

میں نے پشتو میں پوچھا۔

"تہ پختون یئے؟" (تم پٹھانی ہو؟)

"آہو" (ہاں جی) انور نے جواب دیا۔

"تہ سنگہ پختون یئے؟" (تم کیسی پٹھانی ہو؟)

اب اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کا دھندلکا

پھیل گیا۔ گالوں کی سُرخی غائب ہوگئی۔ وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگی کمرے میں کچھ شراب کی خالی بوتلیں، کچھ خالی گلاس اور سگرٹوں سے اٹے ہوئے ایش ٹریز دکھائی دے رہی تھیں۔ انور کی نظر بس ان سب چیزوں پر سے گزر کر حفیظ کے چہرے پر آکر رک گئیں۔ وہ دھیرے سے بولی۔

"دازمال قسمت دینی" (یہ میری قسمت ہے۔)

حفیظ انور کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

مَیں نے حفیظ سے کہا۔

"مشرق والوں کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ہر بُرائی کو قسمت کے ماتھے منڈھ دیتے ہیں۔"

حفیظ نے جواب میں مجھے گھور کر دیکھا مگر بولا نہیں۔ انور خالی بوتلیں سمیٹ کر اندر چلی گئی۔ حفیظ کی نظریں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں۔ دل تو پہلے ہی تعاقب کر رہا تھا، روح کا پتہ نہیں۔

مَیں نے حفیظ کو مخاطب کیا۔

"یہ جتنی خالی بوتلیں اٹھا کر لے گئی ہے اتنے ہی آدمی رات کو اس گھر میں آتے ہوں گے۔!"

"تو متعصّب ہے!" حفیظ کے جبڑے کٹکٹا گئے۔

"تُو نے آنکھوں پر پٹّی باندھ لی ہے۔" میں نے کہا۔

اتنے میں اللہ دیا حلال کئے ہوئے چار پانچ مرغے اور بہت سا سامان اٹھا کر لے آیا اور انور کو پکار کر کہا۔ "ان کو پکا دے۔" اور پھر وہ انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر ہاتھ تاپنے لگا۔ باہر آنگن میں دھوپ نہیں تھی۔ آسمان کو بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔

ماحول کجلا گیا تھا۔

"نہیں پکائے لیتے ہیں۔ انگیٹھی دروازے کے آگے رکھ لو! اتنا کہہ کر حفیظ نے انور سے پشتو میں کچھ کہنا شروع کیا۔

اللہ دیا منہ پھاڑے دیکھنے لگا۔ پھر جھلا کر بولا" اینغے آکے سیدھی سیدھی بولی نہ گل کیتا کرو بابو صاحب! اے دغا دا اوڑا نہیں چلے گی۔" اتنا کہہ کر اس نے شلوار کے نیفے سے کمانی دار چاقو نکالا۔ اور مرغوں کے ٹکڑے کرنے لگا۔ اس کے تیور ایک ایسے دلال کے سے تھے جسے دو پارٹیوں کے آپس میں مل جانے کا دھڑکا رہتا ہو جس میں اس کی اپنی دلالی ڈوبتی نظر آئے۔

مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ اس لئے اللہ دیا کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر کہا۔ "وہ پشتو میں صرف یہ کہہ رہا ہے کہ آج ذرا پٹھانی انداز میں کھانا کھلا دو۔ اسے کابل یاد آرہا ہے۔ منگورا میں اس نے ایک دعوت کھائی تھی۔ اس کا ذائقہ آج تک اس کی زبان نہیں بھولی۔

انور "آہو جی" کہہ کر دیگچی انگیٹھی پر رکھنے لگی۔ میں پیاز چھیلنے لگا۔ بظاہر سب کام میں مصروف تھے۔ سب خاموش تھے لیکن ہر ایک کے دل میں طرح طرح کے سوال سر اٹھا رہے تھے۔

پھر جانے حفیظ کو کیا سوجھی، اس نے اپنا کیمرہ اٹھایا اور فلش گن تیار کرنے لگا۔ اللہ دیا نے دیکھ کر پوچھا "کیا فوٹو لو گے؟"

"ہاں، ایک اخبار کے لئے انور کا فوٹو لوں گا، اور نیچے لکھوں گا" بے نام فلم کی ہیروئن۔ نیا چہرہ۔ ادھ کھلی کلی" پھر پنجاب کی ساری فلم انڈسٹری اس کی تلاش

میں ماری ماری پھرے گی۔"

اللہ دیا نے انور کی طرف دیکھا پھر میری طرف دیکھ کر کہا "یہ گانا نہیں جانتی، ناچنا نہیں جانتی۔ زبان نہیں جانتی۔ یہ کیا ایسی کی تیسی ہیروئن بنے گی۔"

"۔۔۔۔ اور یہ سانخہ میں تمہاری بھی۔" میں نے لقمہ دیا۔

اللہ دیا پہلے حفیظ کو تکتا رہا۔ پھر انور کو گھورنے لگا۔ اس کے بعد بولا "ہو تو سکتا ہے لیکن ہم اخبار والوں سے ڈر لگتا ہے۔ بڑے تگڑمی ہوتے ہیں۔ خبر کچھ ہوتی ہے چھاپتے کچھ اور ہیں۔"

میں نے کہا "کچھ ایمان دار بھی ہوتے ہیں میاں۔"

"لڑکی کے معاملے میں سب بے ایمان ہیں۔ بابو صاحب! اور آپ شاید کچھ لگتے ہیں۔ یہ میری بیوی ہے۔"

"تو پردے میں بٹھاؤ!" "ہیں!" میں نے تنک کر کہا۔

"ابھی نکاح نہیں کیا ہے۔ پر کہہ رہا ہوں کہ مال اڑنچھو ہے یا نکا و ہاں ایکٹرس بن جائے گی تو اس کی زندگی سنور جائے گی۔"

حفیظ نے دلال کے دل میں لالچ بھر دیا تھا۔ اب وہ بڑے کاروبار کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ حفیظ نے انور کو چھوئے بغیر اس کے تین چار فوٹو کھینچے اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

ایکٹرس بننے کے بعد اگر تم شادی کرو گے تو تمہاری تصویریں بھی چھپیں گی، پروڈیوسر پارٹیوں میں بلائیں گے۔"

"ایکٹرس شادی کہاں کرتی ہے، صاحب! وہ تو ایک قانونی کھڑواپال

لیتی ہے۔" اللہ دیا کے اندر کا انسان بول پڑا" اور ہم لوگ بھڑوے نہیں کنجر ہیں۔ عزت کی روٹی کھاتے ہیں۔ اپنے پیشے کے باہر نہیں جھانکتے اب ممتاز شانتی کو دیکھ لو، ایکٹرس بن گئی... لیکن....."

حفیظ نے بات کاٹ کر کہا "وہ کبھی تو ولی سے شادی کرنے والی ہے۔"

میں بولا "ولی بھی شاید ابھی اسے پرکھ رہا ہے۔"

اللہ دیا نے کہا "نظامی کی وجہ سے شادی نہیں ہو سکتی۔"

"نہیں یار وہ آج کل گیتا کو ٹریننگ دے رہا ہے" حفیظ راز بتانے لگا۔ "گیتا کی ٹریننگ کے لئے اس نے ڈانسنگ کمپنی کھول رکھی ہے ممتاز شانتی کے نام پر روپیہ جوڑ رہا ہے۔ گیتا جب تیار ہو جائے گی اور ممتاز شانتی ولی کی بیوی بن جائے گی۔ تو گیتا کی کمائی نظامی کے بڑھاپے کا سہارا بن جائے گی۔" پھر حفیظ نے پہلو بدل کر یہ تجویز رکھی کہ ممتاز شانتی کی ڈانسنگ کمپنی میں الوزہ کو شامل کرا دیتے ہیں۔ وہاں ناچ بھی سیکھ جائے گی زبان بھی اور ایکٹرس بھی بن جائے گی۔

"پیسہ کتنا ملے گا؟" اللہ دیا نے پوچھا۔

"تین سو روپے تو ممتاز شانتی سے کہہ کر میں دلوا دوں گا۔" حفیظ نے ڈینگ ماری۔

"تین سو؟" اللہ دیا حفیظ کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے چاقو بند کر کے نیفے میں رکھ لیا۔

میں نے کہا "حفیظ کی بات کو نہ ممتاز شانتی ٹال سکتی ہے۔ نہ نظامی ٹال سکتا ہے۔"

"تو معاملہ پکا کرا دیجیے۔"

اگلے دن ہم لوگ اللہ دیا کو لے کر ممتاز شانتی کے یہاں پہنچے۔ نظامی نے تین سو روپے کے نوٹ گن کر اللہ دیا کے ہاتھ میں رکھ دیئے، اور کہا "ہم لوگ عید پر پشاور جا رہے ہیں۔ انور ہمارے ساتھ جائے گی۔"

"وہ بے چاری اکیلی کیسے جائے گی؟ میں بھی ساتھ چلوں گا۔" اللہ دیا نے اڑچن ڈالی۔

"ہم پر اعتبار نہیں ہے؟" نظامی نے پوچھا۔

"اعتبار کی بات نہیں ہے۔ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔"

نظامی نے حفیظ کی طرف دیکھا۔ حفیظ نے آنکھ سے اشارہ کیا۔ نظامی نے اللہ دیا کی بات مان لی "تم بھی چلو، لیکن تمہارا کرایہ ....؟"

حفیظ نے کہا "کمپنی دے گی۔"

ممتاز شانتی بولی "کمپنی دے گی۔"

معاملہ طے ہو گیا۔ ریہرسل شروع ہو گئی۔ حفیظ قندھاری نے دوسرے دن بینک سے پانچ سو روپے نکلوائے۔ وہ روپے حفیظ نے کہاں خرچ کئے کسی دوست کو پتہ نہ چلا۔

شام کو میں نے منزل ہوٹل میں حفیظ سے پوچھا "تم بھی پشاور جاؤ گے؟"

"نہیں ابھی نہیں۔"

میں نے پھر کہا "اللہ دیا کا عشق سچا معلوم ہوتا ہے۔ پشاور تک انور کو اکیلا نہیں جانے دیتا۔"

"عشق کس کا سچا ہے یہ بات ابھی تم لوگ نہیں جان سکتے۔"

"لیکن تم تو عشق کے قائل ہی نہیں، صرف سیکس کے قائل ہو۔"

"میں اسے بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ رشتہ وہی ہے لیکن دنیا کی نظروں میں ذرا قانونی ہو جاتا ہے۔"

"اللہ دیا بھی وہی بنانا چاہتا ہے۔" میں نے چوٹ کی۔ حفیظ نے اس بات پر درد بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

ممتاز شانتی کی ڈانسنگ پارٹی ٹور پر چلی گئی۔ اور حفیظ قندھاری آہیں بھرتے رہ گئے۔

عید سے دو دن پہلے انور نے حفیظ کے نام خط بھیجا۔ پشتو میں کل ایک جملہ لکھا تھا۔ "اختر راغلے نے راغلے۔" (عید آ گئی۔ تم نہ آئے)

خط ملتے ہی حفیظ پشاور روانہ ہو گیا۔

ہم لوگوں نے سمجھ لیا کہ اب حفیظ لاہور واپس نہیں آئے گا۔ وہ انور کو لے کر قندھار یا کہیں دُور بھاگ جائے گا۔ ہم یار لوگ ابھی قیاس آرائیاں ہی کر رہے تھے کہ ایک دن صبح کی اذان کے ساتھ ہی ہمارے دروازے پر اللہ دیا نے آ کر دستک دی۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ قربانی دے کر سُرخرو ہو کر آیا ہو۔

میں نے اسے چائے پیش کی۔ ترمذی نے ٹٹولا۔

"انور کب آ رہی ہے؟"

یزدانی نے پوچھا۔ "حفیظ کہاں ہے؟"

اللہ دیا نے کسی بات کا جواب نہ دیا۔ چائے کی چسکی لے کر بولا:

بابو صاحب آزاد فضا کا پنچھی شہر میں آ کر اڑان بھول گیا تھا۔ آپ جانتے ہیں ہرنی تو بن میں ہی چوکڑی بھرتی ہے پنجرے میں کتنے دن جئے گی۔ میں نے اسے آزاد کر دیا۔ قندھاری صاحب نے ایک دن مجھ سے کہا۔ جسے پیار کرے اسے قید کیوں رکھے۔ اصل میں تمہارے عشق میں خود غرضی کا زہر ملا ہے۔" بابو صاحب! حفیظ صاحب کھرے آدمی ہیں انھوں نے میرے اندر جو آدمی سو رہا تھا اس کو جگا دیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ شریف لوگوں کے لئے بیٹی کو وداع کرنا آسان کام ہے لیکن میں نے اپنی بیوی وداع کر دی۔ حفیظ صاحب سے کہا، "آپ تو اس علاقے کی زبان جانتے ہیں جہاں کا یہ پنچھی ہے۔ اسی علاقے میں جا کر چھوڑ آیئے،" وہ مان گئے اور میں لوٹ آیا۔" اتنا کہہ کر اس نے حفیظ قندھاری کا خط دیا اور سلام کر کے چلا گیا۔

خط میں لکھا تھا "میں مردان جا رہا ہوں۔ سوات سے لوٹ کر آ گیا تو خط لکھوں گا۔ ورنہ خدا حافظ۔"

اللہ دیا کے جانے کے بعد ہم لوگ خوب ہنسے۔ حفیظ نے اللہ دیا کی پتنگ کاٹ ڈالی تھی۔ اب اس کا جی چاہے تو سوات جائے، قندھار جائے یا پشاور کے کسی ہوٹل میں ٹھہرا رہے۔ حفیظ کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

چار دن کے بعد حفیظ بھی لوٹ آیا۔ اسے دیکھ کر میں حیران ہو گیا۔

"تم تو سوات گئے تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں مردان سے لوٹ آیا۔"

"انور کہاں ہے؟"

"منزل ہوٹل میں۔"

"یہاں کیوں نہیں لائے اسے؟"

"اللہ دیا کو خبر ہو گئی تو ڈرامہ ہو جائے گا؟"

"اب ارادہ کیا ہے؟"

"ارادہ وہی ہے، نکاح کروں گا۔"

"اتنے دن مردان میں نکاح کے بغیر کیا کرتے رہے؟"

"انور تو پانچوں وقت نماز پڑھتی رہی، وظیفہ کرتی رہی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ وظیفے کے بعد وہ اللہ سے دعا مانگتی کہ خدا مجھے سکون دے اور ایک نیک انسان بنا دے۔"

"اور تم سچ مچ نیک آدمی بن گئے۔"

"نہیں میں تو جیسا تھا ویسا ہی ہوں، میں نے انور سے کہا چلو تمہیں گاؤں چھوڑ آؤں۔ وہ نہیں مانی، اس نے کہا میرے قبیلے کے لوگ کسی دھوکے سے تمہیں قتل کر ڈالیں گے۔ مجھے زندہ چھوڑنے والے نہیں۔ میں تو اسی لئے تیار ہی ہوں کہ اب اس زندگی کو ختم کر دینا چاہئے۔ نکاح کے لئے وہ راضی نہیں ہوتی تھی۔ کہتی تھی تم میرے لائق نہیں ہو۔ اور پھر ہنس دیتی۔ آخر میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکا۔ ساتھ لے آیا۔"

تھوڑی دیر بعد ہم سب منزل ہوٹل پہنچ گئے۔ انور وہاں موجود تھی۔ پتہ نہیں، نہ جانے اللہ دیا کو کیسے معلوم ہو گیا۔ وہ سیدھا منزل ہوٹل آ دھمکا۔ اندر آتے ہی بولا۔ سلام بابو صاحب! میں جانتا تھا ایک بار گھر سے نکلے سے کب گاہ پہنچی دوبارہ گھونسلے میں نہیں جاتا۔ اس لئے تمہارے سپرد کر دیا تھا۔ اب مال تیرا ہے۔ میں لئے جاتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر اس نے انور سے کہا: "چلو گھر چلیں۔"

انور بولی "میں نہیں جاؤں گی۔"

"میں تیری ناک کاٹ ڈالوں گا۔" دلال نے آخری دھمکی دی۔ اور ہاتھ پکڑنے کے لئے آگے بڑھا۔ انور نے ہاتھ جھٹک دیا۔

"پریدیا" (دفع ہو) اس نے پشتو میں ڈانٹا۔

"حرام زادی" اللہ دیا غصے میں آنکھیں نکال کر آگے بڑھا۔ حفیظ نے اسے روکا۔ یزدانی نے ٹوکا۔ ترمذی اور میں کھڑے ہو گئے۔ اللہ دیا ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے یزدانی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"حضور میں کہتا تھا نا۔ اخبار والے خبر کچھ ہوتی ہے۔ چھاپتے کچھ اور ہیں۔ لیکن ہم بھی کنجر ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ یزدانی نے حفیظ سے پوچھا۔

"یہ کیا کرے گا؟"

"کیا کرے گا؟ کر ہی کیا سکتا ہے؟"

ترمذی نے جواب دیا "ہیرا منڈی کے غنڈوں کو لا سکتا ہے۔"

"ہم پولیس کو بلا سکتے ہیں۔" حفیظ نے فوراً کہا۔

یزدانی بولا "پہلے اس لڑکی کو یہاں سے کہیں اور بھجوا دینا چاہیے۔"

حفیظ نے میری طرف دیکھا "تمہاری ایکٹرس بہن کے گھر؟"

"وہ تو باہر گئی ہے۔ لاہور میں نہیں ہے۔" میں نے جھوٹ بولا۔

حفیظ نے فون اٹھایا اور 'ہیلو' کے بعد حفیظ فارسی بولنے لگا تھوڑی دیر

بعد" بلے صاحب!" کہہ کر حفیظ نے فون رکھ دیا۔ انور کو برقع پہنا کر تانگے میں بٹھا کر چلا گیا۔ میں نے پوچھا "کہاں لے جائے گا اسے؟" ترمذی نے جواب دیا۔ "بد آقا نور احمد کے گھر۔"

یزدانی بولا۔ "وہ سفیرِ افغانستان کا خاص آدمی ہے!"

"خاص آدمی کیا نائب سفیر مقیم لاہور کہو" ترمذی نے اس کا تعارف کرایا۔

میں نے کہا۔ "یہ کہانی تو سوشل سے ایک دم سیاسی ہوتی جا رہی ہے۔"

"ہو جانے دو۔۔۔ حفیظ چوکھا آدمی ہے۔ وہ نمٹ لے گا۔"

اسی شام کو منزل ہوٹل کے سامنے تین چار تانگے آکر رک گئے۔ ہیرا منڈی کے بدمعاش، غنڈے اور پہلوان اتر کر دندناتے ہوئے ہوٹل کے اندر گھس گئے۔

ہوٹل کے مالک ظفر زبیری اور امیر پہلوان کا لڑکا فضل الٰہی حفیظ کے ساتھ بیٹھے گپ لڑا رہے تھے۔

آتے ہی ایک غنڈے نے حفیظ کو گھسیٹ لیا۔ حفیظ دھان پان آدمی۔ لڑھک کر فرش پر آ گرا۔ اللہ دیا چلایا۔ "کہاں ہے انور؟"

"حفیظ اٹھ کر کھڑا ہوا اور تاؤ میں بولا۔ "تم انور کے کیا لگتے ہو؟"

ایک پہلوان نے آگے بڑھ کر کہا۔ "جان بچانا چاہتے ہو تو انور کو ہمارے حوالے کرو۔"

فضل الٰہی پہلوان پہلے تو ہکا بکا دیکھتے رہے پھر یکایک بھڑک اٹھے۔ اور سب سے مضبوط پہلوان کے ایک مکا مارا۔ وہ قلا بازی کھا کر میز پر آ گرا۔ پھر فضل الٰہی نے میز اٹھائی تو وہ چت زمین پر جا پڑا۔ باقی پہلوان کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ فضل الٰہی نے سب کو گھور کر کہا۔ "کس کو چاہیے انور؟"

حفیظ قندھاری نے اللہ دیا کو دکھا کر کہا "یہ ہے وہ بچھڑا — اللہ دیا۔ اس کو چاہتے ہیں انور —"

فضل الٰہی کو سب جانتے تھے۔ اس کے باپ امیر پہلوان کے اکھاڑے کی مٹی پھانک کر یہ سب جوان ہوئے تھے اور پہلوان بنے تھے۔ وہ سب اللہ دیا کی طرف دیکھنے لگے۔

اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ عاشق نام کے ایک پہلوان نے کہا:

"بادہ جی۔ (بھائی صاحب) ہمیں کیا معلوم تھا کہ آپ کے پاس ہے ہم کبھی آتے ہی نہیں۔"

ایک گنجا پہلوان بولا۔ ہم اس کا فیصلہ اُستاد امیر پہلوان کے سامنے کریں گے۔" اتنا کہہ کر وہ سب کو لے کر چلا گیا۔

ان کے جانے کے بعد فضل الٰہی کو خطرے کا احساس ہونے لگا۔

اس نے حفیظ سے کہا۔ یار ابا جان تو مار ڈالیں گے۔ وہ ہمیشہ چھری کمر سے باندھے رہتے ہیں، معلوم ہوتا ہے وہ اب میری کمر پر چلے گی۔"

حفیظ قندھاری نے کہا "گھبراؤ نہیں، میں پہلوان صاحب سے خود بات کر لوں گا۔"

دوسرے دن امیر پہلوان کے حجرے میں بیٹھ کر حفیظ نے اللہ دیا کے سامنے کہا "چاچا جی! یہ معاملہ بڑا سیریس ہے۔ انور غیر علاقے کی لڑکی ہے۔ یہ اس کو اڑا کر لے آیا ہے اب حکومت افغانستان نے انگریزی سرکار سے پوچھا ہے کہ یہ لڑکی لاہور میں کیسے پہنچ گئی۔ اور اس وقت وہ افغانستان کے سفیر کے قبضے میں ہے۔

اللہ دیا نے کہا، "اس کا باپ خود نکاح پڑھوا کر اسے میرے پاس چھوڑ گیا ہے۔ وہ میری بیوی ہے۔"

امیر پہلوان سیدھے سادے بزرگ آدمی تھے۔ یہ سب گورکھ دھندہ سن کر الجھن میں پڑ گئے۔ نکاح، حکومت افغانستان، انگریزی سرکار۔ افضل الٰہی نے حفیظ کی حمایت کی تو وہ بولے "میاں میرا لڑکا تمہاری حمایت کر رہا ہے۔ اس لئے میں تو اس کا فیصلہ کروں گا نہیں۔ کسی اور کو پنچ بنا دیتا ہوں اور آقا نور احمد اچھا آدمی ہے۔ اس کو بھی بلا لیتا ہوں۔ اس معاملے کو سیاسی کیوں بنا رہے ہو۔ اگر وہ اللہ دیا کی بیوی ہے اور اس کے پاس رہنا چاہتی ہے تو کوئی حکومت اسے روک نہیں سکتی۔ اور اگر نہیں رہنا چاہتی تو کوئی قانون رکھ نہیں سکتا۔"

یزدانی صاحب نے کہا "مولانا سلطان محمود کے پاس مسئلے کو بھیج دیجئے۔"

سب نے کہا "ہاں وہ نیک آدمی ہیں اور بے لوث ہیں ۔ دوسرے دن آقا نور احمد گلے میں پستول لٹکائے حفیظ قندھاری کے ساتھ انور کو لے کر مولانا سلطان محمود کے مکان پر آ پہنچے۔ ایک طرف کنجر بیٹھے۔ اللہ دیا ان کے آگے تھا ہم دوسری طرف بیٹھے۔ حفیظ قندھاری ہمارے سامنے تھا۔ بیچ میں انور بیٹھ گئی۔ مولانا نے پوچھا۔

"لڑکی تیرا نام کیا ہے ؟"

"انور۔!"

"تمہارا نام کیا ہے ؟" انھوں نے اللہ دیا سے سوال کیا۔

"جی، اللہ دیا۔"

"کام کیا کرتے ہو ؟" مولانا نے پوچھا۔

"کام ۔ ؟ جی ہم جاٹ ہوتے ہیں"۔ اللہ دیا نے جواب دیا۔
"میں نے پوچھا ہے کام کیا کرتے ہو"۔ آواز میں قدرے کرختگی تھی۔ اللہ دیا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔
"جی پہلے میری بہنیں مجرا کرتی تھیں، اب تو حج کر آئی ہیں"۔
"سنّاٹا چھا گیا۔ مولانا نے پہلو بدل کر بیٹھتے ہوئے کہا"۔ تو کیا چاہتا ہے؟"
اللہ دیا بولا "یہ میری بیوی ہے، مجھے ملنی چاہیئے"۔
"کیوں بی بی یہ تیرا خاوند ہے؟" مولانا نے انور سے پوچھا۔
انور نے بڑے زور سے انکار میں سر ہلا کر کہا "یہ جھوٹ بولتی، ہمارا شادی نہیں ہوا"۔
پھر سنّاٹا چھا گیا۔ حفیظ نے خوش ہو کر بیوی طرف دیکھا۔
مولانا نے پھر پوچھا "تو اللہ دیا کے پاس رہنا چاہتی ہے؟"
انور نے پھر سر ہلا کر کہا "ہم نہیں رہنا"۔
مولانا تھوڑی دیر سب چہروں کو دیکھتے رہے۔ پھر بولے "اچھا تو کس کے پاس رہنا چاہتی ہے؟"
انور نے جھٹ جواب دیا "حفیظ کے پاس"۔
"حفیظ کون؟" مولانا نے آغا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
قندھاری نے مسکرا کر کہا "جی میرا نام حفیظ ہے"۔
مولانا نے حفیظ سے پوچھا "یہ تیری کون ہے۔؟"
حفیظ "جی یہ میری ..... جی میری ....." کہہ کر لاجواب سا ہو گیا۔ اللہ دیا ہنس پڑا۔ حفیظ نے انور کی طرف دیکھا۔

مولانا نے کہا "بھئی میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ تیرے پاس کس رشتے سے رہنا چاہتی ہے؟"
حفیظ رشتہ کیا بتاتا۔ وہ آج تک تو ایک ہی رشتے کا قائل تھا۔
مولانا نے انور کو مخاطب کر کے کہا "یہ تیرا کون لگتا ہے؟"
انور نے ایک سانس لیا، پہلو بدلا، اور بولی "یہ حفیظ میرا بھائی لگتا ہے۔"
"بھائی!" میں یزدانی اور ترمذی چونک اٹھے۔
"آہو جی — دا زماں رور دے۔"
مولانا نے کہا "یہ کیا بولتی ہے؟"
میں نے پشتو کا ترجمہ کر کے کہا "کہتی ہے - ہاں جی! یہ میرا بھائی ہے۔"
مولانا نے کہا "تو تو اپنے بھائی کے ساتھ جا سکتی ہے۔ اس کے پاس رہ سکتی ہے۔ کوئی قانون تجھے نہیں روک سکتا۔ بہن بھائی سے زیادہ پاک مقدس رشتہ کوئی نہیں ہے۔"
حفیظ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے انور کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "راز اکور تا لاڑ شو، خورے" (آؤ بہن گھر چلیں) اور وہ دونوں باہر اندھیری گلی میں نکل گئے۔
حفیظ قندھاری کہاں گیا؟ انور کہاں ہے؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔ آٹھ دن تک ہم لوگ سوچتے رہے کہ حفیظ قندھاری صرف ایک رشتے کو ماننے والا آدمی بہن کہہ کر مقدمہ جیت کر اور لڑکی لے کر چلا گیا۔ ترمذی نے کہا "حفیظ پڑھا لکھا آدمی ہے اور انگریزی کی اس کہاوت کو خوب جانتا ہے۔ "جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے۔"
یزدانی کہتے "لیکن وہ ہندوستانی ہے مسلمان ہے۔ قول نبھانا جانتا ہے۔"
اور میں بالکل ہی الجھن میں پڑ گیا۔ حفیظ قندھاری کے کردار سے ایک طرح کی نفرت ہو گئی۔
ایک دن صبح مونہہ اندھیرے گھر کے نیچے ایک ٹرک آ کر رکا۔ حفیظ قندھاری

ایک برقع پوش لڑکی کے ساتھ اوپر آیا۔ لڑکی اندر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ قندھاری نے کہا نیچے ٹرک میں سامان رکھا ہے میرے ساتھ چلو، سامان اُتار کر اوپر لائیں۔"

"سامان کیسا؟"

"جہیز ہے" حفیظ نے کہا۔

"جہیز؟"

"کہاں سے لاتے؟"

"بازار سے خرید کر لایا ہوں۔ آج شام کو نکاح ہے۔ چار بجے برات آئے گی منزل ہوٹل میں دعوت کا انتظام کر دیا ہے۔"

برات آئے گی کہ جائے گی؟" میں نے سوال کیا۔

حفیظ نے کہا" آئے گی ہمارے گھر، اور میری بہن کی شادی ہو گی اس گھر میں۔"

"تمہاری بہن؟" میں نے پوچھا۔

"انور — میری بہن۔" حفیظ نے سنجیدگی سے کہا۔

یزدانی نے میری طرف دیکھا۔ میں فرش پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

ترمذی نے کہا" لڑکا کون ہے میاں؟"

"ابراہیم پہلوان۔"

"وہ جو ریلوے میں نوکر ہے؟" فضل الٰہی کا منہ بولا بھائی خوب صورت جوان؟ وہی جو امیر پہلوان کے گھر میں ہی رہتا ہے۔"

"ہاں۔" اتنا کہہ کر حفیظ نیچے چلا گیا، اور جہیز کا سامان اُتارنے لگا۔ ❊

"شمع"، دہلی